www.urduchannel.in

شبلی اور ان کی تصانیف

آفتاب احمد صدیقی

اردو چینل
www.urduchannel.in

szlibrary.wordpress.com اورنگ زیب قاسمی
www.urduchannel.in
Senior Subject Specialist: GHSS Zaimdara Dir

مقالہ برائے پی-ایچ-ڈی

شبلی اور انکی تصانیف

UNIVERSITY LIBRARY
MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH.

آفتاب احمد صدیقی

M.A. LIBRARY

www.urduchannel.in

T56

CHECKED 1996-97

T56

CHECKED-2002

Fed in Computer

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

فہرستِ مضامین

(باب اوّل)

صفحہ

پس منظر :— ۵

مغلیہ سلطنت کا زوال اور مسلمانوں کا سیاسی و تمدنی انتشار

اُس عہد کا علمی و ادبی ماحول — ۹

شبلی سے پہلے اُردو نثر کا سرمایہ — ״

شمالی ہند کی اُردو نثر — ۱۰

فورٹ ولیم کالج — ۱۱

دہلی کالج ۱۲

دارالترجمہ لکھنؤ — ۱۳

حیدرآباد کے شمس الامراء کا دارالترجمہ — ״

۱۸۵۷ء اور اُس کا قریبی دور — ״

سرسید احمد خاں — ״

آزاد — ۱۴

ڈپٹی نذیر احمد — ״

مولانا حالی — ۱۵

(باب دوم)

شبلی اعظم :— ۱۷

شبلی کی شہرت اور اسکی بنیادیں — ״

عیسائی مشنریوں کے حملے اور ان کا جواب — ״

جہاد بالقلم (مضامین اور مقالات) — ۱۸

ضروریات زمانہ اور شبلی کے فرائض — ۱۹

غزالی کا عہد اور شبلی کا زمانہ — ۲۱

صفحہ

ایک نئے اسلوب تحریر کی ضرورت — ۲۱

داستانِ حیات — ۲۲

حسب و نسب و تاریخ ولادت — ״

تعلیم و تربیت — ۲۳

سفر حج — ۲۷

پہلا قومی کام — ״

کتب بینی کا شوق — ״

وکالت کی تعلیم — ۲۸

نیل کا کام — ״

علی گڑھ کی پروفیسری — ۲۹

علی گڑھ تحریک کے اثرات — ۳۰

تاریخی ذوق — ۳۱

تصنیفی ذوق — ۳۲

کالج پر مولانا کے اثرات — ۳۴

نینی تال کا سفر — ۳۷

سفر روم و مصر و شام ۱۸۹۲ء — ״

شمس العلماء کا خطاب — ״

ندوۃ العلماء — ״

علی گڑھ سے ترک تعلق — ۳۸

سررشتہ علوم و فنون کی نظامت — ״

انجمن ترقی اردو کی نظامت — ۳۹

www.urduchannel.in

(ب)

اورنگ زیب قاسمی

	صفحہ
ندوۃ العلماء سے تعلق ۔	۳۹
حادثۂ پا ۔	″
دار المصنفین ۔	″
مولانا کا آخری کام ۔	″
وفات ۔	″
(باب سوم)	
تصانیف و تبصرہ (شبلی کا نظریۂ تاریخ) :۔	۴۲
اسلامی تاریخ اور اسکی قسمیں ۔	″
شبلی کا انتخاب ۔	″
ہندوستان میں علوم کا رواج ۔	۴۳
تاریخ سائنس ہے یا آرٹ ۔	۴۴
شبلی کا نظریہ اور اسکی وضاحت	۴۵
تصانیف ۔	۵۷
تصنیفی زندگی کا آغاز ۔	″
ظل الغمام فی مسئلۃ القرآن خلف الامام ۔ (القراءۃ)	″
اسکات المعتدی ۔ (ت)	″
(۱) **مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم** :۔	۵۸
شبلی کی اصلی رنگ میں پہلی جھلک ۔	″
مآخذات ۔	۵۹
مقالہ کی بحث کا خلاصہ ۔	۶۰
سرسید سے اختلاف کی پہلی آواز	″
(۲) **المامون** :۔	۶۱
کتاب کی تجویز	″

	صفحہ
کتاب کے مآخذات ۔*	۶۲
المامون کی مقبولیت ۔	۶۳
سیرۃ النعمان :۔	۶۷
علی گڑھ کا اثر	″
سیرۃ النعمان کی ضرورت اور اسکی تجویز کا زمانہ	۶۸
ترتیب و تقسیم ۔	۶۹
مآخذات ۔*	″
اردو سوانح عمریوں میں سیرۃ النعمان کا درجہ	۷۰
کتاب کا انداز ۔	″
سفرنامۂ روم و مصر و شام :۔	۷۱
سفر کی ضرورت اور مقاصد ۔	″
سفرنامے کی اشاعت کا خیال ۔	″
سفرنامے کی اہمیت ۔	۷۳
تعلیمی تحقیق ۔	۷۴
کتب خانوں اور کتابوں کی سیر	۷۵
الفاروق :۔	۷۶
الفاروق کی اہمیت ۔	″
الفاروق سے پہلے اس موضوع پر ایک تصنیف ۔	″
الفاروق کی تصنیف کا زمانہ ۔	۷۸
مآخذات ۔*	۸۰
کتاب کی ترتیب ۔	۸۱
الفاروق پر ریویو ۔	۸۲
الغزالی :۔	۸۳

"مأخذ" واحد ہے، "مآخذ" جمع ہے، پھر اس پر ات لانا بے ضرورت ہے

*۔ اردو میں "ماخذ" جمع بھی ہے، سوا اس کے کہ محرف [illegible] میں ماخذوں (س، سے، وغیرہ) آتے ہیں۔ اس لیے "کتاب کے ماخذ" کہنا کافی ہوتا۔ ات یہاں بھی بے ضرورت ہے۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

[illegible] ہونا چاہیے تھا، جس کی قیمت پانچ [illegible] کی قیمت تو ۲۰۰ ہے! اعداد کے لئے جب حرف استعمال کئے جاتے ہیں تو ترتیب "ابجد" کے لحاظ سے ہوتی ہے

	صفحہ (سـ)		صفحہ
غزل -	۲۰۸	زوال -	۲۳۳
آغاز -	۲۱۰	سرسید کی تحریکات	۲۳۴
عبوری دور -	۲۱۱	سرسید کی تقویر	"
دور آخر -	۲۱۲	رجائیت	"
واردات عشق -	۲۱۵	تماشائے عبرت	۲۳۵
رندی و سرمستی -	۲۱۷	قصیدے	"
تصوف و فلسفہ -	۲۱۸	تیسرا دور اور اسکی خصوصیات -	۲۳۷
صفائی زبان -	"	چوتھا اور آخری دور اور اسکی خصوصیات	۲۳۹
محاورات -	۲۱۹	اخلاقی و مذہبی شاعری -	۲۴۲
معنی خیز ترکیبیں -	۲۲۱	انداز بیان اور تاثیر -	۲۴۳
تکرار -	"	تاریخی نظمیں	۲۴۴
صنائع و بدائع -	"	سیاسی نظمیں	۲۴۷
مسلسل غزلیں -	"	طنزیہ	۲۴۸
توارد -	۲۲۵	وقتی	۲۵۱
مثنوی -	"	(باب پنجم)	۲۵۳
مرثیہ -	"		
شبلی کی اردو شاعری :-	۲۲۷	مکتوبات :-	"
تمہید -	"	مکاتیب اور ان کی اہمیت	"
حاضر جوابی -	۲۲۹	اردو مکاتیب کی مختصر تاریخ -	۲۵۴
پہلا دور اور اسکی خصوصیات	۲۳۰	غالب کا درجہ -	"
دوسرا دور اور اسکی خصوصیات	۲۳۲	مولانا کے عربی خطوط	۲۵۵
مثنوی صبح امید	۲۳۳	فارسی خطوط	"
عروج	"	اردو خطوط اور ان پر تبصرہ	۲۵۷

www.urduchannel.in

[illegible] س کے بجائے ق چاہیے کہ ۹ کے مساوی ہے اور ش برابر ہے ۶۰ کے۔

اورنگ زیب قاسمی

	صفحہ (س)
مراسلہ اور مکالمہ	۲۵۸
اختصار الفاظ	۲۵۹
جواب بوالپسی ڈاک	۲۶۰
القاب و آداب	〃
سواد خط	۲۶۱
مکاتیب کی تعداد	〃
شوخیٔ تحریر اور سنجیدہ ظرافت	۲۶۴
اشارے	〃
خط انہیں مرثیے	۲۶۶
تنقیدیں	۲۶۸
خطوطِ شبلی (بنام عطیہ و زہرا فیضی) اور ان پر تبصرہ	۲۶۹
(باب ششم)	۲۷۴
شبلی کی انشاء پردازی :—	〃
انشاء اور اسکے لوازم	〃
اردو انشاء پردازی کے اسالیب	۲۷۵
شبلی کے عہد میں انشاء پردازی کا عام اسلوب۔	۲۷۷
شبلی کا خاص اسلوب نگارش	۲۷۸
تسلسل۔	۲۸۲
استحکام رائے۔	۲۸۳
زور بیان	۲۸۴

	صفحہ
ایجاز و اختصار۔	۲۸۷
حقیقت نگاری۔	۲۸۸
فصاحت و بلاغت۔	۲۹۰
رنگینی۔	۲۹۲
صفائی و شستگیٔ زبان	〃
خامیاں۔	۲۹۴
موازنہ و مقابلہ	۲۹۶
انیسویں صدی کی دو زبردست شخصیتیں — سرسید اور شبلی۔	۳۰۰
حرف آخر۔	۳۰۷
فہرست ماخذات	۳۰۹

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

	صفحہ
تاریخ تصنیف ۔	۸۳
امام غزالی کا مرتبہ ۔	۸۴
کتاب کی ترتیب ۔	۸۵
ماخذات ۔	۸۶
"تبصرہ"، بہ مرزا — ریویو	۸۷
علم الکلام :-	۸۸
علم کلام کی تاریخ ۔	۸۹
نئے علم کلام کی ضرورت ۔	۹۰
جدید علم کلام پر تصانیف ۔	۹۱
شبلی کی تجویز ۔	۹۲
شبلی کے علم کلام کا نمونہ بعض مسائل پر بحث	۹۵
الکلام :-	۹۸
الکلام پر اعتراضات، ان کی نوعیت اور جواب	״
الکلام کی اہمیت ۔	۱۰۰
سوانح مولانا روم :-	۱۰۱
مولانا اور ان کی مثنوی کا پایہ	״
سوانح کی ترتیب و تقسیم	״
علم کلام اور مثنوی	״
مثنوی میں مسئلہ ارتقاء	۱۰۴
موازنہ انیس و دبیر :-	۱۰۶
تاریخ تصنیف	״
مرثیہ کی تاریخ، شبلی کا بیان اور اس پر کچھ اضافہ،	״
شمالی ہند کی مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ ۔	״
لکھنؤ میں مرثیے کی تاریخ ۔	۱۰۹
موازنہ پر بحث	۱۱۴
شعر العجم :-	۱۱۶
شعر العجم کی حیثیت	״
فارسی شاعری کا مرتبہ	״
تاریخ تصنیف	۱۱۸
کتاب کی ترتیب و تقسیم ۔	۱۲۰
تنقید شعر العجم اور اسکے بعض نکات پر بحث و جرح	۱۲۱
حکیم سنائی ۔	״
خیام ۔	۱۲۲
انوری ۔	۱۲۳
شعر العجم کی اہمیت ۔	۱۲۵
شبلی اور مغربی مصنفین کا فرق ۔	״
شعر العجم کی تصنیف کے لئے شبلی کی موزونیت ۔	۱۲۷
شاعری پر بحث ۔	״
ناقد کے فرائض	۱۲۸
اصول تنقید کی روشنی میں شعر العجم	۱۳۱
تنقید کا ایک نمونہ	۱۳۲
عمومی تبصرہ	۱۳۴
سیرۃ النبی :-	۱۳۷
سیرۃ النبی کا پہلا خیال	״
سیرۃ النبی کا اعلان	۱۳۸
سیرۃ کی تصنیف اور اشاعت	۱۳۹

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

	صفحہ
سیرۃ النبی کے مباحث ۔	۱۴۰
ماخذ و اصول ۔	۱۴۱
سیرۃ النبی کی خصوصیات ۔	۱۴۳
سیرۃ میں مولانا کی انشاءپردازی	۱۴۶
مقالاتِ شبلی ۔ جلد اوّل (مذہبی)	۱۴۹
مضمون نگاری کا آغاز اور اسکا اجمالی خاکہ ۔	"
مضمون نگاری یا مقالہ نویسی کی چند ضروری شرطیں ۔	"
مقالاتِ شبلی جلد اوّل کے مباحث ۔	۱۵۰
مقاصد ۔	"
تبصرہ ۔	"
نتائج ۔	۱۵۷
مقالاتِ شبلی ۔ جلد دوم :۔	۱۵۸
تبصرہ ۔	"
اردو ہندی قضیہ ۔	۱۶۱
نتائج ۔	۱۶۲
مقالاتِ شبلی ۔ جلد سوم :۔	۱۶۴
تبصرہ ۔	"
قدیم تعلیم ۔	۱۶۶
مقالاتِ شبلی ۔ جلد چہارم :۔	۱۶۹
تبصرہ	"
مقالاتِ شبلی جلد پنجم :۔	۱۷۲
تبصرہ ۔	"
متنبی (مُتنبّی ۳)	۱۷۴

	صفحہ
مقالاتِ شبلی ۔ جلد ششم ۔	۱۷۷
تراجم ۔	"
تبصرہ ۔	۱۷۸
کتب خانۂ اسکندریہ ۔	۱۸۱
نتائج ۔	۱۸۳
اسلامی کتب خانے ۔	"
اسلامی حکومتیں اور شفا خانے ۔	۱۸۵
ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر ۔	۱۸۶
مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں	۱۸۶
کی ناسپاسی ۔	۱۸۷
مقالاتِ شبلی جلد ہفتم :۔	۱۸۹
تبصرہ ۔	"
مقالاتِ شبلی جلد ہشتم :۔	۱۹۲
تبصرہ ۔	"
خطباتِ شبلی :۔	۱۹۶
خطابات	"

(باب چہارم)

	صفحہ
شبلی کی فارسی شاعری :۔	۲۰۰
تمہید ۔	"
ہندوستان میں فارسی شاعری کا رواج ۔	۲۰۱
مولانا کی فارسی شاعری ۔	۲۰۲
قصیدہ ۔	۲۰۳

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید و تعارف

اس مقالہ کا موضوع "مولانا شبلی اور اُن کی تصانیف" ہے۔ جسمیں تفصیل کے ساتھ علامہ موصوف کے علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، کلامی، فلسفیانہ، اور شاعرانہ کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اب تک شبلی کی حیات اور اُن کے کارناموں پر تفصیل سے نظر نہیں ڈالی گئی۔ اور جسوقت راقم السطور نے یہ کام شروع کیا تھا اسوقت تک انکے سوانح حیات بھی مرتب نہیں ہوئے تھے۔ کام کے دوران میں مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب 'حیات شبلی' شائع ہوگئی۔ راقم کو اشاعت سے پہلے اسکے مطالعہ کا موقع مل گیا تھا۔ جسکے لئے وہ سید صاحب موصوف کا تہِ دل سے شکر گزار ہے۔ اسلئے سوانحی حالات اور واقعات کی تلاش و جستجو میں راقم کو کاوش کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور سوانحی حصہ کے بہت سے معلومات حیات شبلی کے مسودہ سے یکجا حاصل ہوگئے۔ لیکن ہمارے مقالے کا موضوع مولانا شبلی کے علمی و تصنیفی کارناموں کی تفصیل اور اُس پر نقد و تبصرہ ہے۔ مولانا شبلی کے سوانحی حالات اس میں صرف اُسی حد تک لکھے گئے ہیں جو مولانا کی علمی زندگی میں پس منظر کا کام دے سکیں۔

شبلی نعمانی کی تصانیف ہمارے لئے مختلف حیثیتوں سے نہایت اہم ہیں۔ جسکی تفصیل اس مقالہ میں پیش کیجائیگی۔ سر سید احمد خاں اور اُن کے رفقاء ایک نظام شمسی کیطرح اپنے اپنے محور پر گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ اور اُن کا مرکزِ کشش اسلام ہے۔ سر سید مسلمانوں کی اصلاح، تنظیم اور تعلیم کا مقصد لیکر اٹھے۔ اور جہاں تک اُنسے ہوسکا اُنھوں نے اپنے عمل اور تصانیف سے اس خدمت کو انجام دیا۔ حالی، نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، ذکاء اللہ سب اسی نظام کے کواکب ہیں اور سب کی علمی و عملی کوششوں کا مقصد مسلمانوں کی فلاح اور بہبود تھا۔ لیکن انمیں سب سے جامع ہستی شبلی کی ہے۔ سر سید احمد خاں ایک حد تک مغرب سے مرعوب تھے۔ حالی میں خود قوتِ فیصلہ نہ تھی۔ نذیر احمد سرکاری ملازم تھے اور انکا دائرۂ عمل محدود تھا۔ محسن الملک، وقار الملک اور دوسرے رفقاء قومی کاموں میں عملاً اس قدر گرفتار تھے کہ اُن کی دوسری صلاحیتیں پوری طرح بروئے کار نہ آسکیں۔ لیکن مولانا شبلی کی ذات ہمہ گیر تھی۔ انکے کارنامے علمی و عملی دونوں میدانوں میں یکساں ہیں۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ اسلام اور مسلمانوں کو اُس سیلاب سے بچانا ہے جو مغرب سے اٹھا تھا اور

www.urduchannel.in

اس اعلان سے اٹھا تھا کہ اپنی رو میں ہر چیز کو بہالے جائیگا۔ انہوں نے مغربی علوم و فنون اور فلاسفہ کی ایجادات و انکشافات، تحقیقات اور فلسفہ کے خلاف اپنی تحریروں سے ایک سدِ سکندری کھڑی کر دی، جسے آج تک کوئی طوفان نہ ہلا سکا۔

مسلمانوں کی تاریخ، انکے علوم و فنون، عربی زبان، فارسی ادب، جدید و قدیم فلسفہ پر شبلی کی نظر انکے تمام معاصرین میں سب سے زیادہ وسیع تھی۔ اسلام پر یورپ کے معترضین کا جواب دینے کے لئے جس وسعتِ نظر، ذوقِ تلاش، طرزِ استدلال اور نکتہ سنجی کی ضرورت تھی اسکی مثال شبلی کے علاوہ دوسری نہیں ملتی۔ جدید علم کلام کی تدوین کسکے ہاتھوں عمل میں آئی؟ ہندوستان میں کسنے اسلامی تاریخ کو زندہ کیا؟ نامورانِ اسلام نے کسکے ہاتھوں زندگی پائی؟ اسلامی علوم و فنون کی تاریخ کو کسنے اس آب و تاب کے ساتھ پیش کیا کہ نگاہیں خیرہ ہو گئیں؟ شعرائے عجم کے دفتر کو غرقِ مئے نابِ اُولیٰ سے کسنے بچایا؟ سرسید کے عظیم الشان مقناطیسی اثر کے باوجود کسنے جدید تعلیم کے نقائص کو محسوس کیا اور اسکے علانیہ اظہار کی جرأت کی؟ کس نے علی گڑھ کی خالص مغربی تعلیم کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا ایک دوسرا خواب دیکھا جسکی تعبیر ندوہ کی شکل میں ظاہر ہوئی؟ کسنے اُردو زبان کی سب سے زیادہ خدمت کی؟ کسکا اسلوبِ بیان، منطقیانہ استدلال، فلسفیانہ نکتہ سنجیوں، شاعرانہ شوخیوں اور مورخانہ حقیقت نگاری کے جلوے دکھاتا ہزاروں صفحوں پر بغیر دم لئے چلا جاتا ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب میں صرف ایک آواز آتی ہے۔ شبلی! جسکی صدائے بازگشت سے آج تک ہندوستان کی علمی دنیا گونج رہی ہے۔

(حاشیہ پر دستی نوٹ:) "اَوْلیٰ" اور "اُولیٰ" دو الگ الگ لفظ ہیں۔ یہاں "اَوْلیٰ" چاہیے۔ "اُولیٰ" ہیں پہلی۔ "اول" کی تانیث ہے۔

اس مقالے میں ان تمام پہلوؤں پر نہایت شرح و بسط سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے "پس منظر" کے عنوان سے انیسویں صدی کے ہندوستان کی ایک دھندلی جھلک دکھائی گئی ہے۔ اور مغلیہ سلطنت کے دورِ زوال کے علمی، سیاسی اور ادبی کارناموں کا ایک مختصر سا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں سرسید اور انکے رفقاء کے کارناموں کا مجملاً ذکر ہے تاکہ شبلی کا صحیح مقام متعین اور انکے کاموں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

دوسرے باب میں شبلی کی حیات کے نمایاں نقوش مرتسم کئے گئے ہیں۔ یہ باب اسلئے ضروری تھا کہ کسی مصنف کی تحریر کو اسکی زندگی سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ آگے چل کر شبلی نے جو موضوعات اختیار کئے، انکی طبیعت انھیں جسطرف لے گئی اُن سب کا سرچشمہ انھیں حالات سے پھوٹتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس حصۂ زندگی پر تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے جسمیں شبلی نے علی گڑھ اور سرسید کا اثر قبول کیا۔

باب سوم دراصل مقالہ کی "اصل" کہا جا سکتا ہے۔ اسمیں ان کی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ان سب پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اسلئے قدرتی طور پر یہی باب مقالے میں سب سے طویل ہے۔ تاہم طویل اقتباسات

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

اور غیر ضروری مباحث سے حتی الامکان پرہیز کیا گیا ہے تاکہ مقالہ مجوزہ حدود سے آگے نہ نکلنے پائے۔ تبصرہ میں صرف یہ اصول ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اس سے کتاب کی حیثیت، مباحث اور انداز بیان کا پورا اندازہ ہو جائے اور پڑھنے والے کو بغیر اصل تصنیف کے مطالعہ کے اس کی مدد سے رائے قائم کرنا ممکن ہو۔ تصانیف پر بحث اور ان پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں اُسکے جواب میں اختصار ملحوظ رکھا گیا ھے علم کلام میں فلسفے کے جن مسائل پر بحث ہے اس کا تعلق ادب سے زیادہ فلسفہ کے طالب علم سے ہے اور راقم مقالہ کو اس میں اپنے عجز قلم کا اعتراف ہے۔ اسکے علاوہ دوسری انواع کی تصانیف پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ جس کا اندازہ موازنہ، مثنوی مولانا روم، اور شعر العجم کی بحثوں سے ہوگا۔ تصانیف میں تاریخی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ھے۔ مولانا شبلی کے مقالات موضوع کے اعتبار سے آٹھ جلدوں میں چھپ چکے ہیں۔ راقم نے بھی اس تقسیم کو قبول کیا ہے اور اسی ترتیب سے اُن پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ مقالات اہمیت کے اعتبار سے مولانا کی مستقل تصانیف سے کسی طرح کم نہیں۔ اور انمیں بعض (جنکی صراحت اپنے موقع پر کی گئی ہے) کئی کئی تصانیف پر بھاری ہیں۔ اسلئے یہ حصہ پہلے حصہ کیطرح طویل ہے اور اسمیں بھی تفصیل و تبصرہ کا وہی اصول ملحوظ رکھا گیا ہے جسکا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

قومی کاموں کے سلسلے میں مولانا کو اکثر پلیٹ فارم پر آنا پڑا۔ لیکن افسوس ہے کہ انکی بہت کم تقریریں محفوظ رہ سکیں۔ تاہم جو کچھ دستیاب ہو سکا اسی کو غنیمت جان کر خطابات کا بھی مختصراً ذکر کیا گیا ہے تاکہ شبلی کے مرقع کا کوئی خط و خال مخفی نہ رہنے پائے۔

شبلی کی فارسی اُردو شاعری اور مکتوبات کو دو علیحدہ ابواب میں منضبط کیا گیا ہے۔ راقم کو اس امر کے اظہار میں تامل نہیں کہ ابتک شبلی کی شاعرانہ حیثیت کو اصحاب ذوق نے بڑی بے دردی سے نظر انداز کیا ہے۔ اس باب میں اسکی تلافی کی کوشش کی گئی ہے۔ شبلی کی شاعری پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے اور ان کے نمونے مطبوعہ کلام اور مکاتیب سے پیش کئے گئے ہیں۔

شبلی بحیثیت انشاء پرداز جو درجہ رکھتے ہیں وہ محتاج تعارف نہیں۔ اس پر آخری باب میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس میں انشاء اور اسکے لوازم پر بحث اور اُردو انشاء پردازی کے اسالیب اور شبلی کے عہد کے مروجہ اصناف کو بیان کرکے شبلی کے مخصوص اسلوب نگارش کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں خدمت زبان، تنوع اور انشاء کے لحاظ سے جابجا انکا اور حالی، نذیر احمد، اور آزاد کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ ان سب کی تصانیف

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

عام طور پر مطبوعہ ملتی ہیں اور ان کی تحریروں کے انداز سے بالعموم ناظرین واقف ہیں اسلئے غیر ضروری اقتباسات سے پرہیز کیا گیا ہے۔

مقالہ کی تیاری میں علاوہ علامہ شبلی کی کل تصانیف کے بہت سی تاریخوں، تنقیدوں، مقدمات، دواوین مقالات، خطبات، تراجم وغیرہ سے بھی مدد لی گئی ہے۔ حواشی میں ایسے ماخذوں کی صراحت ہے۔ اور آخر میں کل ماخذات کی فہرست علٰحدہ بھی دیدی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس مقالہ کے مطالعہ سے جو کمی اب تک محسوس کی جا رہی تھی وہ پوری ہو جائے گی۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

باب اوّل

پس منظر

مغلیہ سلطنت کا زوال اور مسلمانوں کا سیاسی اور تمدنی انتشار

عالم گیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت پر زوال کے آثار نمایاں ہو گئے۔ مملکت ہند کے مختلف صوبے رفتہ رفتہ خود مختار ہوتے گئے۔ آصف جاہ نے دکن پہونچ کر اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور اسطرح دکن کے چھ صوبے شاہی تصرف سے آزاد ہو گئے۔ سعادت خاں برہان الملک نے اودھ کے علاقہ پر قبضہ جمایا۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے صوبے بھی خود مختار ہو گئے۔ انکے علاوہ چھوٹے چھوٹے علاقوں کے حاکم بھی علم بغاوت بلند کرنے لگے۔ روہیلکھنڈ کو روہیلوں نے دبا لیا۔ فرخ آباد کے علاقہ پر بنگش خاں متصرف ہو گیا۔ اور مرہٹوں نے مالوہ، گجرات، آگرہ اور پھر دہلی کو لوٹا۔ ابھی یہ ہنگامہ ختم نہ ہوا تھا کہ دلی پر نادر کا قہر نازل ہوا اور دیکھتے دیکھتے دلی کا وہ عالم ہو گیا جیسے اس پر نہ حکومت کا سایہ تھا اور نہ خدا کا۔ ابھی دلّی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ ابدالی کی تاخت ہوئی مگر اسے شکست ہوئی۔ اس سے فراغت نہ ملی تھی کہ رہیلوں نے سر اٹھایا، جسکا استیصال جاٹوں اور مرہٹوں کی مدد سے ہوا۔ اس ہنگامہ کے ختم ہوتے ہی ابدالی نے دوسری بار حملہ کیا۔ بادشاہ نے دو صوبے لاہور اور ملتان دیکر جنگ سے نجات پائی۔ ان سب کے بعد درانی حملہ آور ہوا۔ یہ وہ مشہور حملہ ہے جسنے مرہٹوں کے حوصلہ مندانہ جوش اور حاکمانہ امنگوں کا خاتمہ پانی پت کے میدان میں کردیا۔ اس تمام تاخت وتاراج اور دلی کی تباہی کا اندازہ میرؔ کی زبان قلم سے کرنا بے محل نہ ہوگا:-

"..... بعد از شام منادی شد کہ شاہ امان دادہ است باید کہ رعایا پریشان دل نگردد۔ چوں لختے از شب گزشت غارت گراں دست تطاول دراز نمودند، شہر را آتش دادہ خانہا سوختند و بردند۔ صبح کہ صبح قیامت بود تمام فوج شاہی و روہیلہ ہا تاختند و بہ قتل و غارت پرداختند۔ دروازہ ہا شکستند، مردماں را بستند، اکثرے را سوختند و سر بریدند، عالمے را بخاک و خوں کشیدند تا سہ شبانہ روز دست ستم برنہ داشتند از خوردنی و پوشیدنی ہیچ نہ گزاشتند۔ سقفہا شگافتند دیوار ہا شکستند، جگرہا سوختند، سینہ ہا خستند، آں زشت سیرتاں ہر در و بام اکابراں بہ

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

بے بیرتی تمام شیخان شہر بحال خراب، بزرگان محتاج دم آب، گوشہ نشینان بیجا شدند اعیاں ہمہ گدا شدند۔ وضیع وشریف عریاں۔ کدخدایاں بے خان ومان اکثرے بہ بلا گرفتار رسوائی کوچہ وبازار۔ بسیارے خداگیر، زن وبچہ اسیر، بر سر شہر ہجوم۔ قتل وغارت علی العموم، حال عزیزاں بہ ابتری کشید، جان بسے بہ لب رسید۔ زخم می زدند وزبان بہ تلخ می کشودند، زر رامی گرفتند دسلاخے می نمودند، باہر کہ می خوردند، تا ستر پوش می بردند۔ جہانے از جہاں تا شاد رفت، ناموس عالمے بر باد رفت۔ شہر نو بخاک برابر شد۔ روز سوم تسق مقرر شد۔ انزال حال نام بیقچی بانتی رسید کلاہہا ونیم تن مردم او کشید، بارے قدغچیاں غارت گراں را از شہر بر آوردہ بہ احتیاط پرداختند وآں بے رحم مردماں بہ شہر کہنہ چپیدہ جہانے را ہلاک ساختند، ہفت ہشت روز ایں ہنگامہ گرم بود۔ اسباب پیش وقوت یک روزہ در خانہ کسے نماند، سر مرداں بے کلاہ، زناں بے رومال سیاہ۔"[1]

ملک کا نظم ونسق آپس کے اختلافات اور خود غرضیوں کی وجہ سے روز بروز بگڑتا جاتا تھا سلطنت کے بڑے بڑے عہدہ داروں نے خود مختاری اور ذاتی مفاد کی دھن میں جائز وناجائز کی تمیز اپنے دلوں سے یکسر محو کردی اور وہ کر گزرے جو خود انہی کے حق میں بعد کو سم قاتل ثابت ہوا۔ حدود سلطنت کے گھٹتے ہی آمدنی بھی گھٹنے لگی۔ اقتدار پہلے ہی ختم ہوچکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حملہ آوروں کے لئے دروازے کھل گئے۔ ہندوستان کی بساط اس طرح متزلزل ہورہی تھی کہ اس پر ایک نیا مہرہ نمودار ہوا۔ اور یہ مہرہ "ایسٹ انڈیا کمپنی" تھی، جس کی ریشہ دوانیوں سے ہندوستان کا معمولی طالب علم بھی ناواقف نہ ہوگا۔ علامہ عبداللہ یوسف علی کی "کلچرل ہسٹری آف انڈیا" سے ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"بے روزگاری کا یہ مسئلہ برطانوی حکومت کی تاریخ میں ایک بھیانک منظر نظر آتا ہے۔ بنگال میں انگریزوں کا ابتدائی عہد ضرب المثل دولت کیلئے جو کلائیو جیسے لوگوں نے جمع کی، خاص طور پر ممتاز ہے۔ دولت کمپنی کو نہیں مل رہی تھی بلکہ وہ کمپنی کے ملازمین تھے جو لوگوں کا خون چوس رہے تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستانی شرفاء اہل سیف، زمیندار اور رعیت، ارباب علم اور صناع سب پر قیامت گزر گئی۔ چند ہندوستانی جنھوں نے نووار دین کی جعل سازیوں اور بے ایمانیوں

---

[1] ذکر میر: ص ۸۵-۸۶: انجمن ترقی اردو اورنگ آباد: مطبوعہ ۱۹۲۸ء

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

میں ہاتھ بٹایا مشہور اور دولتمند ہو گئے اور ایسے خاندان پھلے پھولے۔ لیکن جیسا کہ ہر زمانے اور ہر ملک کے نئے نئے دولت پانیوالوں کا حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے نئے آقاؤں کی تہذیب و معاشرت سے محض نابلد تھے اسلئے قدرتی طور پر انھوں نے خود اپنے ملک کی تہذیب و معاشرت کی تحقیر کی۔" [۱]

"ایسٹ انڈیا کمپنی" نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے نہ صرف ہندوستان کی تجارتی زندگی ختم کردی بلکہ اسکی صنعت و حرفت کو بھی تہ و بالا کردیا۔ پھر اسی پر اکتفا نہ کی گئی بلکہ ہر جائز و ناجائز ذریعہ بر سر کار لایا گیا جس سے ذرا سی بھی آمدنی میں اضافہ ہونے کی اُمید تھی۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے مصنف کا بیان ہے:-

"....... ایک قرضہ کی نسبت مسٹر برک نے لکھا ہے کہ اسوقت نواب کو روپیہ کی ضرورت تھی۔ فوج کی تنخواہ تقسیم نہ ہوتی تھی جس سے وہ فساد برپا کرتی تھی۔ مدراس کی کونسل نے دوستانہ طور پر سمجھایا کہ ان شوریدہ سر فوجیوں کو دبائیے۔ نواب نے جواب دیا کہ روپیہ سے مجبور ہوں کیا کروں؟ اس پر کریم النفس انگریزی حکومت نے چند ساہوکاروں کو آمادہ کردیا کہ نواب کو چار لاکھ اشرفی (پگوڈا) قرض دیدیں۔ یہ ساہوکار کون تھے؟ یہ مسٹر ٹیلر، مسٹر میچنڈری اور مسٹر کال تھے جو راضی ہو گئے مگر اس شرط پر کہ مدراسی حکومت نواب کی ضمانت کرے یہ ضمانت بھی کرلی گئی۔ اور طے پایا کہ چند اضلاع دائنوں کے سپرد کردئے جائیں جنکی مال گزاری سے وہ اپنا سود وصول کرتے رہیں۔ اسکے مطابق نواب سے معاہدہ ہوگیا۔ اور اسنے فوراً ان سپاہیوں کے علاحدہ کرنیکا اعلان کردیا کہ انکی چڑھاؤ تنخواہیں ادا کردی جائیں۔ مگر ساہوکاروں کے پاس سے قرضہ کا روپیہ نہ آج آتا ہے نہ کل۔ بڑے تقاضوں کے بعد جواب آیا تو یہ کہ نقد روپیہ اسوقت نہیں ہے چار ماہ کے اندر اندر ادا کردیا جائیگا۔ سردست ہم آپکو رقعہ لکھے دیتے ہیں کہ اس میعاد کے اندر روپیہ دیدینگے۔ نواب نے افسروں کو بلاکر حال بتایا اور کہا کہ فوجیوں کو سمجھا بجھا کر مطمئن کردو کہ چار مہینے کے بعد تنخواہ مل جائیگی۔ مگر چار مہینے کی جگہ پورے دو سال گذر گئے اور فوجیوں کی بقایا پوری ادا نہ ہوئی جسکی وجہ سے نواب کو مزید دو سال کی تنخواہیں دینی پڑیں۔

Cultural History Of British India [۱]
By
Abdulla Yusuf Ali : P 41-42

www.urduchannel.in

مگر ساہوکاروں کو اسقدر نا دہندی کے باوجود رقم واپس ملنے کی توقع ہوتی ہے غالباً یہ ایک ہی مثال ہوگی کہ روپیے کی روانگی سے قبل دائن کو جائداد پر قبضہ مل جائے۔ اور اس سے وہ اپنے سود کا روپیہ وصول کرنا شروع کردے۔ اور پھر الٹا دائن کے نام نہ ادا کی ہوئی رقم کا رقعہ لکھے اور مرہونہ جائداد سے وصول کرکے دو سال کے بعد دائن کو روپیہ دے۔ العجب ثم العجب"۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں کم و بیش یہی حالت رونما تھی۔ بالخصوص اٹھارویں صدی ہندوستان میں طوائف الملوکی، بدنظمی، اور انتشار کا سب سے پر آشوب دور گزرا۔ اسکی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک نئی طاقت رفتہ رفتہ زور پکڑ رہی تھی۔ یہ انگریز تھے جو پہلے ہندوستان میں صرف تجارتی مقاصد لیکر آئے تھے اور یہاں کے ماحول نے انھیں حکومت کا خواب دکھادیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انکی جدوجہد بنگال کی دیوانی سے شروع ہوکر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ پر ختم ہوئی۔ اور اس سال مغلیہ حکومت کا خاتمہ اور ملکۂ معظمہ کی شہنشاہی کا اعلان ہوا۔ انگریزوں کے برسر اقتدار آنے تک مسلمانوں پر کئی طرف سے حملے شروع ہوئے۔ خود ہندوستان میں مرہٹوں اور سکھوں نے ان کے مقابلہ کیلئے اپنی تنظیم کی۔ مرہٹوں کی تباہی کے بعد سکھ باقی رہ گئے۔ انھوں نے اپنی جماعت میں بڑا مذہبی جوش و خروش پیدا کردیا۔ دوسری طرف انگریزوں کے زیرحمایت پادریوں اور مشنریوں نے "عیسائیت" کی تبلیغ کی آڑ میں اپنا کام شروع کیا۔ ان تمام حملوں کا نتیجہ عالمگیر خلفشار کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جس سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے اس دور کے اکابر علماء نے علمی و مجاہدانہ کوششیں بھی کیں۔ حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ نے قوت ایمانی کو ایک مرکز پر لانے کی بڑی جدوجہد کی۔ رائے بریلی اور دہلی میں جو مجاہدانہ کوششیں شروع ہوئیں اُن میں حضرت سید احمد بریلوی۔ مولانا اسمٰعیل شہید اور انکے رفقاء نے بڑی بڑی قربانیاں کیں اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ مسلمان زمانے کے بدلے ہوئے رنگ سے ہم آہنگ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ خانقاہیں ویران اور مدرسے سنسان ہوتے جارہے تھے۔ لیکن نئے اسکولوں اور کالجوں میں جانا مسلمانوں کے نزدیک ایمان گنوانا تھا۔ علوم قدیمہ کی بنیادیں سائنس اور جدید فلسفے نے متزلزل کردی تھیں۔ لیکن ان کا جواب جدید علم کلام سے دینے کی صلاحیت مسلمانوں میں پیدا نہ ہوئی تھی کیونکہ اسکے لئے پہلے جدید علوم و فنون سے واقفیت ضروری تھی۔ اس کام کیلئے قدرت نے سرسید کو پیدا کیا۔ سرسید نے خود بڑا کام کیا اور اپنے بعد کام کرنیوالوں کی ایک ایسی مخلص اور سرگرم جماعت چھوڑ گئے جنکا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں قوت کے ساتھ اب بھی جاری ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کا تعلق بھی

www.urduchannel.in

اسی جماعت سے ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

اس عہد کا علمی و ادبی ماحول

سیاسی و معاشرتی انتشار کا اندازہ اوپر کے بیان سے ہو گیا ہوگا۔ آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے علمی و ادبی ماحول پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

اُردو شاعری کا باقاعدہ آغاز دسویں صدی ہجری میں ہو گیا تھا اور گیارھویں صدی ہجری سے کلیات دواوین اور مثنویات مرتب ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن اس شاعری کا بڑا حصہ رسمی تھا۔ غزل، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ یہی مرغوب اصناف تھے۔ مضامین میں بعض دکنی شعراء نے البتہ اس کا لحاظ رکھا تھا کہ اُردو شاعری میں فارسی شاعری کے مروجہ مضامین اور اسالیب سے قطع نظر خاص ملکی چیزوں کو بھی داخل کیا جائے۔ چنانچہ اکثر شعراء نے شعرائے ایران کی روش کے خلاف عورت کو معشوق قرار دیا ہے اور تشبیہات اور استعارات میں بھی ملکی مناظر و مظاہر سے کام لیا ہے لیکن شاعری کا تمام دفتر خالص جمالیاتی یعنی شاعری برائے شاعری، یا فن برائے فن کے ماتحت تھا۔ وَلی، مظہر، آرزو، سوداؔ میر، انشاء، انیس، دبیر غرض اُردو شاعری کے یہ تمام نامور ستارے ایک ہی محور کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ انمیں بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے زبان و بیان سے قطع نظر نئے موضوعات اور مضامین پر بھی توجہ کی، لیکن سوائے حاتی کے جنہوں نے لکھنؤ کے بگڑتے ہوئے مذاق کو سدھارنے میں بڑی مدد دی اور کوئی صنف شاعری ایسی نہیں ملتی جس کا تعلق زندگی سے زیادہ قریب کا ہو۔ یہاں تک کہ شاعری کے متعلق خود ایک اُردو شاعر کو جو عرصہ تک قدیم رنگ میں مشق سخن کر چکا تھا شعر و قصائد کو ناپاک دفتر کہنا پڑا[۱]۔ اور اسطرح اس شاعری کی داغ بیل پڑی جسے ملکی یا قومی شاعری کہتے ہیں جسنے اس عہد کے بدلتے ہوئے رنگ کی ترجمانی کی۔ اسی زمانہ میں لاہور میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات تھے۔ انکی تحریک پر مشاعرہ کی بجائے محفل مناظمہ کی بنیاد پڑی۔ جسمیں بجائے مصرعہ طرح دینے کے شعراء کو موضوع دیا جاتا تھا۔ اور جس پر شعراء غزل کے بجائے نظم لکھتے تھے۔ یہ پہلا دن تھا کہ جدید شاعری سے اس ملک کے کان آشنا ہوئے۔

شبلی سے پہلے اُردو نثر کا سرمایہ

اُردو نثر کا بھی یہی حال تھا۔ اسکے پہلے دور کو اگر ہم مذہبی دور کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ اسلئے کہ اس زمانے میں ہمارے صوفیائے کرام نے اسے (اُردو) مذہب کی تبلیغ اور اشاعت کا ذریعہ بنایا تھا تاکہ انکے پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں اور اس سے فائدہ حاصل کریں۔ اس سلسلے میں شیخ عین الدین گنج العلم[۲] کے کئی رسالے[۳] (دکنی میں) خواجہ بندہ نواز گیسو دراز[۴] کی معراج العاشقین (جس کا سنہ

---

[۱] مسدس حالی۔

[۲] موصوف ۷۰۶ھ / ۱۳۰۶ء میں دہلی پیدا ہوئے۔ دولت آباد جو تغلق کا دارالحکومت تھا آئے اور پھر یہیں اقامت اختیار کرلی۔

[۳] اردوئے قدیم۔

[۴] پیدائش دہلی سنہ ۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء وفات بیجاپور سنہ ۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ء۔

www.urduchannel.in

میراں جی شمس العشاق بیجاپوری کی شرح مرغوب القلوب (۹۰۱ھ / ۱۴۹۵ء) [2] تصنیف سنہ ۹۰۸ھ / ۱۵۰۲ء ہے اور جو حال میں طبع بھی ہوچکی ہے) [1] اورنگ زیب قاسمی
مولانا عبداللہ کی احکام الصلوٰۃ (۱۰۳۳ھ / ۱۶۲۳ء) [3] اور میراں یعقوب کی شمائل اتقیا (۱۰۷۸ھ / ۱۶۶۷ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یہ اُردو نثر کے ابتدائی نقوش ہیں۔ انیں زبان صاف وسادہ استعمال کیگئی ہے۔ تکلف اور تصنع سے حتی الوسع گریز کیا گیا ہے۔ پھر بھی کہیں کہیں عبارت الجھی ہوئی اور گنجلک معلوم ہوتی ہے اس دور کی ایک اور مشہور تصنیف ملّا وجہی کی سب رس ہے جو قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۴ء میں تصنیف ہوئی [4] (یہ فارسی قصّے "حسن ودل" سے ماخوذ ہے) اسکے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں فارسی سے ترجموں کا رجحان پیدا ہوگیا تھا۔

ترجموں سے اُردو کو یہ فائدہ پہونچا کہ نہ صرف فارسی الفاظ ومحاورے اور استعارات وتشبیہات اُردو میں آنے لگے بلکہ انکے ساتھ ساتھ فارسی خیالات اور اسالیب نے بھی اُردو میں راہ پائی۔ اس سے زبان کو وسعت نصیب ہوئی مگر دوسری طرف نقصان بھی پہونچا۔ یعنی "سہ نثر ظہوری" کا اُردو میں تتبع ہونے لگا۔ "سب رس" اگرچہ ایک قصہ ہے مگر اس پر مذہبی رنگ طاری ہے۔

قافیہ کے التزام کیوجہ سے گو اس کتاب میں کہیں کہیں تصنع اور آورد پیدا ہوگئی ہے پھر بھی بحیثیت مجموعی سلاست وروانی پائی جاتی ہے۔ انکے بعد باقر آگاہ اور بدر الدولہ کی بہت سی تصانیف [5] ملتی ہیں۔

شمالی ہند کی اُردو نثر

فضلی کی "دہ مجلس" کے بارے میں اختلاف آرا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اس تصنیف کو دکنی تصنیفات کے سلسلے میں شمار کیا ہے [5]۔ اور احسن مارہروی مرحوم اسے شمالی ہند کی تصنیف خیال کرتے ہیں۔ اول الذکر نے اپنے دعویٰ کی دلیل میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا ہے مگر آخر الذکر نے جو دلائل دیے ہیں وہ قرین قیاس ہیں۔ ملاحظہ ہو فٹ نوٹ [6]۔

---

[1] تاریخ نثر اُردو : صـ ۳۹۔

[2] صاحب نثر اردو نے اس کتاب کے تصنیف ہونے کا زمانہ سنہ ۱۴۹۵ء لکھا ہے مگر تاریخ ادب اُردو (ادارہ ادبیات اردو) میں میراں جی کی پیدائش سنہ ۱۴۹۶ء ہے چونکہ دونوں رائیں مختلف ہیں اسلئے صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے کہ کتاب کا واقعی سنہ تصنیف کیا ہے۔

[3] تاریخ نثر اُردو : صـ ۴۳

[4] دکن میں اُردو : صـ ۳۱

[5] و [6] " : صـ

[6] فضلی کو اورنگ آبادی لکھا گیا ہے مگر اس ترجمے کے دیکھنے سے یقین نہیں ہوتا کہ وہ دکنی نہیں۔ اسکے دیباچہ میں جنوبی ہند کی زبان کا اگر کچھ اثر ہے تو اتنا ہی جتنا کہ اس عہد کے دوسرے شمالی ہندوالوں کی تحریروں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ یا یہ کہ وطن اصلی انکا دکن ہو لیکن وہ خود تمام عمر شمالی ہند میں رہے۔ اور یہیں کی زبان اور طرز بیان کے عادی رہے۔ ایک اور ثبوت انکے دکنی نہ ہونے کا یہ ملتا ہے کہ انہوں نے اپنے دیباچہ میں دعویٰ کیا ہے کہ "مجھسے پہلے کسی نے فارسی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا اختراع نہیں کیا۔" اگر وہ دکنی ہوتے اور وہیں کا رہنا سہنا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ انکی نظر

(دوسرا صفحہ ملاحظہ ہو)

www.urduchannel.in

اس کتاب کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کا جو انداز دکنی میں پیدا ہو چلا تھا شمالی ہند میں اور بھی نکھر گیا - عبارت میں رنگینی اور تکلف نے دخل پا لیا - زبان سجع و قوافی کی بھول بھلیوں میں پھنس کر اپنی سلاست اور خوبصورتی کھو رہی ہے پھر اس طرز ادا کو عیب نہیں کہا جا سکتا ۔ زبان کی ارتقاء میں یہ مراحل ضرور پیش آتے ہیں -

اس دور کے مصنفین میں عطا تحسین، سودا، حضرت شاہ عبد القادر اور انشاء اللہ خاں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں - عطا تحسین کی " نوطرز مرصع " (۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء) - شاہ عبد القادر کا " ترجمۂ کلام پاک " (۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء) اور انشاء اللہ خاں کی " دریائے لطافت " (یہ اگرچہ فارسی میں ہے لیکن اُردو نثر کے بکثرت مضمون اسمیں ملتے ہیں) اُردو نثر کی مشہور و مستند کتابوں میں شمار کیجاتی ہیں - سودا بھی اپنی مخصوص طرز عبارت کیلئے مشہور ہیں - انکی زبان کا نمونہ ان کا خود نوشتہ دیباچہ ہے (۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء) جو انکے کلیات کیساتھ شامل ہے اور مثنوی شعلہ عشق کا خلاصہ ہے - اسی سلسلہ کی ایک کڑی مرزا رجب علی بیگ سرور کی " فسانۂ عجائب " (۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء) ہے جو رنگینی اور لفاظی کا نمونہ قرار دیجا سکتی ہے - اس دور میں فضلی کی " دہ مجلس " سے لیکر انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت " اور رجب علی بیگ سرور کی " فسانۂ عجائب " تک سب کا قریب قریب ایک ہی انداز ہے - یعنی فارسی کا غلبہ - ان کتابوں کا تعلق زیادہ تر قصص و حکایات سے ہے - تاریخ، سوانح، اخلاق و معاشرت وغیرہ سنجیدہ موضوعات پر ایک بھی کتاب نہیں لکھی گئی تھی - اور اسوقت تک اردو کی ترقی کی جو کوششیں نظر آتی ہیں وہ محض انفرادی ہیں - اجتماعی کوششوں کے نتیجے فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، حیدر آباد کے شمس الامراء اور شاہان اودھ کے دار الترجمے، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی اور سب سے آخر مگر سب سے زیادہ اہم سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ ہے -

فورٹ ولیم کالج

اس کالج کا افتتاح لارڈ ولزلی کے عہد ۴ مئی ۱۸۰۰ء میں ہوا اس کا اصل مقصد انگریزوں کو اُردو زبان سے آشنا کرنا تھا - جیسا کہ سطور ذیل سے معلوم ہوتا ہے :-

" صاحبان ذیشان کو شوق ہوا کہ اُردو کی زبان سے واقف ہو کر ہندوستانیوں سے گفت و شنید کریں اور ملکی کام کو بہ آگاہی تمام انجام دیں " - [1]

سے وہ تمام تراجم اردو نہ گزرے ہوں جن کا وجود آج ہم کو بعد تلاش مگر بہ کثرت مل رہا ہے - اور اسی حالت میں دیدہ و دانستہ وہ ایسے ادعائے اختراع کے لئے غالباً جسارت نہ کر سکتے - لہذا اسی ترجمے و تالیف کو صرف شمالی ہند کے لئے پہلی نثر اردو کا نمونہ کہہ سکتے ہیں : تاریخ نثر اردو : مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ : ص ۱۷

[1] مقدمہ مصنف باغ و بہار : ص ۳ : مطبوعہ انتظامی پریس کانپور : ۱۹۳۱ء

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

تاکہ انھیں اپنے انتظامی ضروریات میں کسی قسم کی زحمت ہو یہ خدمت منظور نہ تھی۔ یہ تو اس زبان کی خوش قسمتی تھی کہ اسی بہانے اُس کی آبیاری ہوتی رہی۔ مگر یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ اُردو ہندی قضیہ کی ابتدا بھی یہیں سے ہوئی چونکہ اس کالج کا مقصد انگریزوں کو ہندوستانی تعلیم دینا تھا اسلئے ضرورت تھی کہ ایسے اشخاص کا انتخاب کیا جائے جو اُردو زبان کے مستند صاحب طرز ہوں اور سیدھی سادی آسان اُردو میں تصنیف و تالیف کا کام کریں۔ اس کالج کے حصار میں جو تصانیف اور تراجم ہوئے انمیں میرامن کی "باغ و بہار" (۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۲ء) اور "گنج خوبی"[1] (۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء)۔ حیدر بخش حیدری کی "آرائش محفل"[2] (۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء) اور "طوطا کہانی"[3] (۱۸۰۱ھ / ۱۲۱۶ء)۔ شیر علی افسوس کی "آرائش محفل" (یہ سجان رائے بٹیالوی کی فارسی کتاب خلاصۃ التواریخ پر مبنی ہے[4]) اور "باغ اُردو"[5] (۱۲۱۴ھ / ۱۸۰۱ء)۔ میر بہادر علی حسینی کی "نثر بے نظیر"، "مثنوی سحرالبیان" کو اُردو میں لکھا ہے)۔ "اخلاق ہندی" (۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء) اور رسالہ گلکرسٹ[6]۔ مرزا لطف علی کی "گلشن ہند"[7] (۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء)۔ نہال چند لاہوری کا "قصہ گل بکاؤلی" (۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء) اور مظہر علی خاں ولا کی[8] "تاریخ شیر شاہی" اور "ہفت گلشن" قابل ذکر ہیں۔ ان میں جو شہرت عام "باغ و بہار" کو نصیب ہوئی وہ کسی دوسری کتاب کو میسر نہ ہوئی۔

فورٹ ولیم کالج سے صرف قصص و حکایات ہی کی اشاعت نہیں ہوئی بلکہ اس میں تاریخ و تذکرہ کی بھی کچھ کتابیں ہیں۔ مثلاً "تاریخ شیر شاہی"، "تاریخ آسام" اور تذکرۂ گلشن وغیرہ۔ لیکن ان کتابوں کا عدم اور وجود دونوں برابر ہے۔ کیونکہ ان سے عام مذاق پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

عام طور سے مشہور ہے کہ میر امن کی "باغ و بہار" پہلی کتاب ہے جس میں سادگی، سلاست اور بامحاورہ اُردو لکھی گئی۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ مولانا اسمٰعیل شہید کی "تقویت الایمان" شاہ عبد القادر کی "موضح القرآن" اور اسد اللہ خاں غالب کے خطوط اس سے پہلے کی کوششیں ہیں۔ جو زبان کی سادگی اور بے تکلفی میں آپ اپنی نظیر ہیں[9]

دہلی کالج

جیسی فوردیہ

فورٹ ولیم کالج کے ساتھ ساتھ دہلی کالج کا نام لینا بھی ضروری ہے۔ جس نے سب سے پہلے وہ طریق تعلیم اختیار کیا ~~جو~~ کی آج ہر جگہ اور ہر تعلیمی ادارہ میں ضرورت محسوس کیجا رہی ہے۔ یعنی نئے علوم کی تعلیم دیسی زبان میں۔ ظاہر ہے کہ اسکے لئے مختلف علوم و فنون کی ایسی کتابوں کی ضرورت تھی جو دوسری زبان سے ہندوستانی

---

[1] حسین واعظ کاشفی کی کتاب "اخلاق محسنی" کا ترجمہ۔
[2] یہ حاتم طائی کا قصہ ہے۔
[3] محمد قادری کے "طوطی نامے" کا ترجمہ ہے۔
[4] تاریخ ادب اُردو (ادارۂ ادبیات اُردو) - ص۱۱۱
[5] گلستان سعدی کا اُردو ترجمہ۔
[6] ڈاکٹر گلکرسٹ کے رسالے صرف و نحو سے ماخوذ ہے۔
[7] اُردو کے چند منتخب اور مشہور شعراء کا تذکرہ ہے جو ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر لکھا گیا۔
[8] تاریخ ادب اُردو (ادارۂ ادبیات")
[9] نقوش سلیمانی (سید سلیمان ندوی)

www.urduchannel.in

میں ترجمہ کی گئی ہوں ۔ چنانچہ اسکے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی اور کتابوں کے ترجمے ہونے لگے ۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں :۔

(۱) تاریخ انگلستان (۲) اصول علم ہیئت (۳) رسالہ کیمسٹری (۴) پولیٹیکل اکانمی
(۵) نیچرل تھیالوجی (۶) مختصر خاکہ تاریخ عالم (۷) جغرافیہ طبعی (۸) حرکیات
(۹) رسالہ برق (۱۰) رسالہ طب (۱۱) رسالہ اسلوب حساب وغیرہ ۔

دار الترجمہ لکھنؤ

لکھنؤ نے بھی جدید علوم و فنون کی اشاعت میں حصہ لیا ۔ شاہان اودھ کے زمانہ میں یہاں بھی ایک دار الترجمہ قائم تھا اور نئے علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ ہوکر سلطان پریس سے شائع ہوتی تھیں ۔ جن میں چند یہ ہیں :۔

"مطبع سلطانی" نام تھا ۔ یوں ہی لکھنا بہتر ہوگا ۔

(۱) رسالہ ہیئت مصنفہ ڈاکٹر ولسن (۲) رسالہ علم کیمیا (۳) رسالہ علم المناظر (۴) رسالہ علم الہواء ۔

حیدر آباد میں شمس الامرا کا دار الترجمہ

شمس الامراء ثانی کو علم و فن سے خاص دلچسپی تھی ۔ اسی لئے خود انھوں نے بھی کئی رسالے انگریزی سے ترجمہ کئے ۔ مثلاً ستۂ شمسیہ ، رسالۂ اعمال کرہ (۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء میں طبع ہوا) وغیرہ ۔

۱۸۵۷ء اور اسکا قریبی دور

۱۸۵۷ء اور اسکے قریبی زمانے کو اُردو زبان کے قدیم اور نشاۃ الثانیہ کے درمیان ایک طرح کا عبوری دور کہنا چاہئے ۔ یعنی زبان میں ایک خاص قسم کی تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے ۔ گو عام مذاق ابھی پرانے طرز کو پسند کرتا تھا ۔ فورٹ ولیم کالج نے اتنا تو ضرور کیا کہ کچھ کتابیں روزمرہ اور بامحاورہ زبان میں تصنیف کرادیں لیکن عام ذہنیت کو تبدیل کرنا ان لوگوں کے بس میں نہ تھا ۔ یہ زمانہ خصوصیت کے ساتھ ایسا تھا کہ جب ہندوستانی انگریزوں کے اقوال و افعال پر شک کرنے لگے تھے ۔ اسی شک کا نتیجہ آخرکار ۱۸۵۷ء کے خونیں واقعہ کی صورت میں ظاہر ہوا ۔ اس ہنگامہ کے بعد ایک طرف ہندوستان کی سیاست بدل گئی اور دوسری طرف اردو ادب نے بھی کافی تبدیلی پیدا کی ۔

سر سیّد احمد خاں

اردو ادب کی نشاۃ الثانیہ سر سیّد کے ہاتھوں ہوئی ۔ انھوں نے ذات سے اُردو زبان کو صحیح راستہ پر ڈالا اور اسے قابل بنادیا کہ وہ ہر قسم کے مضامین کی متحمل ہوگئی ۔ "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کی تاکہ مختلف علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ ہوکر اُردو کے ذخیرہ کو وسعت دیں ۔ "تہذیب الاخلاق" جاری

www.urduchannel.in

کیا جسکی بدولت ہمارے ادب اور انشاء کا رخ بدل گیا۔ تصنع کی جگہ سادگی اور اصلیت نے لے لی۔ عبارت میں سنجیدگی اور پختگی آئی۔ سرسیّد نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ اور ہر ایک کا حق پورے طور پر ادا کیا ہے۔ اُن کی اہم تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

اورنگ زیب قاسمی

آثار الصنادید[1] (۱۲۷۱ھ/۱۸۴۵ء) - تاریخ بجنور (۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء) - تاریخ سرکشی بجنور (۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء)
خطبات احمدیہ[2] (۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء) - سلسلۃ الملوک[3] (۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء) - تاریخ فیروز شاہی (۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء)
تسہیل فی جرالثقیل[4] (۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء) - کلمۃ الحق (۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء) - راہ سنت در رد بدعت (۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء)
اسباب بغاوت ہند (۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء) وغیرہ۔

مولانا آزاد

آزاد نے جدید اُردو شاعری کا آغاز کیا اور جہانتک انکی نثر کا تعلق ہے انھوں نے ایک ایسا اسلوب پیدا کیا جو آپ اپنی نظیر ہے۔ اور جسکا اتباع تقریبًا ناممکن۔ انکی عبارت نہ مقفّیٰ ہے نہ مسجّع۔ پھر بھی انداز نرالا اور نہایت دلکش ہے۔ لیکن یہ اسلوب ایسا نہیں جس میں ہر قسم کے مضامین سما سکیں۔ چند اہم تصانیف درج ذیل ہیں:۔

آبحیات[5] (۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء) دربار اکبری[6] - اور نیرنگ خیال (۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء)

ڈپٹی نذیر احمد

نذیر احمدؒ کی عبارت صاف، سادہ اور با محاورہ ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں عام بول چال کی زبان برتی ہے۔ بقول مولوی عبدالحق "اگر کوئی انگریزی نما اُردو کی جگہ ٹھیٹ اُردو زبان سیکھنا چاہے تو اسکو نذیر احمدؒ کا مطالعہ لازمی ہے۔"[7] یہ انداز تحریر قصوں اور افسانوں میں تو کھپ سکتا ہے لیکن سنجیدہ علمی مضامین یا سنجیدہ مذہبی خیالات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انکی "امہات الامۃ" اور "ترجمۂ کلام پاک" پر بڑی لے دے ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمدؒ نے "توبۃ النصوح"، "بنات النعش"، "رویائے صادقہ"، "محصنات"، "ابن الوقت" اور "ایامیٰ" لکھ کر نہ صرف ناول نویسی کی بنیاد ڈالی بلکہ اسکو پروان بھی چڑھایا۔ ان کا سب سے بڑا اور قابل قدر کارنامہ قرآن پاک کا ترجمہ ہے (۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء)۔ انگریزی سے ترجموں کے سلسلہ میں "انڈین پینل کوڈ" ، "انڈین جورسس پروڈنس"۔ "انکم ٹیکس ایکٹ"

---

[1] اسمیں نہایت تفصیل وصحت کیساتھ دہلی کی قدیم وجدید عمارتوں کا حال قلمبند کیا ہے۔
[2] مذہبی خیالات اور اصول عقائد کو عام فہم اور دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے۔
[3] یہ کتاب ان بادشاہوں اور راجاؤں کی فہرست ہے جو دہلی میں پانچہزار برس تک یکے بعد دیگرے حکومت کرتے چلے آئے تھے۔ یہ فہرست آثار الصنادید کے ضمیمہ کے طور پر لکھی گئی تھی۔ دوسرے ایڈیشن کے ساتھ شائع ہوئی (علیگڑھ میگزین ۱۹۳۷ء)
[4] تسہیل فی جرالثقیل کا ترجمہ ہے جو پادری جیمس میور کی تحریک سے ہوا۔
[5] یہ سا شاعری کا تذکرہ ہے جو جدید طرز پر مرتب کیا گیا۔
[6] یہ اکبری عہد کے معاشرت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔
[7] مقدمہ حیات النذیر : مولوی عبدالحق

www.urduchannel.in

اور "انڈین ایوی ڈنس" کے ترجمے فراموش نہیں کئے جا سکتے۔
اورنگ زیب قاسمی

مولانا حالی

"مولوی حالی کی تحریریں نہایت جچی تلی، سادہ، سلیس سنجیدہ اور متین ہوتی ہیں۔" انھوں نے ہردو رنگوں (آزاد اور نذیر احمد کی طرز تحریر) کی اصلی روح لینے کی بجائے صرف انکی ظاہری خصوصیات کی تقلید کی جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ زبان بلا کی روکھی پھیکی اور بے مزہ ہو گئی۔"[۱] یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ مولانا حالی جن حالات و حوادث کے ماتحت اور جس عالم میں ہمارے سامنے آئے اسکو مد نظر رکھتے ہوئے ان سے لفاظی اور رنگینی کا مطالبہ کرنا قرین انصاف نہیں ہے۔ یہ فیصلہ بھی درست نہیں کہ مولانا حالی نے آزاد اور نذیر احمدؒ کے اسلوب بیان کی پیروی کی ہے۔ نذیر احمدؒ اور آزاد دونوں زبان میں کم و بیش صنعت گری کا التزام رکھتے تھے۔ حالی کی زبان و انداز بیان اس اعتبار سے بالکل جداگانہ ہے کہ وہ بھولے سے بھی کم و بیش تصنع یا ترجیع کا التزام نہیں رکھتے تھے۔ حالی نے اگر ایک طرف مسدس لکھ کر نظم کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا تو دوسری طرف "حیات جاوید"۔ "مقدمۂ شعر و شاعری"۔ "یادگار غالب" اور "حیات سعدی" جیسی کتابیں تصنیف کر کے نہ صرف اردو ادب میں نئے ابواب کا اضافہ کیا بلکہ اس میں نئی شاہراہیں بھی کھول دیں۔

اُردو میں سنجیدہ علمی تصنیفوں کا آغاز اگرچہ غدر سے بہت پہلے ہو چکا تھا اور انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے اس کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن نتیجہ کے اعتبار سے وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ مولانا شبلی ایک موقع پر فرماتے ہیں :-

> " آپ فرماتے ہیں اُردو کی تمام عمدہ کتابوں کے نام لکھو، افسوس اردو میں ابھی ہے ہی کیا ؟ میری دانست میں اُردو کی تمام عمدہ کتابیں آپکے پاس موجود ہیں۔ آبِ حیات، نیرنگ خیال، حیات سعدی وغیرہ۔ تہذیب الاخلاق بس یہی اس زبان کا گنجینہ ہے۔ اور غالباً آپکی لائبریری میں یہ سب کتابیں موجود ہیں۔ مولوی آزاد نے دیوان ذوق ایک خاص ترتیب سے چھاپا ہے۔ بے شبہہ وہ دیکھنے کے قابل ہے۔ آزاد کی باقی تصنیفات دربار اکبری وغیرہ بھی عنقریب چھپیں گی۔ اُمید ہے کہ آپکی نگاہوں سے گذریں۔ ہماری زبان میں ردیاں بہت جمع ہیں مگر کام کی ڈھونڈھئے تو مشکل سے ملے گی۔ وہ بھی دو چار سے زیادہ نہیں ...."[۲]

---

[۱] اُردو کا بہترین انشاء پرداز : سعید انصاری

[۲] مکاتیب شبلی : حصہ دوم : طبع دوم : ۱۹۲۰ء

www.urduchannel.in

اردو زبان کو درحقیقت سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی نے علمی زبان بنایا۔ ان بزرگوں میں مولانا شبلی مرحوم کی تصانیف تنوع اور کثرت کے اعتبار سے سب میں ممتاز ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ انہی کی تصانیف نے اردو زبان کو ترقی یافتہ زبانوں کا ہم پایہ بنایا۔ بقول مہدی الافادی :-

اورنگ زیب قاسمی

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی "اردوئے خاص" کی داد ملتی جسنے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جسپر نگاہیں اٹھتی تھیں آج اس لائق بنا دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبان سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جوانیں پر آئی ہوئی نچلی نہیں بیٹھ سکتی۔ مدتوں شعرا سے گاڑھا اتحاد رہا۔ بہ اقتضائے سن بری طرح کھل کھیلی۔ ہاتھ پاؤں نکالے اور بہتیرے بنائے بگاڑے۔ کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا۔ لیکن یہ باتوں ہی باتوں میں سب کو ٹالتی رہی۔ بعض جگر لے آبرو ئی کے سامان ہو ہو کر رہ گئے۔ اور یاں بال بچی۔ آخر آخر میں ملک کے منچلے یعنی ناول نویس تو یہاں تک ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ اسکی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ کبھی کبھی دبی زبان سے اسے یہ کہتے سنا ہے

اری اٹھ جا دنگی میں صحنک سے

لیکن دفعتاً اسکی حالت نے پلٹا کھایا کثرت فواحش باعث سنجیدگی ہوئی۔ اچھے دن آتے ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے۔ اب وہ مقدس علما کی کنیزوں میں داخل ہے سنا گیا ہے خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے اور قریب قریب انہی کے تصرف میں رہتی ہے۔" [1]

---

[1] افادات مہدی : ص

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

بابِ دوم

شبلیٔ اعظم

شبلی کی شہرت اور اسکی بنیادیں

خطۂ یونان کے ساتھ ساتھ خطۂ ہندوستان کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ لیکن اول الذکر اپنے فلسفہ کی بدولت ڈوبا، آخر الذکر ابتک اپنی روحانیت کے سہارے زندہ ہے[1]۔ جب سے اسکی تاریخ کا آغاز ہوا آج تک یہ مردم خیز خطہ اربابِ فضل وکمال کا گہوارہ رہا ہے۔ اور یہاں تلوار کے دھنی، شجاعت میں فرد، علم میں یکتا، محبت میں ضرب المثل، ہر صنف کے صاحب کمال پیدا ہوئے لیکن ایسی جامع ہستیاں یہاں بھی کم ملیں گی جن میں بہ یک وقت بہت سے اوصاف جمع ہوں۔ شبلی کا شمار ایسی ہی مستثنیٰ مثالوں میں ہے۔

عیسائی مشنریوں کے حملے اور انکا جواب

شبلی کی شہرت سب سے زیادہ مورخ اسلام کی حیثیت سے ہے۔ اور اس میں بھی اُن کا خاص موضوع اُن اعتراضات کا محققانہ اور مدلل جواب ہے جو یورپ کے مصنفین اور محققین اسلام اور مسلمانوں پر کرتے چلے آئے ہیں۔ آغازِ داستان میں اسطرف اشارہ کیا جاچکا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سیاست کے اقتدار کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ عیسائی پادریوں اور مشنریوں کو مسیحیت کی تبلیغ میں بڑی آسانی ہوگئی۔ مشنریوں کے ان حملوں کی داستان بہت طویل ہے اور اس سلسلہ میں مولانا رحمۃ اللہ صاحب کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب (آگرہ) اور اسکے بعد مولانا قاسم صاحب نانوتوی، مولانا رحیم علی صاحب منگلوری[2] مولانا عنایت رسول صاحب چڑیاکوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری، اور ان کے احباب کی جماعت کھڑی ہوگئی یہاں پادریوں کے سردار پادری فنڈر صاحب تھے۔ اُن کے مقابلے میں ڈاکٹر وزیر خاں کھڑے ہوئے جو عیسائیوں کے رموز و اسرار سے کماحقہٗ واقف تھے۔ اور انکی مذہبی کتابوں پر کامل عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ عبرانی اور یونانی زبان کے

؟ قاسم جر نانوتوی

---

[1] یہاں اس واقعہ کی تاریخی سند سے بحث نہیں۔ ایک عام عقیدے کیطرف اشارہ ہے

[2] بحوالہ حیاتِ شبلی : ص ۱۵

۲ (دیباچہ)

یہ لفظ یہاں درست نہیں اسلیے کہ حیاتِ شبلی مقالہ نگار کے سامنے ہے۔ جب "بحوالہ حیاتِ شبلی" لکھا تو یہ سمجھا جائے گا کہ کسی دوسرے لکھنے والے نے اپنی تحریر میں حیاتِ شبلی کا حوالہ دیا ہے اور اُس سے مقالہ نگار نے اخذ کیا ہے۔

www.urduchannel.in

ماہر تھے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کیساتھ مل کر انھوں نے اُن ناپاک حملوں کے خلاف ایک آہنی دیوار کھڑی کردی۔ لیکن دوسرا حملہ جو علمی رنگ میں مسلمانوں کے مذہب، تمدن، اور تاریخ پر تھا وہ پہلے حملے سے کہیں زیادہ سخت اور اپنے اثرات اور نتائج کے اعتبار سے کہیں زیادہ مضر تھا۔ اسمیں تاریخی تدلیس اور غلط بیانیوں سے مسلمانوں کو متعصب اور انکے مذہب اور تمدن کو وحشیانہ ثابت کرنے کی کوشش کیجارہی تھی۔ مثلاً عربوں کی علم دشمنی کے ثبوت میں اسکندریہ کا کتب خانہ جلانے کے جھوٹے اور بے بنیاد الزام کی تشہیر کی گئی۔ اور اُنکے تعصب کے ثبوت میں جزیہ کو نہایت بدنما شکل میں پیش کیا گیا۔ کہ یہ ٹیکس مسلمان محض ذمیوں کو ذلیل وخوار کرنے کے لئے وصول کرتے تھے۔ اور اس قسم کے بہت سے جھوٹے واقعات کو رنگ آمیزی کے ساتھ مشہور کیا جاتا تھا۔ ادھر ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے مذہب اور اپنے اسلاف کے کارناموں تک سے ناواقف تھے۔ خصوصاً نئی نسل جو مغربی علوم وفنون کے سحر سے مسحور تھی ان خرافات کو یقین کرنے لگی تھی۔ جس سے قدرتاً اسکے دل میں اپنے مذہب، اپنی تہذیب ومعاشرت اور اپنی تاریخ سے شرم آنے لگی تھی اور اسکو یقین ہو چلا تھا کہ مسلمان اپنے طویل عہد حکومت میں صرف عیش پرستی کرتے تھے۔ اور انکا مذہب تہذیب و تمدن کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ان غلط فہمیوں کو دور کرنیکے لئے ایک پرزور اہل قلم کی ضرورت تھی۔ اس کام کو شبلی نے پورا کیا۔ انھوں نے ان اعتراضوں کی تردید، مسلمانوں کی بے تعصبی اور ان کے علمی وتمدنی کارناموں پر بکثرت مضامین لکھے جو مقالات کی صورت میں ہیں۔ لیکن شبلی کو اس سے بھی بڑا کام کرنا تھا۔

جہاد بالقلم۔ مضامین ومقالات

قوموں کی تعلیم وتنظیم میں انکی تاریخ ماضی کو بڑا دخل ہے۔ بدقسمتی سے اُردو کا دامن اس سے بڑی حد تک خالی تھا۔ ہندوستان میں ابھی تک کوئی ابن خلدون پیدا نہیں ہوا تھا جو تاریخ پر فلسفہ پر رنگ چڑھاتا اس کمی کو بھی شبلی کی ذات نے پورا کیا۔ مسلمانوں کے عروج وترقی کا سب سے زریں زمانہ عباسیوں کا عہد حکومت ہے اسلئے مولانا نے سب سے پہلے تاریخ بنی عباس کا کام شروع کیا۔ اور جیسا کہ انکے مکاتیب سے مترشح ہوتا ہے وہ اس کام کو بہت آگے بڑھا چکے تھے:۔ [1]

"مجھکو تو آج کل تاریخ بنی عباس کی پڑی ہے ....

.... اسوقت میں معتصم کا حال لکھ رہا ہوں اور پہلی جلد انشاءاللہ یہیں ختم ہوجائیگی"۔ [2]

لیکن بعد میں محسوس ہوا کہ میدان بہت وسعت اختیار کر گیا ہے اسلئے پوری تاریخ لکھنے کے بجائے ناموران اسلام

---

[1] مکاتیب شبلی : جلد اول : طبع دوم (مطبع معارف) : صفحہ ۵
[2] ″ : ″ : ″ : صفحہ ۷

www.urduchannel.in

کا سلسلہ شروع کیا۔ الماموں اس سلسلہ کی پہلی تصنیف ہے جو واقعی تصنیف (Royal heroes of Islam) کہلانے کی مستحق ہے۔ اور جسنے شبلی کو اردو مصنفین کی صف اول میں جا بٹھایا۔ کوئی شبہ نہیں کہ شبلی اردو کا پہلا فلسفی مؤرخ ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

اردو زبان میں سوانح اور سیرت کی بھی کمی تھی۔ شبلی نے "الفاروق" جیسی نادر اور لاجواب کتاب لکھ کر نہ صرف اس کمی کو پورا کیا بلکہ سوانح نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ قائم کر دیا۔ اسکے لئے شبلی نے جس قدر محنت اور زحمت برداشت کی اسکی تفصیل کسی اور موقع پر آئے گی۔ غالباً واقف کار اشخاص اس سے لاعلم نہ ہونگے کہ اس کتاب کے مواد کی فراہمی کے لئے انھوں نے ممالک اسلامیہ کا سفر اختیار کیا۔ اور یہ پہلا علمی سفر تھا جو ایک ہندوستانی مسلمان نے دور جدید میں کیا۔ جس تحقیق اور کد و کاوش اور جس تلاش اور مطالعہ کا نتیجہ یہ کتاب ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔

ضروریاتِ زمانہ اور شبلی کے فرائض

شبلی جس طوفانی دور میں تھے اسمیں اُن کو بہت کچھ کام کرنا تھا۔ سب سے اہم خدمت مسلمانوں کی تعلیم کی از سر نو تنظیم تھی۔ اس زمانہ میں عربی اور فارسی علوم متداولہ کی افادی حیثیت بہت کم تھی۔ گو عربی مسلمانوں کی مذہبی زبان تھی اور اسکا سارا علمی و تاریخی سرمایہ اسی میں تھا لیکن حکومت کی تبدیلی نے انگریزی زبان اور جدید علوم و فنون کی قدر بہت بڑھا دی تھی۔ یہ وقت بہت سوچنے اور سمجھنے کا تھا۔ سرسید سب سے پہلے اس طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے انگریزوں کی ترقی کو انکی تعلیم و تربیت کا نتیجہ سمجھ کر خود یورپ جاکر انکے تعلیمی اداروں کو دیکھا اور خیال کیا کہ شاید انہی علوم و فنون کے اختیار کر لینے سے مسلمان کچھ سنبھل جائیں۔ اسوقت سرسید نے ایک خواب دیکھا جسکی تعبیر آج مسلم یونیورسٹی ہے۔ لیکن سرسید کے تعلیمی نظریے سے ہر شخص کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ مولانا شبلی باوجود علی گڑھ تحریک کے سرگرم رکن ہونے کے بہت سی باتوں میں سرسید سے اختلاف رکھتے تھے۔ جس کا ایک نتیجہ ندوۃ العلماء کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ندوہ شبلی کے تعلیمی نظریے کا عملی نتیجہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ موجودہ حالات میں ندوہ وہ ترقی نہ کر سکا جس کا وہ مستحق تھا۔ لیکن مخالفت کے طوفان میں اسکا قائم رہ جانا ہی کیا کم معجزہ ہے۔ یہ شبلی کی وہ نمایاں حیثیت ہے جو ابتدا ہی سے اُن میں موجود تھی۔ مسلمانوں کی تعلیم سے اُن کی دلچسپی کا ثبوت اس سے بڑھکر کیا ہوگا کہ اردو میں انکی پہلی تصنیف مسلمانوں کی تعلیمی ترقی ہی سے متعلق ہے۔

www.urduchannel.in

ادب اور انشاء کے اس انقلابی دور میں ہر صنف ادب میں شبلی ایک نئے رنگ میں نظر آتے ہیں۔

اورنگ زیب قاسمی

مورّخ اور سوانح نگار شبلی سے آپ متعرف ہو چکے۔ اب ناقد شبلی کو دیکھئے جو شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر جیسی جاندار کتابوں کا مصنف ہے۔ اگرچہ شعر العجم پر نہایت مدلل اور طویل تنقید لکھی جا چکی ہے اور موازنہ کا بھی جواب دیا جا چکا ہے لیکن یہ تنقیدیں اور جوابات خود ان کتابوں کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ اُردو میں تنقید نگاری کے ہلکے اثرات پرانے تذکروں میں ملتے ہیں۔ لیکن شعر و شاعری کے اصول سے بحث حالی سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ مگر حالی کا ماخذ زیادہ تر انگریزی ناقدین کے وہ نامکمل اقوال اور آرا ہیں جو انھیں بالواسطہ دوسروں سے ملے تھے۔ اسی لئے انھوں نے قدیم اُردو شاعری کو ہر جگہ مغربی شاعری کے معیار پر جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ حالی کی یہ وہ اُصولی لغزش تھی جو اب ایک اصول سمجھ لی گئی ہے۔ اور جس کا جواز حالی کے "مقدمۂ شعر و شاعری" سے ملتا ہے۔ جس نے تعلیم یافتہ طبقہ میں اُردو شاعری سے بدظنی پھیلادی۔ حالانکہ بقول سید مسعود حسن :۔

"یہ مقدمہ (مقدمۂ شعر و شاعری) اُردو شاعری پر ایک عالمانہ اور ناقدانہ تبصرہ ہے اسکی تصنیف کا خاص مقصد یہ ہے کہ اُردو شاعری کے نقائص دکھائے جائیں۔ اور انکی اصلاح کی تدبیریں بتائی جائیں۔ فاضل مصنف (حالی) نے اپنے مقصود کو پیش نظر رکھ کر اُردو شاعری کے اسی حصہ کو نمایاں کیا جو انکی رائے میں اصلاح کا مستحق تھا۔ اور اُس حصہ سے عمداً چشم پوشی کی ہے جو انکے نزدیک بھی اصلاح سے مستغنی اور تعریف کا مستحق تھا۔ لیکن وہ انکے موضوع بحث سے خارج تھا۔ لیکن اس کتاب نے جہاں اُردو شاعروں کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جسنے پرانے فرسودہ راستوں کو چھوڑ کر شاعری کی نئی نئی راہیں نکالیں۔ وہاں یہ غلط فہمی بھی پھیلا دی کہ ہمارے قدیم شاعروں کے دیوان جھوٹ کے پوٹ اور تصنع کے دفتر ہیں۔ سچی شاعری اور فطرت کی مصوری سے انکو کچھ لگاؤ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ اساتذۂ سخن کی سحر کاریوں اور معجز نگاریوں کو ہذیان اور خرافات سمجھنے لگے ...."[1]

لیکن قدیم اردو شاعری اپنے اصول اور ضوابط میں فارسی سے بہت قریب تھی اور اس سے انکار کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہماری پرانی شاعری کا تمام دفتر خواہ ہم آج اسے خرافات ہی کیوں نہ سمجھیں فارسی کے اثرات ہی کا مرہونِ منت ہے۔ اسمیں کیسے کلام ہو سکتا ہے کہ فارسی میں شبلی کا مذاق اعلیٰ درجہ کا تھا۔ اس کا اندازہ انکی

---

[1] دیکھو دیباچہ ہماری شاعری : ص ۔

www.urduchannel.in

فارسی شاعری اور شعر العجم کے لفظ لفظ سے ہوسکتا ہے۔ شاعری کی ماہیت نفسی کی بحثیں شعر العجم کی مختلف جلدوں میں

اورنگ زیب قاسمی

ملتی ہیں۔ وہ اگر حالی کے مقدمہ سے زیادہ اہم نہیں تو برابر کے درجہ کی ضرور مستحق ہیں۔ اسی طرح اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شبلی سے پہلے انیس انیس نہ تھے۔ ان کا حال اس انمول ہیرے کا سا تھا جو گرد میں اٹا پڑا ہو۔ اور کسی ایسے صاحب نظر جوہری کا منتظر ہو جو اُسے مجلا کر کے بازار میں لے آئے۔ اقبال کو چھوڑ کر آج انیس کو اردو کا سب سے بڑا شاعر کہنے میں زیادہ مبالغہ نہیں۔ اور اسمیں بھی شبہ نہیں کہ یہ ناقد شبلی کے قلم کا منت کش ہے۔

غزالی کا عہد اور شبلی کا زمانہ

شبلی کا زمانہ عقل پرستی کی حیثیت سے غزالی کے زمانے سے ملتا ہوا ہے۔ عباسی عہد میں جب یونانیوں کا فلسفہ عربی تراجم کے ذریعہ عام ہوا اور دینی عقائد میں شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے تو اسکی ضرورت ہوئی کہ فلسفہ کے اعتراضات کا رد فلسفیانہ دلائل ہی سے دیا جائے۔ اس سے علم کلام کی بنیاد پڑی۔ شبلی کے دور میں بھی جب یونانی فلسفہ کے بجائے سائنس اور جدید علوم وفنون نے جو عقلیات پر مبنی تھے مذہب پر حملہ کیا تو مدافعت کے لئے جدید علم کلام کی ضرورت پیش آئی۔ اسکے لئے ایسے شخص کی ضرورت تھی جو دینی علوم میں مہارت کے ساتھ اسلام کی محبت، نظر میں وسعت اور تحقیق کا ذوق بھی رکھتا ہو اور جدید علوم سے بھی آشنا ہو۔ یہ اوصاف صرف شبلی میں تھے۔ الکلام اور علم الکلام تو خالص علمی وفنی کتابیں ہیں۔ تاریخ کے بعد ان میں دشمنان اسلام نے جو حربے مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے تھے۔ انہی حربوں سے ان کا جواب دیا۔ اس لحاظ سے انکے مقالات اس جدید علم کلام کا عمدہ نمونہ ہیں۔

ایک نئے اسلوب تحریر کی ضرورت

سنجیدہ علمی وتحقیقی مضامین کے لئے ایک مخصوص طرز انشاء کی ضرورت تھی۔ اسکی متحمل اس دور کی عربی نما اور مقفیٰ اردو نہیں ہوسکتی تھی۔ اگرچہ غالب نے اپنے خطوط میں اور سرسید نے اپنے مضامین میں اسی زبان کے نمونے پیش کردئے تھے۔ لیکن ابھی اس (Style) طرز کو پختہ کرنے کی ضرورت تھی۔ آزاد کی پرواز تخیل اور رنگینی بیان واقعہ نگاری کے لئے ناموزوں تھی۔ نذیر احمد کی محاورہ بندی نے ان کی طرز انشاء کو صرف زبانی چٹخارے تک محدود کردیا تھا۔ حالی میں سادگی اور سلاست تو تھی لیکن عبارت جذبے روح ہوکر رہ گئی۔ اسلئے اُردو میں جاندار اور پختہ اسلوب نگارش بھی شبلی کی منت کش ہے۔ بظاہر گمان ہوتا ہے کہ شبلی جیسا سنجیدہ علمی مذاق کا شخص جسنے ساری عمر علمی تحقیق اور جستجو میں صرف کی ہو شعروشاعری سے فطری لگاؤ نہ رکھتا ہوگا۔ نہ اُسکے مشاغل اسے اسکی مہلت دیتے ہونگے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ شبلی کی شاعری اور خصوصًا فارسی شاعری میں قند شیراز کا مزہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شبلی شعریت میں ڈوبے ہوئے

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی.

ہیں اور دوسروں کو بھی بہائے لئے جاتے ہیں۔ انکی عاشقانہ فارسی شاعری نہایت نازک اور لطیف ہے۔ اُردو میں بھی قومی اور ملّی شاعری کے بلندپایہ نمونے ہیں۔ تاریخ اسلام کے ایسے واقعات کو جو بظاہر معمولی ہونے کے باوجود انتہا درجہ کے سبق آموز ہوں سب سے پہلے شبلی نے شاعری کا موضوع بنایا۔ اسکی تفصیل اُن کی شاعری کے سلسلے میں آگے آتی ہے۔ غرض شبلی کی اتنی گوناگوں حیثیتیں ہیں کہ وہ "بونوں میں دیو" معلوم ہوتے ہیں۔ اس مقالہ میں انہی کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

داستانِ حیات

شبلی نعمانی

پیدائش — مئی سنہ ۱۸۵۷ء

وفات — نومبر سنہ ۱۹۱۴ء

حسب نسب اور تاریخ ولادت

مولانا شبلی ذیقعدہ سنہ ۱۲۷۲ھ مطابق مئی سنہ ۱۸۵۷ عیسوی میں بمقام بندول[1] ضلع اعظم گڈھ پیدا ہوئے۔ شجرۂ نسب یہ ہے :—

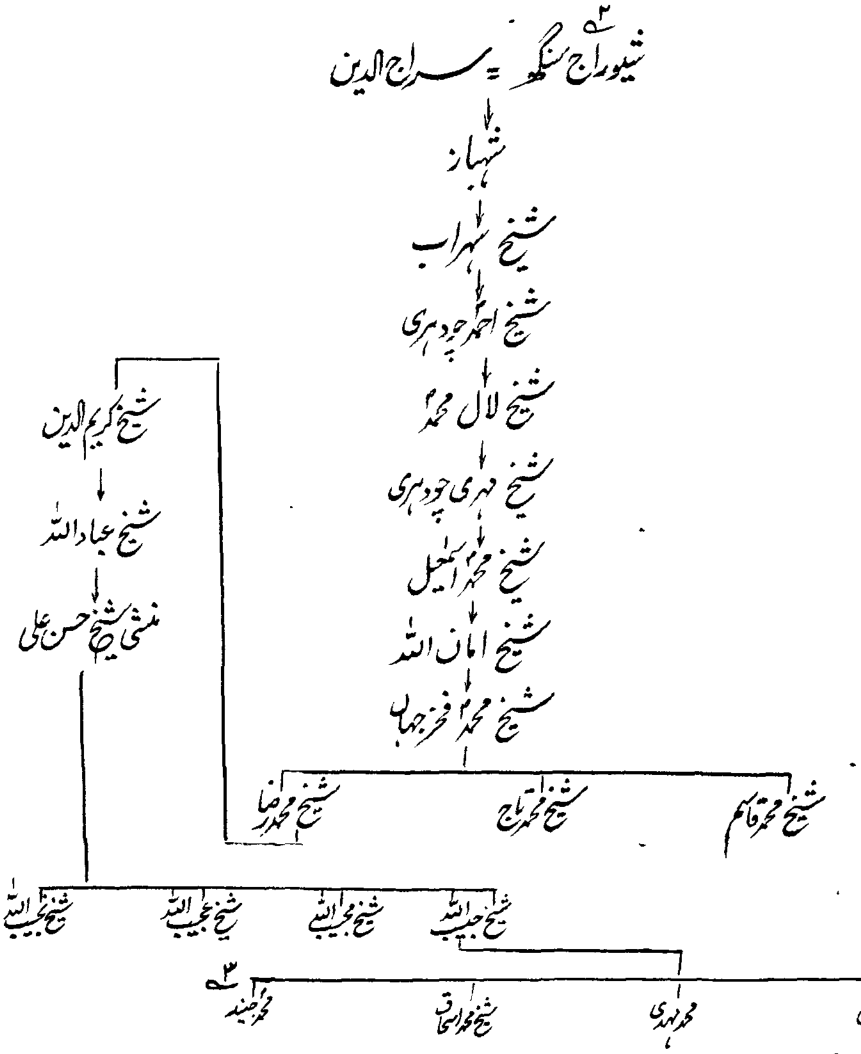

---

[1] پرگنہ سکرگاہی کا ایک قصبہ [2] شیوراج سنگھ مسلمان ہوگئے ان کا اسلامی نام سراج الدین ہوا۔ [3] حیات شبلی : ص ۵۹

www.urduchannel.in

مولانا کا خاندانی سلسلہ نومسلم راجپوت ہے جو راؤت کے نام سے مشہور ہیں۔ راجپوتوں میں دستور تھا کہ وہ شادی بیاہ اپنے ہی خاندان میں کرتے تھے مگر مولانا کے آباء و اجداد نے دوسرے مسلمان شرفاء کے خاندان میں بھی شادیاں کیں۔ مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب کی شادی حاجی شیخ قنبر انصاری کی لڑکی سے ہوئی جو انصاری شیوخ میں سے تھے۔ مولانا کے جدِ اعلےٰ شیخ کریم الدین صاحب محکمۂ بندوبست میں ملازم تھے۔ آمدنی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایک علاقہ جس میں دس بارہ گاؤں تھے اور جو "بڑھا حسام الدین پور" کے نام سے تھا خریدا تھا۔ یہ علاقہ اب تک اسی خاندان کی ملکیت ہے۔ مولانا کے دادا منشی حسین علی مرحوم عدالت کلکٹری اعظم گڈھ میں مختار تھے۔ نانا شیخ قنبر اور والد شیخ حبیب اللہ صاحب اعظم گڑھ کے مشہور اور چوٹی کے وکیلوں میں شمار ہوتے تھے۔

اورنگ زیب قاسمی

تعلیم و تربیت

مولانا نے مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی کیونکہ انکے والد اور والدہ دونوں بڑے مذہبی، دیندار صوم و صلوٰۃ کے پابند اور تہجد گزار تھے۔ اور اس کا ہر نقش قبول کیا۔ شروع شروع میں مولانا اپنا نام محمد شبلی لکھتے تھے لیکن بعد کو صرف شبلی کر دیا اور نام کے ساتھ نعمانی لکھنے لگے۔ مصنفِ حیاتِ شبلی کا بیان ہے:۔

> "نعمانی کی اس نسبت سے بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ وہ (شبلی) امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کی اولاد سے ہیں۔ یا وہ اپنے کو انکے خاندان کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ دونوں خیال غلط ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا ابتداء میں نہایت سخت حنفی تھے اور حنفی کہلانا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اور چونکہ طبیعت جدت پسند تھی اسلئے حنفی کے بجائے اپنے کو نعمانی کہا۔ بلکہ یہ نسبت انھوں نے خود اختیار نہیں کی۔ انکے استاد مولانا فاروق صاحب چڑیا کوٹی نے انکا لقب نعمانی رکھا تھا۔ مولانا فاروق مرحوم بھی سخت غالی حنفی تھے۔ اور ان دنوں مولانا عبداللہ صاحب مئی ثم غازیپوری کے سبب سے جو اس ضلع کے رہنے والے تھے مقلد اور غیر مقلد کی صدائیں ان اطراف میں بلند تھیں۔ اور اہل احناف و اہل حدیث میں معرکے برپا تھے۔ اور طرفین میں مناظرے اور رسالہ بازی جاری تھی۔ اس ماحول میں مولانا فاروق نے اپنے شاگرد کو نعمانی کہہ کر پکارا اور جو بعد کو شاگرد کے نام کا جزو بنگیا۔"[1]

غرض حنفیت کے جوش میں مولانا "محمد شبلی" سے "شبلی نعمانی" ہوئے۔ اس جوش نے مولانا کے قلم سے "اسکات المعتدی"

---

[1] حیاتِ شبلی : ص ۶۷–۶۸

www.urduchannel.in

لکھوایا۔ مذہبی تعصبات کی یہ آندھی علی گڑھ پہونچ کر اُتر گئی :۔

اورنگ زیب قاسمی

"This was perhaps the lowest ebb of his religious sectarianism from which he (Shibli) gradually lifted himself till he was swept away by the rushing tides of Naturalism or Rationalism which gave a different colour to his views & conceptions"[5] / ۱۵

تعلیم و تربیت

مولانا کے والدین چونکہ نئے اثرات سے محفوظ تھے اسلئے انھوں نے اپنی پہلی اولاد (علامہ شبلی) کو علم دین کیلئے وقف کیا۔ چنانچہ مولانا نے قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گاؤں ہی رہ کر حکیم عبداللہ اور مولوی شکراللہ سے حاصل کی۔ پھر اعظم گڑھ کے مدرسہ عربیہ میں مولوی فیض اللہ سے عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ کچھ دِنوں مولوی عباس صاحب سے جو بڑے منطقی اور مناظرہ پسند تھے تعلیم پائی۔ اسکے بعد غازی پور کے مدرسہ چشمۂ رحمت میں کچھ دن گزارے۔ مگر حقیقی تعلیم اُس وقت سے شروع ہوئی جب مولوی فاروق صاحب چریا کوٹی جو فلسفہ، منطق، ہندسہ اور فارسی ادب کے ماہر تھے غازی پور سے اعظم گڈھ آئے۔ اور شیخ صاحب (مولانا کے والد) کے قائم کردہ مدرسۂ عربیہ میں مدرس اوّل مقرر ہوئے۔ اور مولانا نے انکے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ اور معقولات کی جس حد تک تعلیم پائی تمام ہندوستان میں اس سے زیادہ ممکن نہ تھی۔ مولانا کی تعلیم میں منطق کی عملی مشق کی جو کوشش مولانا فاروق صاحب نے فرمائی اس کا اثر یہ تھا کہ وہ نہ صرف تحریر و تقریر بلکہ ہر مدعیانہ گفتگو میں منطقی ترتیب استدلال اور اصول مناظرہ کو پیش نظر رکھتے تھے۔ مولانا نے فلسفہ میں بھی جو مہارت تامہ حاصل کی وہ بھی مولوی فاروق صاحب ہی کا طفیل ہے۔ مولوی فاروق صاحب کہا کرتے تھے انا اسد وانت شبلی[۲] یعنی میں شیر ہوں اور تو شیر کا بچہ۔

استاد کو شاگرد سے کس درجہ محبت تھی اور مولانا کے تبحر علمی، دقیقہ رسی، موشگافی اور سخن فہمی کے وہ کہاں تک معترف تھے اس کا اندازہ انکے اسی نوٹ سے کیا جا سکتا ہے جو مولانا کے ایک خط کے ساتھ انھوں نے معارف $\frac{۱۹۲۳}{۱۳۴۲}$ میں چھپوایا۔ لکھتے ہیں :۔

اگرچہ تھا تو دور سرسید کے عہد کا کہ انگریزی تعلیم [illegible] انگلستان سکول بھیجی [illegible] خود شبلی کا بیان ہے کہ ان کے والد اور تمام خاندان کا حکم تھا کہ علمی مشاغل کو چھوڑ کر وکالت یا سرکاری نوکری کی طرف [illegible] علم دین کے لیے ~~[illegible]~~ نے وقف کیا تھا؟ [illegible] شبلی کے دل کی [illegible] تو خود [illegible] نے وکالت [illegible] کروایا [illegible] روپئے کی ملازمت اور چالیس روپئے [illegible] (دیکھئے [illegible] صفحہ [illegible])

---

5. Muhammad Abdullah, Urdu Prose under the influence of Sir Syed

۲۔ حیات شبلی ص ۔۔۔

www.urduchannel.in

"....... یہ خط اس لحاظ سے نہایت دلچسپ و بیش قیمت ہے کہ اسکے اندر اُردو کے اس زندۂ جاوید اور سرمایۂ ناز مصنف کے سوانحی حالات اور علمی خدمات کا مختصر ذکر خود اسکے موشگاف و حقیقت نگار قلم سے کیا گیا ہے۔ جس سے زیادہ مستند اور قابل وثوق ذریعہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یوں بھی شبلی کے نام سے شرف انتساب رکھنے والی کوئی چیز قدر شناسان اُردو ادب کیلئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔" [1]

اورنگ زیب قاسمی

لیلائے علم

مولانا کو تحصیل علم کی دھن تھی۔ اور یہ اسی دھن کا نتیجہ تھا کہ کہیں ایک جگہ پر انکے قدم نہ جمے اور وہ لیلئ علم کی جستجو میں دردر کی خاک چھانتے پھرے۔ اعظم گڈھ سے نکل کر مولانا عبدالحق خیرآبادی کی درسگاہ میں رامپور پہنچے۔ مگر یہ دیکھکر کہ انکی تشنہ لبی کو یہاں بھی سیرابی نہیں ہو سکتی یہاں سے چل کھڑے ہوئے اور مولوی ارشاد حسین صاحب کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ اور فقہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ پھر عازم لاہور ہوئے اور مولانا فیض الحسن صاحب سے جو اس زمانہ کے اصمعی اور ابوتمام سمجھے جاتے تھے درس لیا۔ اسکے بعد سہارنپور آئے اور مولانا احمد علی محدث سے کسب فیض کیا۔ یہ آستانہ مولانا کا آخری درسگاہ تھا۔ [2]

۴ بہ رجا

اب خود مولانا کی زبان قلم سے اُن کی طالب علمی کی داستان سنیئے۔

"........ علمی شوق والد اور گھر کی تربیت کا اثر تھا۔ خاندان میں علم کا چرچہ تھا اور تمام بزرگ معروف علم تھے۔ اس زمانے کی طالب علمی بہت مشکل تھی۔ یکہ پر سفر کرتے۔ پیدل بھی چلنا پڑتا۔ یہ سب میں نے خوشی سے گوارا کیا۔ دو دفعہ والد کی اجازت کے بغیر چپکے سے نکل گیا۔ یہ خاص التزام رہا (اور اسمیں بھی منفرد تھا) کہ فن مثلاً ادب، منطق، حدیث، اصول فقہ کیلئے انہی علماء کے پاس دور دراز کا سفر کر کے گیا جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے۔ مثلاً حدیث کیلئے مولانا احمد علی سہارنپوری۔ ادب کیلئے مولانا فیض الحسن لاہور میں۔ والد اور تمام خاندان کی مرضی بلکہ حکم تھا کہ علمی مشاغل کو چھوڑ کر وکالت اور ملازمت کروں۔ چنانچہ مجبور ہو کر امتحان دیا اور کامیاب ہوا۔ چند روز وکالت کی لیکن وکالت اور ملازمت سب چھوڑ دی۔ اور علمی اشغال میں مصروف ہوا۔ اور اسلئے معمولی معاوضہ پر علی گڑھ کی پروفیسری کی۔ چالیس روپیہ ماہوار پر۔

مقابلہ کرو ص ۲۴ سے

متعدد بار حیدرآباد اور دیگر ریاستوں میں بیش قرار تنخواہوں پر بلایا گیا لیکن علمی مشغلہ کو

---

[1] معارف : نومبر ۱۹۲۳ء : ص ۳۹۳

[2] بحوالہ حیات شبلی

www.urduchannel.in

چھوڑ کر نہ گیا۔ حیدر آباد سے جو معمولی وظیفہ مقرر ہے اس پر قناعت کی۔ ریاستوں نے صلے اور

اورنگ زیب قاسمی

نذرانے دینے چاہے لیکن ہمیشہ انکار کیا اور واپس کر دیا۔

رائے میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سر سید کے ساتھ سولہ برس رہا لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ اُنسے مخالف رہا۔ اور کانگرس کو پسند کرتا رہا۔ اور سر سید سے بارہا بحثیں رہیں۔ سفر ترکی اور مصر صرف علمی تحقیقات کیلئے کیا۔ اور تمام مصارف خود گوارا کئے۔ ریاست رامپور نے مصارف دینے چاہے۔ انکار کیا۔ بزرگوں نے قسطنطنیہ میں روپیے بھیجے واپس کر دئے۔

وطن یعنی اعظم گڈھ میں مسلمانوں کا کوئی اسکول نہ تھا۔ اور مسلمان انگریزی سے بالکل الگ تھے میںنے نیشنل ہائی اسکول قائم کیا۔ اور اُسکے اکثر مصارف خود ادا کئے۔

پھر ندوہ کی تحریک میں جزوِ غالب رہا۔ اور جب ندوہ بالکل مرگیا تو اسکو از سرِ نو زندہ کرکے ترقی دی۔ تصنیفات میں یہ خاص خیال رہا کہ مستقل شاخیں مکمل کر دوں۔ چنانچہ علم کلام، تاریخ، لٹریچر (موازنۂ انیس و دبیر) و (شعر العجم) تین شاخوں پر سیر تیار کر دی۔ فارسی شاعری میں زبان کو اہل زبان کے اصول پر برتا۔

ملازمت تو اکثر علمی ہی اختیار کی۔ لیکن وکالت اور سرکاری ملازمت کے زمانے میں بھی درس تدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔ اور یہ فطرت تھی۔ بچپن سے میری صحبت بدچلن لوگوں میں تھی اور وہ لوگ ہمیشہ ان مشاغل کی تحریک کرتے تھے لیکن کبھی ناچ رنگ بلکہ گانے میں بھی شریک نہ ہوا۔ جب راجہ کشن پرشاد وزیر ہوئے اور حسبِ دستور نذرانہ دینے گیا تو انکے ایڈی کانگ نے کہا کہ آپنے تو تہنیت کا قصیدہ لکھا ہوگا میںنے کہا یہ اوروں کا پیشہ ہے۔ میں یہ کام نہیں کرتا۔ اسپر رد و بدل ہوئی اور میںنے ناگواری کیساتھ جواب دیا کہ میں کسی کی مدح نہیں کرتا۔

قلمی اور نایاب کتابیں بہم پہنچائیں اور کثرت سے مطالعہ کیں۔ یہ سرسری باتیں لکھدیں۔ خود اپنا آلھا کیا روؤں۔"[1]

(شبلی ۲۳ ستمبر ۱۹۱۳ء)

مذکورہ بالا سطور لے کم و کاست اسلئے نقل کر دی گئی ہیں کہ مولانا کی سوانح حیات معلوم کرنیکا اس سے زیادہ مستند اور قابل وثوق ذریعہ اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

---

[1] معارف : نومبر ۱۹۲۳ء : ص ۳۹۲-۹۴

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

سفر حج $\frac{1876}{1293}$

درس وتدریس کا سلسلہ ختم ہی ہوا تھا کہ $\frac{1876}{1293}$ میں مولانا اپنے والد اور بعض اعزہ کے ساتھ حج کرنے گئے۔ علمی مشغلہ یہاں بھی جاری رہا۔ مدینہ منورہ کا کوئی کتب خانہ نہیں چھوڑا۔ فن حدیث کا جو ذخیرہ وہاں دیکھنے میں آیا پھر کبھی نہیں دیکھا۔

پہلا قومی کام

روس اور روم کی جنگ کے زمانے میں مولانا نے چندہ جمع کرنے کے لئے بڑی کوشش کی اور ترکی سفیر حسین آفندی کے ذریعہ یہ رقم قسطنطنیہ روانہ کی گئی۔ سفرنامے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

" حسین آفندی جو کسی زمانہ میں بمبئی میں ٹرکش کونسل تھے اور اب قسطنطنیہ میں ٹرکش کمشنر ہیں وہ مجھکو اس ذریعہ سے جانتے تھے کہ محاربہ روس میں میں نے بحیثیت سیکریٹری انجمن تین ہزار کی رقم انکے ذریعہ سے قسطنطنیہ روانہ کی تھی "۔ [1]

کتب بینی کا شوق

مولانا کا محبوب ترین مشغلہ کتب بینی تھا۔ وہ کتابوں سے کبھی نہ تھکتے تھے۔ چنانچہ سفر حجاز سے واپسی میں جتنے دنوں ان کا قیام اعظم گڈھ میں رہا وہ اپنا زیادہ وقت غور و فکر اور مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ :۔

" اعظم گڈھ میں رہتا تو ایک کتب فروش کی بازار میں دوکان تھی وہاں جاکر اُردو فارسی کے دیوان دیکھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی گھر لے آتا تھا "۔ [2]

انہماک کا یہ عالم تھا کہ پڑھتے وقت انھیں کسی چیز کی خبر نہ رہتی تھی۔ ہنگامہ ہو، جلسہ ہو، جلوس نکلتا ہو، شور و شغب ہو، کچھ بھی ہو انھیں پرواہ نہ ہوتی تھی، عسکری صاحب لکھتے ہیں :۔

"...... شاید چھٹی یا ساتویں تاریخ محرم کی تھی۔ وقت سات آٹھ بجے شام، چوک میں بڑا مجمع تھا، تعزیے مع جلوس اور باجوں وغیرہ کے نکل رہے تھے۔ شور و غل اور مجمع کی کوئی حد نہ تھی۔ سب لوگ اس سیر میں مشغول۔ مگر مولانا دوکان کی کوٹھری میں بند کسی کاتب کے مقابلہ میں جو کسی کاتب سے لکھائی گئی تھی اس قدر مشغول اور منہمک تھے کہ باوجود دوستوں کے سخت اصرار کے بھی سر اٹھا کر نہ دیکھا۔ اور اپنا کام کرتے رہے۔ یہانتک کہ پوری کتاب اس حالت میں تقریباً دس گیارہ بجے تک ختم کردی "۔ [3]

غرض $\frac{1882}{1300}$ء تک باوجود اسکے کہ انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی زبردستی وکالت، تحصیل کی تجارت

---

[1] [2] [3] تاریخ ادب اُردو مترجمہ عسکری : حاشیہ صفحہ ۶۵-۶۶ - حصہ نثر

www.urduchannel.in

اور زمینداری کا کام دیکھنا پڑا۔ مگر اس زندگی میں بھی انکے علمی، ادبی، قومی اور مذہبی مشاغل جاری رہے۔

اورنگ زیب قاسمی

وکالت کی تعلیم اوپر کہیں ذکر آچکا ہے کہ مولانا کے ماموں اور والد بزرگوار اعظم گڈھ کے چوٹی کے وکیلوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان بزرگوں نے چاہا کہ مولانا بھی اسی پیشہ کیطرف توجہ کریں۔ ظاہر ہے کہ اس پیشہ میں جو سہولتیں اور آسانیاں مولانا کو میسر آسکتی تھیں دوسروں کے لئے اُن کا امکان نہ تھا۔ مگر وہ اپنی افتادِ طبع کو کیا کرتے جو وکالت کے قطعی منافی تھی۔ مولانا کے اکثر خطوط اس پیشہ سے بیزاری کی شہادت دیتے ہیں۔ والد کے ڈر سے مولانا نے طوعًا و کرہًا وکالت کا امتحان دیا۔ اور ایک مرتبہ فیل ہونے کے بعد دوبارہ معلوم نہیں کیسے پاس ہوگئے۔ چنانچہ وکالت شروع کی (اس زمانے میں وکالت کے امتحان کیلئے انگریزی جاننا ضروری نہ تھا) مولانا کی وکالت کا ایک واقعہ جو بہت دلچسپ ہے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے :-

"علامہ کے والد کے پاس کوئی ٹھاکر موکل آیا اُسنے اپنی لڑکی کی شادی کمسنی میں کردی تھی۔ داماد جوان ہوکر خسر کو پسند نہ آیا۔ اُدھر رخصتی کا تقاضا ہوا۔ اِدھر سے انکار کیا گیا۔ شوہر نے مقدمہ دائر کر دیا۔ ٹھاکر نے جواب دہی کے لئے علامہ شبلی کے والد کو وکیل کیا۔ انھوں نے ان سے کہا کہ اسکی جوابدہی لکھدو۔ مولانا ٹھاکر سے قصہ سن کر بولے کہ جب تم اقرار کرتے ہو کہ لڑکی اس سے بیاہی جاچکی ہے تو اب کیا ہو سکتا ہے۔ جاؤ لڑکی کو رخصت کردو۔ وہ ہنستا وکیل صاحب کے پاس آیا۔ انھوں نے صاحبزادے سے فرمایا بس آپ وکیل بن چکے۔ آخر انھوں نے خود مقدمہ لڑا یا اور جیتا"[1]

شیخ صاحب نے پورے طور سے جب یہ محسوس کرلیا کہ صاحبزادے اس میدان کے مرد نہیں اور نہ کبھی ہوسکیں گے تو انھوں نے کوشش کرکے مولانا کو امین دیوانی کی جگہ دلوا دی۔ کچھ دنوں مولانا یہاں بھی سر کھپایا کئے۔ مگر آخر کار وہی ہوا جسکی توقع تھی، یعنی اس ملازمت سے بھی سبکدوش ہوگئے۔

نیل کا کام مولانا کے والد نیل سازی کا کام بڑے وسیع پیمانہ پر کرتے تھے۔ اور اپنی زمینداری میں انھوں نے اسکے بہت سے کارخانے کھول رکھے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان کی نگرانی مولانا کے سپرد کردی۔ جبرًا اس کام کو بھی تھوڑے دنوں تک انجام دیا۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں :-

حرفِ "دن" کا تی ہوتا۔

"چوں ازیں کشمکش فارغ نشستم دیگرے روئے نمود۔ یعنی کارم بہ گودام و متعلقات او وافتاد۔ دہر چند آں خیاں کارے سزائے ایں ہیچ کارہ نبود مگر مرا ازامتثال امر حضرت قبلہ گاہی چارہ نبود"[2]

کارہ ۲

---

[1] داستان تاریخ ادب اردو : ص ۶۶۲
[2] حیاتِ شبلی : ص ۱۱۶

www.urduchannel.in

"کے اقوال"۔

(یہ محل رائے کا نہیں ۔ واقعات کو مختلف مصنفوں نے مختلف طرح پر بیان کیا ہے ۔)

علی گڑھ کی پروفیسری

یہاں کی آمد و رفت اور ملازمت کے بارے میں مختلف مصنفین کی رائیں مختلف ہیں ۔

اورنگ زیب قاسمی

سکسینہ کا بیان ہے :۔

"...... ١٨٨٢ء / ١٣٠٠ھ میں مولانا اپنے چھوٹے بھائی مہدی سے ملنے گئے ۔ جو علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے ۔ علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا ۔ یہاں بتوسط خان بہادر عبدالکریم ڈپٹی کلکٹر مولوی سمیع اللہ خاں سے ملے ۔ جنکے ذریعہ سے سرسید مرحوم کی خدمت میں باریاب ہوئے ۔ اور ایک درخواست فارسی پروفیسری کیواسطے جو اسوقت خالی تھی گزرانی ۔ جو منظور ہو گئی ۔ اور کچھ دنوں شہر میں قیام کے بعد خوش نصیبی سے سید صاحب کے بنگلے کے قریب رہنے کو جگہ مل گئی" ۔ [1]

مصنف سیر المصنفین لکھتے ہیں :۔

" مولانا کے ایک نوجوان بھائی مہدی مرحوم علی گڑھ کالج میں تعلیم پاتے تھے ۔ ١٨٨٢ء / ١٣٠٠ھ میں اس قدرتی زنجیر نے مولانا کو کالج میں کھینچا اور وہ بھائی سے ملنے گئے ۔ وہاں بانی مدرسۃ العلوم سے ملاقات کی اور اس پیر میکدہ کو دل دے آئے ۔ پیر کہن سال نے جو ہر دانش ناصیہ شباب پر نمودار پایا ۔ پس سرسید مولانا سے بہت متاثر ہوئے اور مجبور کیا کہ مولانا مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں پروفیسری اختیار کرلیں ۔ مولانا کو بجز قبول اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا اور آپ فارسی و عربی کے پروفیسر بمشاہرہ چالیس روپیہ ماہوار مقرر ہو گئے" ۔ [2]

ڈاکٹر ایس ۔ ایم ۔ عبداللہ رقم طراز ہیں :۔

"...... he (Shibli) took his brother Mehdi to M.A.O. College Aligarh. for admission, where first of all he came into contact with the great man of his age. whose peniterating eyes captivated the young theologian's heart & whose taks bewitched him" [3]

---

[1] تاریخ ادب اردو مترجمہ عسکری : صـ ٦٦

[2] سیر المصنفین : جلد دوم : صـ ١٣

[3] Urdu prose under the influence of Sir Syed

www.urduchannel.in

داستان تاریخ اردو کے مؤلف فرماتے ہیں :-

اورنگ زیب قاسمی

"علامہ کے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں یہ بھی وہاں گئے۔ سرسیّد سے ملے۔ باہم مبادلۂ خیال ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہوگئے۔ اتفاق سے وہاں پروفیسری خالی تھی۔ علامہ شبلی نے اپنے استاد مولانا فیض الحسن کی سفارش سے درخواست دی۔ سرسید نے فوراً چالیس روپئے ماہوار پر اُن کو رکھ لیا۔" [1]

ان چاروں حضرات سے مولانا کی علی گڑھ آنے کے وجوہ اور سنہ لکھنے میں غلطیاں ہوگئی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے بھائی مہدی صاحب ۱۸۸۱ء/۱۲۹۹ھ تک علی گڑھ میں رہے اور اسی سال انٹرنس پاس کیا۔ اکتوبر ۱۸۸۱ء/۱۲۹۹ھ میں مولانا اپنے والد کیساتھ مہدی مرحوم سے ملنے علی گڑھ گئے اور سرسید کی مدح میں عربی میں ایک قصیدہ لکھکر ساتھ لیتے گئے۔ اس قصیدے سے سرسید بہت متاثر ہوئے اور علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۵ اکتوبر میں اُسے چھپوالیا۔ سال ڈیڑھ برس بعد جب کالج کے لئے مشرقی زبانوں کے ایک معلّم کی ضرورت ہوئی تو مولانا نے مولانا فیض الحسن صاحب سے تصدیق کراکے اپنی درخواست بھی بھیجی۔ اور علی گڑھ جاکر خان بہادر عبدالکریم

محمد کریم

ڈپٹی کلکٹر کے توسط سے سمیع اللہ خاں صاحب سے ملے۔ اور اُن کے ذریعہ سرسید کی خدمت میں باریاب ہوئے

کیسی

درخواست منظور ہوگئی اور مولانا کا تقرر اسسٹنٹ عربک پروفیسر کے عہدے پر جنوری ۱۸۸۳ء کی آخری تاریخ میں چالیس روپئے ماہوار پر ہوگیا۔ اور پہلی فروری سے کام کرنے لگے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد عربی کے پروفیسر ہوگئے۔ اور تنخواہ بجائے چالیس کے سو روپیے ماہوار ہوگئی۔ یکم فروری کو پانچ روپیہ ماہوار کرایہ پر ایک مکان شہر میں لے لیا اور محمد کریم صاحب کے یہاں سے اُس میں اُٹھ گئے۔ پھر جب سرسید سے میل جول بڑھا اور دونوں ایک دوسرے کی قابلیت سے متاثر ہوئے تو سرسید نے ایک بنگلہ میں جو انکے بنگلہ کے بالکل قریب تھا مولانا کو جگہ دی [2]

یہ لفظ زائد ہیں

علی گڑھ تحریک کے اثرات

مولانا علی گڑھ تحریک کے دو مفید اثرات سے بہت متاثر ہوئے۔ پہلا اثر ملت کی بربادی اور اسکی زبوں حالی کا احساس تھا جو انکی اردو شاعری میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ دوسرا انگریزی تعلیم کی ضرورت اور اسکی اہمیت ہے جو انکے مکاتیب میں پائی جاتی ہے۔ حالی نے مسدس میں مسلمانوں کی بربادی کا جو نقشہ پیش کیا تھا اس سے مسلمانوں میں اپنی زبوں حالی کا کافی احساس

---

[1] داستان تاریخ اردو : ص ۲۶۲ [2] بحوالہ حیات شبلی

www.urduchannel.in

پیدا ہو گیا تھا - اور درخشاں ماضی کی یاد انھیں آٹھ آٹھ آنسو رلا رہی تھی - حالی نے مرض تو تشخیص کر لیا تھا لیکن دوا نہ
اورنگ زیب قاسمی
بتا سکے تھے - مولانا نے اسے شدت سے محسوس کیا اور مداوای فکر میں لگ گئے - انکا پہلا نسخہ مثنوی صبح اُمید ہے جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان سنانے کے بعد سرسید کی تحریک کی کامیابی کی بشارت دی گئی تھی - مولانا نے محسوس کر لیا تھا کہ دولت اور حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیم کی عمارت بھی مغربی تحریک و تہذیب کے نہ رکنے والے سیلاب کی زد میں ہے - اگر فوراً اسکی اصلاح و تدبیر کا کام نہ شروع کر دیا گیا تو شان و شوکت، جاہ و حشمت، عزت و سلطنت کی طرح اس سے ہاتھ دھونا پڑے گا - پادری اور مشنری زور و شور کیساتھ مسیحیت کی تبلیغ میں مصروف تھے - حکومتِ وقت ان کا ساتھ دے رہی تھی - مشنری اسلام کی صورت مسخ کر رہے تھے اور اسپر جھوٹے اتہامات لگا لگا کر لوگوں کے دلوں کو اسکی جانب سے پھیرنے کی جدوجہد میں انتہائی سرگرمی دکھا رہے تھے - اسلام کو چھوڑ کر، بانی اسلام علیہ السلام پر بھی حملے شروع کر دئیے گئے تھے - ان حملوں کے تدارک کیلئے صرف یہی کافی نہ تھا کہ علماء خطبات و وعظ کے ذریعہ تعلیم یافتہ حضرات کے دلوں پر اسلام کا نقش بٹھاتے بلکہ ضرورت تھی اسکی کہ اہل مغرب نے اسلام اور بانی اسلام پر اپنی تصنیفوں میں جو جو تہمتیں لگائی تھیں اور آئے دن لگاتے رہتے تھے ان سے واقفیت حاصل کر کے انکے ماخذوں کا سراغ لگا کر انکی غلطیاں واضح کیجائیں - اور اسلام کی صحیح تعلیم، اُسکے نقطۂ نظر اور بانیٔ اسلام کی سیرت اور انکی زندگی کو اس طرح سے پیش کیا جائے جو جدید مذاق اور موجودہ زمانے کا لحاظ رکھتے ہوئے جبکہ فلسفے سے زیادہ سائنس اور نظریات سے زیادہ عملیات کا دور دورہ ہو، کافی ہو، اور جس سے دلوں میں اسلام کی عظمت بیٹھ جائے - اور یہ اسوقت تک ممکن نہ تھا جبتک کہ انگریزی تعلیم حاصل نہ کی جائے - اسی کے زیر اثر مولانا نے اپنے عزیزوں، دوستوں اور برادری کے لوگوں کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کیا ہے - اسکے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ اسلامی تاریخ، اسلامی لٹریچر اور مسلمانوں کے گزشتہ علمی و تمدنی کارناموں کو جدید رنگ میں پیش کیا جائے - اس کام کے لئے انھوں نے خود کمر ہمت باندھی اور تاریخ کی طرف متوجہ ہو گئے -

پیغمبر

جا گزیں (؟)

تاریخی ذوق

یہ ذوق مولانا میں اسوقت پیدا ہوا - جب انھوں نے سرسید کے کتب خانہ میں پہلی بار مصر، شام، قسطنطنیہ، اور یورپ کی چھپی ہوئی عربی تاریخ و جغرافیہ کی نادر کتابیں دیکھیں جن کتابوں سے مولانا سب سے زیادہ متاثر ہوئے ان میں سے ایک گبن کی تصنیف رومن امپائر (Roman Empire)

www.urduchannel.in

کا اردو ترجمہ تھا۔ جسکے متعلق مولوی محمد سمیع صاحب کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

میں جس حالت میں ہوں اچھا ہوں۔ سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھکو دی ہے اور اسوجہ سے مجھکو کتب بینی کا نہایت عمدہ موقع حاصل ہے۔ سید صاحب کے پاس تاریخ وجغرافیہ کی چند ایسی کتابیں ہیں جنکو حقیقت میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہونگے۔ مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں۔ مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئی ہونگی۔ گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپیہ کے صرف سے کرایا ہے میرے مطالعہ میں ہے اور کیا لکھوں"۔[1]

اور دوسری مسٹر پامر کی " حیات ہارون الرشید" ہے جس کا ترجمہ مولانا کے پیش نظر تھا۔[2]

تصنیفی ذوق

مولانا کا تصنیفی ذوق بھی علی گڑھ ہی کی پیداوار ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

" تصانیف کا شوق ابتداءً مجھکو ان تاریخی تصانیف کے دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی ہیں اور ایک موقع پر مجھکو بہت سی یکجا مل گئیں جنکو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا"۔[3]

" یہ کتابیں سرسید کا کتب خانہ تھا"۔[4] اس سے صاف ظاہر ہے کہ علی گڑھ آنے کے بعد مولانا میں تصنیف وتالیف کا ذوق پیدا ہوا۔ رہ گیا انکا رسالہ " اسکات المعتدی" جو علی گڑھ آنے کے پہلے لکھا جا چکا تھا اسکے متعلق خود مولانا فرماتے ہیں :۔

" میری سب سے پہلی تصنیف عربی زبان میں ایک چھوٹا رسالہ " اسکات المعتدی" نام ہے لیکن وہ چونکہ عربی زبان میں تھا اور ایک جزئی مسئلہ پر اسلئے وہ چنداں شائع نہیں ہوا۔ اسکے بعد سب سے پہلی تصنیف " مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" ہے وہ بہت پھیلی اور بار بار چھپی"۔[5]

مولانا نے اس رسالہ کو اپنی اولین تصنیف شمار نہیں کیا ہے۔ اسکی دو وجہیں ہیں۔ پہلی یہ کہ یہ تصنیف اردو میں نہیں بلکہ عربی میں ہے اور دوسری یہ کہ وہ ایک جزئی مسئلہ پر لکھا گیا تھا۔

یورپ کی علمی تحقیقات سے واقفیت

علی گڑھ ہی پہلا مقام تھا جہاں مشرق ومغرب کے اساتذہ یکجا تھے۔ اور ایک دوسرے کے خیالات ومعلومات سے متاثر ہو رہے تھے۔ اسی (علیگڑھ) کی مرکزیت کیوجہ سے یورپ میں اسلام اور تاریخ اسلام پر جو نئی کتابیں لکھی جاتی تھیں وہ سب سے پہلے یہاں آ جاتی

[1] مکاتیب شبلی : حصہ اول : طبع دوم (مطبع معارف) : صہ ۵۶
[2] حیات شبلی : صہ ۳۶-۳۷ ۱۳۷-۳۸
[3] مکاتیب : جلد دوم
[4] حیات شبلی : صہ ۱۳۷
[5] مکاتیب : جلد دوم : صہ ۲۳۵

www.urduchannel.in

تھیں۔ یورپ کی علمی تحقیقات سے آگاہی کا دوسرا ذریعہ سید علی بلگرامی کا کتب خانہ تھا[۱]۔ سید علی بلگرامی کو انگریزی کے علاوہ فرنچ اور جرمن زبانوں سے بھی واقفیت تھی۔ اسلئے انکے کتب خانے میں ان زبانوں کی مطبوعات کا سرمایہ بھی موجود تھا۔ تیسرا اور سب سے بڑا ذریعہ مولانا کی پروفیسر آرنلڈ سے ملاقات تھی جو انگریزی زبان کے نہ صرف بڑے عالم بلکہ علم دوست بھی تھے۔ پروفیسر آرنلڈ اور شبلی کی ملاقات کے تفصیلی واقعات مولانا شروانی کی زبان قلم سے سنئے :۔

اورنگ زیب قاسمی

"بڑی خوش قسمتی علامہ شبلی کی یہ تھی کہ اس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا علم دوست استاد کالج میں تھا۔ یہ دونوں دلدادگان علم باہم ملے اور اسطرح ملے کہ جسطرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم ملکر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے مولانا شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا۔ یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں۔ قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں۔ علامہ شبلی کی صداقت اور قوت دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے۔ بلکہ اپنے اطمینان سے غور کیا۔ جو اصول عمدہ تھے انکو اخذ کیا نہ صرف اخذ کیا بلکہ انکو اپنی زندگانی کا رہبر بنایا۔ نمائشی چیزوں کو رد کر دیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے عربی کا استفادہ علامہ شبلی سے کیا اور یہ دیکھا کہ پرانی زمینوں میں بھی جواہر آبدار موجود ہیں اگرچہ گرد آلود ہوکر نگاہوں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں۔ اسی واقفیت کا نتیجہ پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر تصنیف پریچنگ آف اسلام (Preaching of Islam) کی صورت میں عیاں ہوا۔ علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ بھی سیکھی تھی۔ علامہ ممدوح کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک بڑے تعلیمی مسئلے کا حل کرنے والا ہے"[۲]۔

اس میل جول سے ایک دوسرے پر ایک دوسرے کے خیالات و معلومات کا اثر پڑتا رہا۔ اسطرح دونوں ایک دوسرے سے قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔ شبلی کو پروفیسر آرنلڈ سے جو محبت و عقیدت تھی اسکا اظہار اکثر شبلی کے قلم سے ہوا ہے۔ آرنلڈ جب علی گڑھ چھوڑ کر گورنمنٹ کالج لاہور جانے والے ہوئے تو ایک وداعی جلسہ ہوا جس میں شبلی نے اپنی تقریر کے درمیان میں کہا۔

"...... آرنلڈ اس خوش اخلاقی اور پسندیدہ خیالی کی ایک زندہ تصویر ہے"[۳]۔

مولانا نے اس موقع پر پڑھنے کے لئے ایک نظم بھی لکھنا چاہی تھی مگر وہ اسے مکمل نہ کرسکے صرف اسکے دو اشعار پڑھے گئے :۔

شعر بہ ترمیم

---

[۱] بحوالہ حیات شبلی

[۲] مضمون شروانی صاحب : بحوالہ حیات شبلی — حیات شبلی ۱۳۹ بحوالہ مولانا مقصود شروانی صاحب

[۳] حاشیہ حیات شبلی : ص ۱۴۱

www.urduchannel.in

آرزو لڑاں کہ دریں شہر و دیار آمد و رفت

دلبرے بود کہ مارا بہ کنار آمد و رفت

آمد آں گونہ بہ کالج کہ بہ گلزار نسیم

رفت زانساں کہ تو گوئی کہ بہار آمد و رفت

کالج پر مولانا کے اثرات

اگر ایک طرف کالج کے ماحول نے مولانا پر اپنا رنگ چڑھانا چاہا تو دوسری طرف خود ماحول بھی مولانا کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہر صورت میں اپنی شخصیت کو برقرار رکھا اور اس "لعطر رنگ و بو" میں بھی اپنے ہوش و حواس قائم رکھ سکے۔ رندوں کا کیا ذکر ہے اس میکدے (علی گڑھ) میں پہونچ کر عابد و زاہد، واعظ و ناصح بھی اپنے کو بھلا بیٹھے مگر جو پی کر بھی اپنے کو نہ بھولا وہ شبلی نعمانی تھا۔ بزم میں وہ شاعر بن کر دلوں میں سمایا۔ رزم میں وہ اپنی پرزور تحریروں اور تقریروں سے آگ لگا دی۔ جدید علوم و فنون کے اہل کمال سے وہ کبھی مرعوب نہ ہوا۔ بلکہ علوم و فنون کے دفینوں کو منظر عام پر لاکر یہ ثابت کر دیا کہ اس میں بھی ایسے ایسے جواہر ریزے موجود ہیں جو دنیا کی نگاہوں کو اپنی آب و تاب سے اب بھی خیرہ کر دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ مغربی علوم و فنون کی تند و تیز آندھی میں بھی مولانا نے اپنے قدیم علوم و فنون (فارسی و عربی) کے "دیئے" کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اپنی تلاش و جستجو، تحقیق و تدقیق کے روغن سے اسکی لو کو بڑھاتے رہے۔ یہاں تک کہ چراغ خانہ کو "شمع انجمن" کے دوش بدوش کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا۔ یہاں کے طالب علموں میں عربی اور فارسی کا صحیح ذوق پیدا کرنا، کلام اک کا درس دینا، مجلس میلاد منعقد کرنا یہ سب اسی ایک ہستی کے قدم کا طفیل ہے۔ انکے اثر سے علی گڑھ کی آزاد فضا میں جو مذہبی تبدیلی ہوئی اسکو خود ایک خط میں فخریہ لکھتے ہیں:-

> اسوقت مجھسے نہ میری طبیعت کا حال پوچھئے اور نہ کوئی اور واقعہ۔ آپ نئے اور میں دل سے اٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں۔ یوں تو مدرسۃ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں۔ مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا۔ لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے جسکو "لجنۃ الصلوٰۃ" کہتے ہیں۔ ایک بی اے سیکریٹری ہے اور بہت سے تعلیم یافتہ اسکے ممبر۔ چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خواں لوگوں کو اس پر اثر فقرے سے جونکا دیتا ہے۔ "الصلوٰۃ خیر من النوم"۔ پانچوں وقت کی نماز میں

www.urduchannel.in

باجماعت ہوتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ محض اپنی خواہش سے بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں۔

اورنگ زیب قاسمی

مغرب کی نماز، سبحان اللہ کیا شان و شوکت سے ہوتی ہے کہ بس دل بیٹھا پڑتا ہے۔ خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں۔ اور چونکہ وہ عامل بالحدیث ہیں آمین زور سے کہتے ہیں انکی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے۔ میں کبھی کبھی اسلام پر لیکچر دیتا ہوں۔ مسجد قبے کی تیاری ہے۔ سید محمود صاحب کی سرگرمی نے اسکے پیمانۂ تعمیر کو نہایت وسیع کر دیا ہے۔ وہ مہتمم خاص ہیں اور تین ہزار چندہ وہ خود دیں گے۔ میں نے بھی پچاس روپئے دئے ہیں۔ سید محمود صاحب خود ہاتھ میں پھاوڑا لیں گے اور مسجد کی نیو کھودینگے۔ لاگت کا تخمینہ ساٹھ، ستر ہزار روپیہ ہے۔

مجکو اس بات کا فخر ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے۔ اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری بھی قسمت میں تھا۔ اس جوش مسرت میں اور بھی لکھتا مگر مجکو میرے بھائی خصوصاً میاں اسحاق و عثمان یاد آگئے اور میرا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا جیسے طاؤس کا اپنے پاؤں دیکھنے سے۔ ان عزیزوں نے ترقی و لیاقت کا ثمرہ فخر صرف لامذہبی کو سمجھا ہے حالانکہ لیاقت بھی کچھ دنیا سے نرالی نہیں۔"[1]

یہاں کے طلبا میں شاعری اور انشاء پردازی کا ذوق پیدا کرنے میں بھی بہت کچھ مولانا کا ہاتھ ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب محوی "نذرِ عقیدت" (جو انکے فارسی نظم کا مجموعہ ہے) کے مقدمے میں لکھتے ہیں:۔

"...... علی گڑھ کالج کے بی۔ اے کلاس کے فارسی نصاب میں قاآنی کے چند قصائد داخل تھے۔ مولانا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے۔ مولانا مرحوم ان نادر الوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دیتے بلکہ اس مضمون کیساتھ حقیقی دلچسپی پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے ہیں مولانا مرحوم مغفور کی دلچسپ صحبت اور شاگردی کا یہ اثر ہوا کہ ہم میں سے بعض طلباء فارسی میں ٹوٹی پھوٹی نظمیں کہنے لگے۔ اور سب نے قاآنی کا طرز اختیار کیا۔"[2]

مولانا نے اپنی شاعری سے نہ صرف کالج کی ناموری کو بہت فائدہ پہنچایا بلکہ لوگوں کو ملت کے درد سے آشنا کر کے کالج کی ہمدردی اور اعانت کی طرف کچھ اور متوجہ کر دیا۔[3] اور ہمیشہ کالج کے فائدے کو اپنے

---

[1] مکاتیب شبلی : حصہ اول : طبع دوم : ص ۲۶،۲۷

[2] ~~بحوالہ~~ حیات شبلی : ص ۱۵۲

[3] " : ص ۱۵۲

www.urduchannel.in

فائدے پر ترجیح دی ۔ یہانتک کہ اپنی تصنیفوں سے (جبتک کہ وہ یہاں رہے) فائدہ اٹھانے کا خیال بھی وہ کبھی اپنے

اورنگ زیب قاسمی

دل میں نہ لائے ۔ جس کی تصدیق سرسید کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے اور مولانا کے مکاتیب سے بھی ۔ سید صاحب نواب عماد الملک کو لکھتے ہیں :۔

" پچاس نسخے "المامون" کے بینے خدمت عالی میں روانہ کئے ہیں ۔ "گزشتہ تعلیم مسلمانان" کے نسخے صرف معدودے چند رہ گئے ہیں اسلئے وہ نہیں بھیج سکا ۔ آپنے جو کتابوں کو خرید فرمایا غالباً آپکو خیال ہوگا کہ ایک اعانت مولوی شبلی کی ہے مگر مولوی شبلی نے یہ کتابیں مع حق تصنیف وغیرہ کالج کی نذر کردی ہیں ۔ انکی قیمت یا منافع سے ایک حبہ کا فائدہ انھوں نے حاصل نہیں کیا ۔ آئندہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں صرف کالج کے فائدے کے لئے لکھتے ہیں ۔ اپنا ذاتی فائدہ اُن کو مقصود نہیں ۔ ایسے جاہل آدمی ہیں کہ انھوں نے چند نسخے "المامون" کے بلاقیمت اپنے دوستوں کو بھیجنا چاہا ہے ۔ میں نے ہر چند اصرار کیا کہ جس قدر تمہارا دل چاہے لیلو ۔ ہرگز نہ مانا ۔ مجھے خرید کیں اور اپنے دوستوں کو بھیج دیں ۔"

علامہ شبلی اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں :۔

" ..... دونوں کتابیں (المامون اور الجزیہ) سید صاحب نے کالج کیلئے چھاپی ہیں ۔ مجھکو حق تصنیف میں صرف ایک نسخہ عنایت ہوا ہے ...... اسوقت تک میں نے اپنی کسی تصنیف کو نہ خود چھاپا نہ اُس سے فائدہ اٹھایا ۔" [1]

اس سے مولانا کے خلوص قلب ، ایثار اور انکی بے لوث طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ دو انجمنیں "اخوان الصفا" اور "لجنۃ الادب" قائم کرنے میں بھی مولانا کا ہاتھ ہے ۔ اول الذکر میں اُردو کے مضامین پڑھے جاتے تھے اور آخر الذکر عربی کی تحریروں اور تقریروں کی مشق کے لئے قائم کی گئی تھی ۔ محمڈن ایجوکیشنل کانگرس (جو بعد میں پروفیسر مارلین کے مشورہ سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے موسوم ہوئی) کے ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کے اجلاس میں جو لکھنؤ میں ہوا تھا مولانا ، نے پہلی مرتبہ اپنا مقالہ "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" پڑھا تھا ۔ اسکے بعد قریب قریب اسکے ہر جلسہ میں مولانا کی زبان قلم سے نکلی ہوئی کوئی نہ کوئی چیز ہوتی تھی ۔[2] کبھی یونین میں تقریر کرتے ، کبھی کانفرنس کے اسٹیج پر لکچر دیتے نظر آتے ۔ اور کبھی "انسٹیٹیوٹ گزٹ" اور "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین" کے صفحات پر اپنا زور قلم دکھاتے ۔ غرض انھوں نے یہاں کی ہر تحریک میں نہایت خلوص دل اور سرگرمی کیساتھ حصہ لیا اور اُسے فائدہ پہونچانے کی امکانی کوشش

لجنۃ

لہ ۲ بحوالۂ حیات شبلی ۔ ۔ ۔ ۔

www.urduchannel.in

کی۔ ۱۹۰۲ء/۱۳۲۰ھ میں کانفرنس میں "انجمن ترقی اُردو" کی بنیاد پڑی۔ اور مولانا اسکے پہلے سیکرٹری مقرر ہوئے۔

اورنگ زیب قاسمی

نینی تال کا سفر

مئی ۱۸۸۶ء میں گرمیوں میں مولانا سرسید کے ساتھ نینی تال گئے۔ اس سفر کی اہمیت یوں ہے کہ انکے پہلے مضمون "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" کا خاکہ یہیں انکے ذہن میں آیا۔[1]

سفر روم و مصر و شام ۱۸۹۲ء

مولانا کے متعدد خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ علی گڑھ کی آب و ہوا اکثر راس نہ آئی۔ ملیریا کے حملوں نے اُن کو بہت کمزور کر دیا اسلئے انھیں تبدیل آب و ہوا کا خیال ہوا۔ اور وہ عازم کشمیر ہوئے۔ مگر کسی وجہ سے وہاں جانا نہ ہوسکا۔ اس درمیان میں پروفیسر آرنلڈ وطن جانے کے لئے تیار ہوئے اور مولانا سے اس کا تذکرہ کیا۔ "الفاروق" کی تدوین کے سلسلہ میں ایک عرصہ سے مولانا اسلامی ممالک کے کتب خانوں کو دیکھنے اور اُن سے مستفید ہونے کے متمنی تھے۔ آرنلڈ کے سفر سے انکی یہ تمنا ابھر آئی۔ مولانا نے یہ خیال کر کے کہ راستہ بھر ایک فاضل ہمسفر کا ساتھ بھی ہو رہا ہے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء/۱۳۱۰ھ میں مولانا اس تاریخی سفر پر روانہ ہو گئے۔ قسطنطنیہ کے دوران قیام میں مولانا عثمان پاشا سے ملے اور اس ذریعہ سے انھیں تمغۂ مجیدی ملا۔

شمس العلماء کا خطاب

اس علمی سفر سے واپسی کے بعد سرسید کی تحریک پر مولانا کو ۱۸۹۴ء میں گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا جیسا کہ سطور ذیل سے معلوم ہوتا ہے:۔

> "...... سید زین الدین صاحب (علی گڑھ) کا (جو اُسوقت کالج کے اونچے درجہ کے طالب علم ہونگے) یہ بیان ہے کہ سرسید نے انھیں سے انگریزی میں ایک چٹھی لکھوا کر گورنمنٹ میں بھیجی کہ مولانا شبلی جیسے فاضل کی قدردانی ترکی گورنمنٹ تو اتنی کرے کہ تمغہ مجیدی عطا فرمائے اور انگریزی گورنمنٹ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس فرض سے غافل رہے۔"[2]

ندوۃ العلماء

جب ندوہ کے اغراض و مقاصد اور اسکے آئندہ اجلاس کا اعلان ہوا تو مسلمانوں میں خوشی اور جوش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر چہار طرف سے علماء اُس میں شرکت کے لئے آنے لگے تو ان میں مولانا بھی پیش پیش تھے۔ ندوہ کے پہلے اجلاس کے تیسرے جلسہ میں جو ۱۷ شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۴ اپریل کی صبح کو ہوا مولانا نے جو تجویزیں پیش کیں اور جن پر غور و بحث ہونا قرار پایا ان میں ایک یہ تھی:۔

"موجودہ طریق تعلیم قابل اصلاح ہے"۔ اس سلسلے میں مولانا نے ایک زوردار تقریر کی اور بتایا کہ موجودہ طریق تعلیم میں

---

[1] بحوالہ حیات شبلی ۱۶ 〃 〃 〃

[2] حیات شبلی : صہ ۲۳۷

نوٹ: شمس العلماء کا خطاب ہندی گورنمنٹ دیتی تھی۔

www.urduchannel.in

کیا کیا نقائص ہیں۔ اور انکی ترمیم کی سخت ضرورت ہے۔ نصاب تعلیم کی ترمیم کے لئے جو مجلس قائم کی گئی اس میں مولانا بھی تھے۔ ندوہ کے دوسرے اجلاس میں جب منصور علی صاحب مراد آبادی نے نصاب تعلیم میں علوم جدیدہ کے اضافہ کی تجویز پیش کی تو مولانا نے اسکی پرزور تائید کی۔ تجویز کی مخالفت میں مولانا کے استاد، مولانا محمد فاروق بھی تھے، مگر کثرت آرا سے مولانا کی موافقت میں فیصلہ ہوا۔ دسمبر ۱۸۹۵ء میں مجلس نصاب میں دارالعلوم کے نصاب کا خاکہ مرتب کیا گیا۔ جب مجلس دارالعلوم کے نام سے ایک الگ مجلس قائم ہوئی تو اس مجلس کے قواعد مولانا ہی نے تیار کئے ان سطور سے محض یہ دکھانا تھا کہ مولانا کو تعلیم اور طریق تعلیم سے کسقدر دلچسپی تھی۔ اور اس باب میں انکا مطمح نظر کس قدر بلند اور قابل قدر تھا۔ آج جس چیز کی ضرورت اور اہمیت ہر طبقے میں محسوس کیجا رہی ہے اُسے آج سے بہت پہلے مولانا نے محسوس کر لیا تھا۔ یہ انکے اجتہاد کی ایک کھلی ہوئی دلیل ہے۔

علی گڑھ سے ترک تعلق

مئی ۱۸۹۸ء میں مولانا نے پہلے علی گڑھ کالج سے چھ مہینے کی رخصت لی اور پھر استعفا دیدیا۔ ترک تعلق کی وجہ انکی علی گڑھ سے بددلی تھی۔ چنانچہ ایک خط میں اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:۔

> "کالج کا حال کشمکش میں ہے۔ سررست بک صاحب نے قبضہ کر لیا ہے۔ سید محمود کی حالت بہت خراب ہے۔"[۵]

علی گڑھ سے مولانا اعظم گڈھ آئے۔ شبلی منزل کے نام سے ایک بنگلہ بنوایا اور اسی میں رہنے لگے۔ یہی اب دارالمصنفین ہے اور اُن کا مدفن بھی۔

۱۸۹۹ء میں مولانا پر علالت کا سخت دورہ پڑا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے اور وصیت تک لکھدی تھی مگر ڈاکٹر مصطفےٰ خاں کے علاج سے انھیں فائدہ ہو گیا۔ پھر بھی تبدیل آب وہوا کی رائے دی گئی۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء میں وہ کشمیر روانہ ہو گئے۔ انکی زندۂ جاوید کتاب "الفاروق" اسوقت زیر تصنیف تھی۔ کشمیر پہنچکر وہ پھر بیمار پڑ گئے اور اسی بیماری کی حالت میں ۵ جولائی ۱۸۹۸ء کو "الفاروق" کی آخری سطریں قلم بند کیں۔ وہاں سے واپسی پر صاحب فراش ہو گئے۔ مگر خدا نے شفا دی۔

سررشتۂ علوم وفنون کی نظامت ۱۹۰۱ء

۲۲ مئی ۱۹۰۱ء میں مولانا کو سررشتۂ علوم وفنون کی نظامت ملی۔ پہلے تنخواہ دو سو مقرر ہوئی پھر رفتہ رفتہ پانچسو روپے ماہوار ملنے لگے۔ مگر اسکے ساتھ

---

[۵] مکاتیب شبلی : حصہ دوم : طبع دوم : ص۳۰

www.urduchannel.in

یہ ہوا کہ سو روپیہ ماہوار کا جو وظیفہ سرکار آصفیہ سے ملا کرتا تھا بند ہو گیا۔ حیدر آباد میں مولانا کل چار برس رہے یعنی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک۔ چار سال کے اس عرصہ میں نواب وقار الامراء مستعفی ہوئے اور انکی جگہ پر سر کرشن پرشاد کا تقرر ہوا۔ مولوی سید حسن بلگرامی اپنی خدمات سے سبکدوش کر دیئے گئے۔ اُن کی جگہ پر میر کاظم علی صاحب کا تقرر ہوا۔ غرض یہ زمانہ بڑے خلفشار کا زمانہ تھا۔ چنانچہ مولانا نے علیحدگی بہتر سمجھی اور ملازمت سے استعفا دیدیا۔

اورنگ زیب قاسمی

انجمن ترقی اُردو کی نظامت

جب اُردو، ہندی قضیہ کی نوبت یہاں تک پہونچی کہ سرکاری دفتروں میں اُردو کے بجائے ہندی زبان اور ناگری رسم الخط کا رواج ہوا تو قدرتی طور پر حامیان اُردو کے دل میں اپنی زبان کے تحفظ و بقاء کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ ۲۹ اپریل ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ میں اُردو ڈفنس سینٹرل کمیٹی وجود میں آئی اور اسکے زیر اہتمام ایک زبردست جلسہ ہوا جس میں گورنمنٹ کی اس ہندی نواز پالیسی پر صدائے احتجاج بلند کی گئی اور جو ہندو پرست لفٹنٹ گورنر میکڈانلڈ کی برہمئ مزاج کا باعث ہوئی۔ چنانچہ یہ کمیٹی گورنر صوبہ کی مخالفت پر بھینٹ چڑھ گئی۔

پھر شاہی دربار کے موقع پر دہلی میں جنوری ۱۹۰۳ء کو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا اور کانفرنس کے مختلف شعبے قائم ہوئے۔ ان میں سے ایک شعبہ کا نام "انجمن ترقئ اُردو" پڑا اور اسکے حسب ذیل عہدہ دار مقرر ہوئے:۔

صدر	:	مسٹر آرنلڈ (پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور)
نائب صدر	:	مولوی نذیر احمد، ذکاء اللہ، حالی
سیکریٹری	:	شبلی

علامہ شبلی نے جس سرگرمی سے اس کام کو انجام دیا وہ آپ اپنی نظیر ہے[1]

ندوۃ العلماء سے تعلق

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ مولانا کو ندوۃ العلماء سے کسقدر دلچسپی تھی اور وہ علی گڑھ میں قیام کے باوجود اسکے جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ حیدر آباد کی ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد مولانا حتی الوسع ندوہ کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ اُس وقت ندوہ کی حالت بہت نازک تھی، گورنمنٹ کی بدگمانی سے ہر وقت اسکے ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ ایسے آڑے وقت میں مولانا نے نہایت محنت، جانفشانی اور خلوص سے پھر اُس کو زندہ کیا۔ مگر زمانے کے حالات سے ناواقف علماء کی ایک جماعت ہمیشہ مولانا کی مخالفت

---

[1] بحوالہ حیات شبلی۔

www.urduchannel.in

کرتی رہی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں مولانا کو بددل ہو کر ندوہ کو خیرباد کہنا پڑا۔ مولانا ۸ جنوری ۱۹۰۵ء کو ندوہ کے معتمد تعلیم منتخب ہوئے تھے۔

اورنگ زیب قاسمی

حادثۂ پا

نظامت ندوہ کے زمانے میں مولانا کچھ دنوں کے لئے اعظم گڈھ آگئے۔ یہاں دوران قیام میں ایک روز بندوق جو غلطی سے بھری ہوئی رکھی تھی اتفاقاً چل گئی اور پاؤں کی ہڈی چور چور ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پیر کاٹنا پڑا۔ مولانا شعرالعجم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"جب موازنہ سے بالکل فارغ ہو کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوا اور فردوسی کے حال تک پہونچا تو ۲ مئی ۱۹۰۷ء کو صدمۂ پا کا واقعہ پیش آیا۔ یعنی اتفاق سے میرے پاؤں میں گولی لگی اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا۔ یہ بھی فردوسی کی کرامت تھی کہ واقعہ سے ذرا پہلے شاہنامے کا یہ مصرعہ "بریدو درید و شکست و ببست" قلم کی زبان پر تھا"۔

دارالمصنفین

آج دارالمصنفین مولانا کی زندہ یادگار ہے۔ مولانا کی دلی خواہش تھی کہ دارالمصنفین ندوہ میں کھولا جائے مگر یہ ممکن نہ ہوا۔ بھائی کی وفات کے بعد جب مولانا مستقل طور پر اعظم گڈھ میں رہنے لگے تو وہیں دارالمصنفین کا خاکہ تیار ہوا لیکن یہ خواب انکی زندگی میں شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

مولانا کا آخری کام

اسمیں شبہ نہیں کہ سیرۃ النبیؐ شبلی کی تصانیف میں بڑا مرتبہ رکھتی ہے۔ اگرچہ اس کا آغاز حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں (۱۹۰۳ء) ہوا تھا لیکن وہ مکمل نہ ہو سکا۔ اور اسکا ذکر بھی چند مکاتیب کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا۔ البتہ سید سلیمان صاحب ندوی نے "حیات شبلی" میں اس مسودہ کا حوالہ دیا ہے جو انھوں نے حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں لکھا تھا۔ سید صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ خاکہ ایک جسد بےروح ہے۔ باقاعدہ طور پر ۱۹۱۲ء میں سیرۃ کے متعلق پہلا اعلان ہوا جس میں قوم سے اسکے ماہانہ مصارف کیلئے ڈھائی سو روپیہ ماہوار اور کچھ اور روپیئے کی درخواست کی گئی تھی۔ سرکار عالیہ بھوپال نے یہ رقم پہلے دو سال کیلئے مقرر کر دی پھر تا تکمیل اسمیں توسیع ہو گئی۔ مولانا سیرۃ کی پہلی اور دوسری جلد مکمل کرنے پائے تھے کہ پیام اجل آپہونچا۔

وفات

مولانا کی صحت کو علی گڑھ کی آب وہوا راس نہ آئی۔ اور وہ معدہ کی مختلف شکایتوں میں مبتلا رہنے لگے۔ کشمیر سے واپسی کے بعد تو وہ سالوں بیمار رہے اور بہت کمزور ہو گئے۔ حادثۂ پا نے انکی رہی سہی طاقت بھی کم کر دی اور وہ چلنے پھرنے سے بھی مجبور ہو گئے۔ پیچش اور اسہال کے دورے پڑنے لگے۔ دواؤں سے افاقہ تو ہو جاتا تھا مگر مرض کلیتاً کبھی رفع نہ ہوا۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں جب لکھنؤ میں اسہال کا دورہ پڑا تو مایوسی

www.urduchannel.in

میں اُنھوں نے اپنے ایک دوست کو ذیل کا خط لکھوایا :-

اورنگ زیب قاسمی

"اب اسہال کے دورے جلد جلد پڑنے لگے اسلئے سال دو سال سے زیادہ جینے کی اُمید نہیں۔" [1]

لیکن اس ناامیدی کی حالت میں بھی اُن کے دل و دماغ صحیح تھے۔ اور جن کاموں کی تکمیل کا وہ ارادہ کر چکے تھے اس سے کبھی مایوس نہ ہوئے۔ اور آخر دم تک اسکی تکمیل کی فکر میں لگے رہے۔

الغرض ۸ انومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ رذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو صبح گیارہ روز تک ہیضہ اور بواسیر کی کے سخت دورہ میں مبتلا رہ کر اُنھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ اور شبلی منزل کے ایک گوشہ میں دفن ہوئے۔

---

[1] حیاتِ شبلی۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

بابِ سوم

تصانیف و تبصرہ

(شبلی کا نظریۂ تاریخ)

اسلامی تاریخ اور اسکی قسمیں تاریخ کا فن گو بہت قدیم ہے لیکن مسلمانوں نے اس میں جو تنوع پیدا کیا اور اسکو جتنی ترقی دی اسکے اعتبار سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ فن ان کا اپنا بن گیا تھا۔

اسلامی تاریخ کی بہت سی قسمیں ہیں، ان میں سے ایک تراجم یا 'تذکرہ' ہے۔ اس میں مشاہیر کے حالات، اُن کے کارنامے، اُن کے اخلاق و عادات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس خاص صنف میں اُنھوں نے اس قدر برگ و بار پیدا کئے اور اسے اس درجہ ترقی دی کہ دنیا کی اور کوئی قوم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ علم و فن کے لحاظ بلکہ کسی وصف کے اعتبار سے اصحاب کمال کے جتنے طبقے ہو سکتے ہیں، مسلمانوں نے ہر طبقے کے حالات میں بڑی کثرت سے کتابیں لکھی ہیں۔ صحابہ، تابعین، تبع تابعین، مفسرین، محدثین، فقہاء، ادباء، شعراء، نحوی، لغوی، ہر ہر طبقہ کے علٰحدہ علٰحدہ حالات لکھے، حتیٰ کہ مشہور حمقاء تک کے حالات ہیں۔ ڈاکٹر اسپرنگر "اصابہ" کے دیباچہ میں جسکا نسخہ اُن کی تصحیح سے کلکتہ میں چھپا تھا لکھتے ہیں:۔

> " نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری، نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جسکی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔"[1]

محدثین نے اس فن کو ایک خاص مذہبی ضرورت یعنی "تنقید روایات" کے لئے ایجاد کیا تھا۔ لیکن بعد کے لوگوں نے اس طریقہ پر حکماء، صوفیاء، امراء، اور سلاطین یہاں تک کہ گانے والوں تک کے حالات لکھے ہیں۔ جسکی وجہ سے یہ فن اور بھی ترقی کر گیا ہے اور اس میں تکمیل کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

شبلی کا انتخاب مولانا شبلی نے اسلامی تاریخ میں اسی شاخ کو لیا ہے اور چونکہ یہ شاخ مختلف طبقات پر

---

[1] سیرۃ النبی (دفعہ نوٹ) : صفحہ ۲۹۔۲۵ : مطبوعہ نامی پریس کانپور : ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۸ء

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

مشتمل تھی، اسلئے سب سے پہلے اُنھوں نے شاہی خاندانوں کا انتخاب کیا۔ مگر اس میں بھی صرف برگزیدہ اصحاب کا انتخاب مدنظر رکھا۔ چنانچہ المامون کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

> "...... اسلام میں آجتک خلافت وسلطنت کے جتنے سلسلے قائم ہوئے انمیں سے صرف دو نامور انتخاب کرلئے جائیں جو اپنے طبقے میں عظمت حکومت کے اعتبار سے اپنا ہمسر نہ رکھتے ہوں"۔ [1]

پھر مولانا نے سلاطین اور حکومتوں کو چھوڑ کر علمی سلسلے کی طرف توجہ کی اور فقہ کو انتخاب کیا۔ اور بانیٔ فقہ حضرت امام ابوحنیفہ کی سوانح عمری "سیرۃ النعمان" کے نام سے لکھی۔ چنانچہ سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں :-

> "چند روز کے لئے خاندان حکومت کو چھوڑ کر علمی سلسلے کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ فقہ، حدیث، ادب، منطق، فلسفہ، ریاضی، مختلف خاندان سامنے تھے۔ بعض وجوہ سے فقہ کو ترجیح دی اور امام ابوحنیفہ کو جو فقہ کے بانی ہیں اسکا ہیرو قرار دیا"۔ [2]

پھر الفاروق لکھی اور اسی پر خاندان خلافت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اسکے بعد انھوں نے جن لوگوں کے حالات لکھے ہیں سب کے سب علمی سلسلے سے متعلق ہیں۔

ہندوستان میں علوم کا رواج

ہندوستان میں زیادہ تر عقلی علوم کا رواج رہا۔ ان علوم میں جو لوگ صاحب کمال ہوئے انھوں نے علم ادب، علم تاریخ، اور فن تراجم وتذکرہ کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ علوم عقلیہ کے بعد سرزمین ہند میں فقہ اور اصول فقہ کا فن پھلا پھولا۔ بعد کو علم حدیث کا رواج ہوا۔ جسکی ترویج واشاعت میں خاندان ولی اللّٰہی کا بڑا حصہ ہے۔ اس بنا پر مولانا کے زمانے تک علوم عقلیہ ونقلیہ میں صرف منطق، فلسفہ، ریاضی، فقہ، اصول فقہ اور علم حدیث معیار کمال خیال کئے جاتے تھے۔ اور علم ادب اور تاریخ کی طرف عام طور پر توجہ نہ تھی۔ بعض علماء علوم ادبیہ کا ذوق رکھتے تھے لیکن تاریخ کو وہ بھی قابل اعتنا نہ سمجھتے تھے۔ اس دور سے پہلے بھی فرماں روایان ہند کے حالات میں جسقدر اہم کتابیں تصنیف ہوئیں انکے مصنفین میں ملا عبدالقادر بدایونی کے سوا اور کسی مسلمان عالم کا نام نہیں ملتا۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی بھی اس خاص وصف میں منفرد ہیں کہ علماء کے طبقے میں سب سے پہلے اُنھوں نے فن تراجم وتذکرہ کی طرف توجہ کی۔ اور متعدد علماء وشعراء کے حالات میں کتابیں لکھیں۔ لیکن ملا عبدالقادر اور

---

[1] دیباچہ المامون : ص۵ : نقش چہارم : مطبع مفید عام آگرہ : ۱۸۹۲ء / ۱۳۱۰ھ -

[2] دیباچہ سیرۃ النعمان : ص۳ : مطبوعہ معارف پریس : ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء -

www.urduchannel.in

آزاد بلگرامی کی کتابیں فارسی زبان میں تھیں اور ان پر ایک مدت گزر چکی تھی۔ مولانا کے زمانے تک فن تاریخ و تذکرہ پر کتاب لکھنے کا کسی کو خیال نہ تھا۔ اُردو زبان خصوصیت کے ساتھ تاریخی سرمایہ سے بالکل خالی تھی۔ فرمانروایان مغلیہ کے حالات میں بے شبہہ چند کتابیں لکھی گئی تھیں لیکن اور خاندان بالکل گمنامی کی حالت میں تھے۔ مولانا پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس فن کی طرف توجہ کی اور اسکو معراج کمال تک پہونچا دیا۔ "تنقیدی مقالات" میں " تجارب الامم ابن مسکویہ" پر لکھتے ہوئے مولانا ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

" ہمارے یہاں علوم کی جو دو قسمیں معقول و منقول قرار دی گئی ہیں اسکے متعلق ایک سخت غلطی یہ ہوئی کہ بعض علوم جنہیں دونوں حیثیتیں جمع تھیں صرف انمیں ایک حیثیت کا لحاظ ہوا۔ مثلاً تاریخ و روایت کا فن محض منقولات میں شمار کیا گیا۔ جس سے نتائج ذیل پیدا ہوئے :۔

(۱) جو لوگ صرف معقول کو اپنا مائہ ناز سمجھتے تھے یعنی حکماء اور فلاسفہ انھوں نے اس فن کیطرف مطلق توجہ نہیں کی۔ اسلئے یہ فن فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں سے محروم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بوعلی سینا، امام رازی، قطب الدین شیرازی، جلال الدین دوانی کی کوئی تصنیف اس فن میں موجود نہیں۔

(۲) چونکہ اس فن کی نسبت عام خیال یہ پیدا ہو گیا کہ اسکو عقل و درایت سے تعلق نہیں اسلئے مؤرخین اور اہل روایت نے خود بھی عقل و درایت سے کام نہیں لیا۔ انکو صرف اس سے غرض تھی کہ واقعہ کا بیان کرنیوالا ثقہ ہے یا نہیں۔ اگر ثقہ ہے تو وہ جو واقعہ بیان کرتا ہے انکے نزدیک قابل اعتبار ہے یا نہیں۔ حالانکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ راوی ثقہ ہو اور واقعہ کے بیان میں اس سے غلطیاں وقوع میں آئیں۔ بغرض اس خیال کیوجہ سے تاریخ کا فن اُس رتبہ پر نہ پہونچا جس پر اسکو پہنچنا چاہئے تھا۔"[۱]

تاریخ سائنس ہے یا آرٹ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شبلی کے نزدیک تاریخ شعبۂ ادبیات سے نکل کر سائنس کے درجہ تک پہونچ چکی ہے۔ مگر مولانا تاریخ کو اگرچہ "ادبیات" کے شعبوں میں افسانہ اور ناول سے بالاتر سمجھتے ہیں پھر بھی اُسکو بالکل سائنس بھی نہیں خیال کرتے۔ بلکہ انکے نزدیک تاریخ اصولاً ایک نقلی علم ہے اسلئے فن تاریخ میں واقعات کی روایت کے لئے مستقل سلسلۂ اسناد کی ضرورت ہے۔ اور اسی خصوصیت کیوجہ سے

---

[۱] مقالات شبلی : جلد چہارم : صـ ۲۲ : مطبع معارف ۱۹۳۴ء / ۱۳۵۳ھ

www.urduchannel.in

وہ مسلمانوں کے فن تاریخ کو یورپ کے فن تاریخ پر ترجیح دیتے ہیں۔ الفاروق میں لکھتے ہیں :-

اورنگ زیب قاسمی

"طبری، فتوح البلدان، طبقات ابن سعد وغیرہ میں تمام واقعات بہ سند متصل مذکور ہیں۔ یورپ نے فن تاریخ کو آج کمال کے درجے پر پہونچا دیا ہے لیکن اس خاص امر میں وہ مسلمان مورخوں سے بہت پیچھے ہیں۔ انکو واقعہ نگار کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی پروا نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ وہ جرح و تعدیل کے نام سے بھی آشنا نہیں۔" [1]

لیکن اسکے ساتھ انکے نزدیک واقعات کی صحت کے لئے صرف راویوں کا ثقہ ہونا کافی نہیں بلکہ اسکے ساتھ چند عقلی اصول کی بھی ضرورت ہے۔ مثلاً :-

"(۱) واقعہ مذکورہ اصول عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں۔

(۲) اُس زمانے میں لوگوں کا میلان عام واقعہ کے مخالف تھا یا موافق۔

(۳) واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے شہادت زیادہ قوی ہے یا نہیں۔

(۴) اس امر کی تفتیش کہ راوی جس چیز کو واقعہ ظاہر کرتا ہے اسمیں قیاس اور رائے کا کس قدر حصہ شامل ہے۔

(۵) راوی نے واقعہ کو جس صورت میں ظاہر کیا وہ واقعہ کی پوری تصویر ہے یا اس امر کا احتمال ہے کہ راوی اسکے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا۔

(۶) اس بات کا اندازہ کہ زمانہ کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریق ادا نے روایت میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کر دئے ہیں۔" [2]

شبلی کا نظریہ اور اسکی وضاحت

مولانا پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان میں روحانیت کا فقدان ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ معترض حضرات بزرگان دین کے حالات میں خوارق عادات اور خلاف عقل واقعات کے عادی تھے۔ مولانا کی تصانیف ان سے خالی ہیں۔ وہ تاریخی واقعات میں روایت اور درایت دونوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اسلئے ان کے نزدیک تاریخ نہ صرف آرٹ ہے نہ سائنس بلکہ ان دونوں کا مجموعہ ہے مولانا کے نزدیک تاریخی تصنیفات کے لئے دو چیزیں نہایت اہم اور ضروری تھیں :-

(۱) جس عہد کا حال لکھا جائے اُس زمانے کے ہر قسم کے واقعات قلم بند کئے جائیں۔ یعنی تمدن،

---

[1] الفاروق : صـ ۱۳ : معارف پریس اعظم گڑھ

[2] " : صـ ۱۵-۱۶ (اسکی تفصیل سیرۃ کے دیباچہ میں بھی ملتی ہے۔ ملاحظہ ہو سیرۃ پر تبصرہ)

www.urduchannel.in

معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب، ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے

اورنگ زیب قاسمی

(۲) تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔

مولانا نے اپنی تصانیف میں سلسلے میں صرف تاریخ کی کتابوں سے استفادہ نہیں کیا، بلکہ تراجم، طبقات، جغرافیہ، سفرناموں، نقشہ جات، جہاں سے جو چیزیں مفید مطلب ہاتھ آئیں لے لیں۔ مگر اس کا ہمیشہ خیال رکھا کہ صرف معتبر و قابل اعتماد کتابوں اور اُن کی بھی مستند اور صحیح تر روایتوں کو درج کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ہمیشہ ان روایات کو قلم انداز کردیا جن کی صحت میں ان کو ذرا بھی شبہہ تھا یا جو ان کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی تھیں۔ شبلی کے نزدیک قدیم تاریخوں میں مفید باتیں نہیں ملتیں وہ صرف دوراز کار اور غیر ضروری واقعات کی کھتونیاں ہیں۔ شبلی کا معیار تاریخ ذیل کے جملوں سے معلوم ہو سکتا ہے:۔

> "تاریخ عالم کا ہر واقعہ بہت سے مختلف واقعات کے سلسلے میں بندھا ہے۔ انھیں ریشہ دوانیوں کا پتہ لگانا اور اُنسے فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کے ساتھ تاریخی نتائج کا مستنبط کرنا۔ یہی چیز ہے جو علم تاریخ کی جان اور روح ہے۔"[1]

مولانا نے انھیں لوگوں کو اپنا ہیرو منتخب کیا، جنھوں نے اپنے عہد میں تہذیب و تمدن کو زیادہ ترقی دی تھی۔ اور اُنکے حالات کے ضمن میں اسلامی تمدنی کارناموں کو نہایت واضح طور پر نمایاں کیا جا سکتا تھا۔ مولانا پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخ کے مفہوم میں وسعت پیدا کی اور اپنی وسیع النظری سے ان خانوں کو پُر کردیا جنکو اسلامی مورخین خالی چھوڑ گئے تھے۔ عام خیال یہ ہے کہ مولانا کا تاریخ کے میدان میں قدم رکھنا محض اسوجہ سے تھا کہ وہ مسلمانوں کو اُن کے اسلاف کی گزشتہ شوکت و عظمت کی داستان سنانا چاہتے تھے۔ (شبلی اس گزشتہ عظمت کی مداحی کرتے تھے اور حالی اس کا نوحہ کرتے تھے) لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو شبلی کو مورخ سے زیادہ متکلم جانتے ہیں اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ شبلی کی تاریخی تصانیف میں بھی متکلمانہ شان پائی جاتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ مولانا نے جب تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھا اس زمانے میں یورپین مصنفین اسلام کے بعض مذہبی، تمدنی و معاشرتی، مسائل پر بڑے زور و شور کے ساتھ نکتہ چینیاں کر رہے تھے۔ اور سرسید اور مولوی چراغ علی وغیرہ اُن کے مقابلہ میں تھے۔ ان دونوں میں یہ کمزوری تھی کہ وہ اُن اعتراضوں کا تحقیقی جواب دینے کے بجائے اصل مسائل میں تاویل کرتے تھے۔ اُن کی کوششیں صرف مذہبی و معاشرتی مسائل کے جواب تک محدود تھیں۔

---

[1] المامون : ص ۹ : نقش چہارم : مطبع مفید عام : سنہ ۱۸۹۲ء

www.urduchannel.in

انکے علاوہ بہت سے تاریخی اعتراضات بھی تھے۔ مثلاً :-

اورنگ زیب قاسمی

(۱) ...... مسلمانوں نے اسلام کو بزور شمشیر پھیلایا اور دوسری قوموں پر نہایت جابرانہ اور ظالمانہ حکومت کی۔

(۲) وہ نہایت وحشی، جنگ جو اور غیر متمدن تھے۔

علامہ شبلی نے اپنی تاریخی تصانیف اور مقالات میں ان اعتراضات کا نہایت مدلل جواب دیا۔ اور ان کے دعووں کی غلطیاں دکھائیں۔ قدیم کتابوں میں جدید تمدن و معاشرت کے مطابق جو باتیں انھیں مل جاتی تھیں انھیں بڑی آب و تاب سے پیش کرتے تھے۔ مثلاً کھانے کے آداب میں لکھتے ہیں :-

"بچہ میں جس وقت تمیز کے آثار ظاہر ہوں اسی وقت سے اسکی دیکھ بھال رکھنی چاہئے۔ بچہ میں سب سے پہلے غذا کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اسلئے تعلیم کی ابتداء یہیں سے شروع ہونی چاہئے۔ اسکو سکھانا چاہئے کہ کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لیا کرے۔ دسترخوان پر جو کھانے سامنے اور قریب ہوں اسی کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہئے۔ ساتھ کھانے والوں پر سبقت نہ کرے۔ کھانے کی طرف یا کھانے والوں کی طرف نظر نہ جمائے۔ جلد جلد نہ کھائے۔ نوالہ اچھی طرح چبائے۔ ہاتھ اور کپڑے کھانے میں آلودہ نہ ہونے پائیں۔ زیادہ خوری کو معیوب ثابت کیا جائے۔ کم کھانا معمولی کھانے پر اکتفا کرنا۔ دوسروں کو کھلا دینا ان اوصاف کی خوبی دل میں بٹھائی جائے۔"[۱]

اسکے بعد لکھتے ہیں :-

"امام صاحب کا یہ دستورالعمل بالکل حکیم بروسن یونانی کے اس ہدایت نامہ سے ماخوذ ہے جسکو ابن مسکویہ نے کتاب تہذیب الاخلاق میں حکیم موصوف کی کتاب سے نقل کیا ہے۔"[۲]

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ مولانا مغربی تمدن سے متاثر تھے اور مسلمانوں کو اسکی طرف مائل کرنا چاہتے تھے۔ اسمیں شبہ نہیں کہ وہ یورپین تمدن کو بہت زیادہ ترقی یافتہ سمجھتے تھے۔ اور اسکی بعض خوبیوں کو پسند بھی کرتے تھے لیکن اسکے ساتھ اسکی برائیوں پر بھی نظر تھی۔ مثلاً وہ عورتوں کی بے پردگی کو ناپسند کرتے تھے۔ اور "پردہ اور اسلام" کے نام سے انھوں نے ایک مضمون بھی لکھا ہے جس میں تاریخی اور مذہبی دونوں حیثیت سے ثابت کیا ہے کہ جاہلیت اور اسلام دونوں زمانے میں پردہ کا رواج تھا۔ گلبدن بیگم کے "ہمایوں نامہ" پر جو تنقید لکھی ہے اس میں خاص طور

---

۱ الغزالی : ص۶۹ ؛ مطبوعہ معارف : ۱۹۳۶ء
۲ ؍؍ : ص۷۰ ؛ ؍؍ : ؍؍

www.urduchannel.in

پر اس زمانے کے تمدنی اور معاشرتی حالات کے متعلق جو واقعات انتخاب کئے ہیں ان میں ذکر کے قابل یہ ہیں :-

اورنگ زیب قاسمی

(۱) عورتیں پڑھنے کے علاوہ فنون سپہ گری سے بھی واقف ہوتی تھیں اور سفر اور شکار میں گھوڑے پر سوار ہوتی تھیں - یہانتک کہ بعض عورتیں مردانہ لباس پہنتی تھیں -

(۲) عورتوں کا نہایت احترام کیا جاتا تھا -

(۳) ملکی معاملات میں عورتوں سے مشورہ لیا جاتا تھا -

(۴) عورتوں کو اپنی شادی اور نکاح کے معاملے میں پوری آزادی حاصل تھی -

یہ تمام باتیں جدید تہذیب و معاشرت کے مطابق ہیں - لیکن ان سب کے بعد لکھتے ہیں :-

"لیکن ہمارے زمانے کے پردہ شکن گروہ کو یہ سن کر مایوسی ہوگی کہ ان سب باتوں کے ساتھ عورتیں نامحرم سے پردہ کرتی تھیں اور بغیر نقاب اور برقعے کے باہر نہیں نکلتی تھیں۔"

دور جدید کے بعض تعلیم یافتہ ہندو بھی مسلمانوں پر اس قسم کے اعتراضات کرتے تھے - چنانچہ ایک ہندو مضمون نگار نے ملا مسیح کی رامائن پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس قسم کے خیالات ظاہر کئے تھے :-

(۱) "مسلمانوں نے صدیوں اس ملک پر حکومت کی اور اُسکا خاتمہ بھی ہو گیا مگر اس ملک کے علم و ادب کی طرف انہوں نے توجہ بہت کم کی -

(۲) "اُس زمانے میں کوئی ہندوانہ قصہ لکھنا ، مسلمانوں کے لئے آفت سے کم نہ تھا - ہندوؤں کی کوئی بات اپنے قلم سے لکھنے میں مسلمان مصنف کو کافر بننے کا خوف اتنا تنگ کرتا تھا کہ وہ ایکدم گھبرا جاتا تھا -

(۳) جہانگیر کے وقت تک یہ حالت تھی کہ اگر کوئی مسلمان ہندو کی باتوں کی طرف متوجہ ہو تو اسکو کافر سمجھا جاتا تھا -

اسکے جواب میں مولانا نے " مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہندو بھائیوں کی ناسپاسی " کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا ، جسمیں تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے نہایت بے تعصبی سے ہندوؤں کے علوم و فنون سیکھے اور سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے کرائے - مولانا نے ہندوؤں کے اس خیال کی خاص طور پر تردید کی کہ "مسلمانوں نے ہندوؤں کے تمدن کو تباہ کر ڈالا" - اور اسکے مقابلہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان آکر یہاں تمدنی حالت کو بہت زیادہ ترقی دی - چنانچہ عبدالرحیم خانخاناں کے حالات میں لکھتے ہیں :-

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

"ان کوتاہ نظروں کو معلوم نہیں کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی افتادہ زمین کو چمن زار بنا دیا تھا۔ دنیا جانتی ہے کہ ہندو پہلے پتّوں پر رکھ کر کھانا کھاتے تھے۔ زمین پر سوتے تھے، بن سلے کپڑے پہنتے تھے، تنگ مکانوں میں بسر کرتے تھے، مسلمانوں نے آکر ان کو کھانے، پینے، رہنے سہنے، وضع لباس، فرش وفروش، زیب وزینت کا سلیقہ سکھایا۔" [1]

دوسرے قسم کے اعتراضات میں ایک اہم مسئلہ جزیہ کا تھا۔ جس کا ذکر اجمالاً اوپر گزر چکا ہے۔ اسکے جواب میں مولانا نے ایک مضمون "الجزیہ" کے نام سے لکھا ہے۔ آرمینیا کے جھگڑے میں ترکوں پر جو غلط الزامات لگائے گئے تھے ابھی ان کی تحقیق بھی شروع نہ ہوئی تھی کہ یورپ کے اہل قلم نے ایک ہلچل مچادی کہ مسلمانوں کے مذہب میں عیسائی رعایا پر ظلم کرنا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اور اسوجہ سے یہ یقین کرنا کہ ترکوں نے وہ تمام ظالمانہ کارروائیاں کی ہونگی گویا اس بات کا یقین کرنا ہے کہ ترک اپنے مذہب میں پابند ہیں اور پورے پابند۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے "حقوق ذمیین" کے نام سے ایک علٰحدہ مقالہ لکھا اور دکھادیا کہ انکے الزامات بے بنیاد ہیں۔ اسکے ساتھ یہ بھی ثابت کردیا کہ مسلمانوں نے ذمیوں کے ساتھ یہ سلوک کئے ہیں:۔

(۱) جائداد اور جان مال کے حقوق میں مسلمان اور ذمی برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔

(۲) انکے تمام مذہبی حقوق محفوظ تھے۔ اور انکو ہر قسم کی مذہبی آزادی تھی۔

(۳) ذمیوں کے رتبے اور اعزاز کا ہر موقع پر خیال رکھا جاتا تھا۔ اور انکے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کیا جاتا تھا۔

(۴) انکو نظام سلطنت میں دخل تھا۔ اور ہر قسم کے ذمہ دارانہ عہدے ملتے تھے۔

جہانگیر پر جو مضمون لکھا ہے اسکی تمہید میں لکھتے ہیں:۔

"یورپ کے بے درد واقعہ نگاروں نے سلاطین اسلام کی غفلت شعاری، عیش پرستی، سیہ کاری کے واقعات کو ایسی بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا ہے کہ خود ہمیں کو یقین آچلا اور تقلید پرست تو بالکل یورپ کے ہم آہنگ بن گئے۔" [2]

عالمگیر پر جو الزامات لگائے جاتے تھے ان کی تردید میں مولانا نے ایک مفصل مضمون لکھا جو

---

[1] مقالات شبلی : جلد چہارم : صـ ۷۸ : مطبوعہ معارف ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء۔

[2] " : " : صـ ۸۲ : " : " ۔

www.urduchannel.in

"الندوہ" کے کئی نمبروں میں نکلا۔ اس قسم کے بعض اعتراضوں میں شیعہ بھی ہندوؤں کے ہمنوا ہیں۔ اس لئے جواب میں مولانا نے ان کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اگرچہ انہوں نے "الفاروق" میں تاریخی کتابوں کی تحریر کا یہ اصول قرار دیا ہے۔

> "مورخ کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ یورپ میں آجکل جو بڑا مورخ گزرا ہے اور جو طرز حال کا موجد ہے۔ "رینکی" ہے۔ اسکی تعریف ایک پروفیسر نے ان الفاظ میں کی ہے۔ اسنے تاریخ میں شاعری سے کام نہیں لیا۔ وہ نہ ملک کا ہمدرد تھا نہ مذہب اور قوم کا طرفدار۔ کسی واقعہ کے بیان کرنے میں مطلق پتہ نہیں لگتا کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور اس کا ذاتی اعتقاد کیا ہے۔" [1]

لیکن مولانا چونکہ نرے مورخ ہی نہیں بلکہ اسکے ساتھ ساتھ متکلم بھی ہیں اسلئے ان الزامات کی تردید میں وہ اپنے اسلامی جوش کو نہیں چھپا سکتے۔ اور اُن کی تحریر سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ ایک غیور مسلمان ہیں۔ جو اس قسم کے بیجا اتہامات اور حملوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ عالمگیر والے مضمون میں جس مورخ پر اسکی تردید کی ہے کہ عالمگیر نے شیواجی کے ساتھ جیسا کہ یورپین مورخین کا خیال ہے نہیں کیا بلکہ اسکے اعزاز کو نہایت مناسب طریقہ پر قائم رکھا، لکھتے ہیں :-

> "اس سے زیادہ اور کیا چاہتا تھا کیا شاہنشاہ ہند ایک مفروج رہزن کے لئے تخت سے اُتر آتا بے شبہ یورپ اس قسم کی جھوٹی اور مکارانہ خوشامدوں کی مثالیں پیش کر سکتا ہے لیکن اسلام سے اسکی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

> "یورپین مورخوں کے اعتراضات (جیسا کہ آگے ثابت ہوگا) اگرچہ نہایت بادر ہوا ہوتے ہیں اور اسلئے ان کا جواب دینا نہایت آسان بات ہے لیکن بایں ہمہ جواب دینے والا سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے یورپین مصنفین ایک اعتراض کے بیان کرنے میں جو خود غلط ہوتا ہے پے درپے اور بہت سے جھوٹ ملاتے جاتے ہیں۔ جواب دینے والا ایک جھوٹ کا جواب دینا چاہتا ہے تو سامنے ایک اور جھوٹ نظر آتا ہے۔ ادھر متوجہ ہوتا ہے تو ایک اور جھوٹ نمایاں ہوتا ہے۔ مسلسل دروغ بیانی اور اعتراضوں کے ہجوم پر بے اختیار اسکو طیش آجاتا ہے اور بجائے اسکے کہ وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اصل واقعہ

---

[1] الفاروق : صہ ۳ : معارف پریس اعظم گڑھ

www.urduchannel.in

کے انکشاف کی طرف متوجہ ہو، غصہ سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ خود مجھ پر بھی اثر پڑتا ہے"۔

اورنگ زیب قاسمی

مولانا نے تاریخی کتابوں کی طرز تحریر کا جو اصول قائم کیا تھا، اکثر اس سے ہٹ جاتے ہیں۔ جس کا خود ان کو احساس تھا۔ مگر اسکی وجہ سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ وہ بعض اوقات یورپین مصنفین کے مسلسل جھوٹ سے گھبرا کر بے قابو ہو جاتے ہیں اور ان کا قدم جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتا ہے۔ اور وہ تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کا قلم ایک مورخ کا قلم ہے جس کو جذبات سے نہیں صرف واقعات سے سروکار رکھنا چاہئے۔ ایسے موقعوں پر اُن کے ذاتی اعتقادات کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے۔ مگر ایسی مثالیں شاذونادر ہی ملیں گی۔

اس موقع پر نامناسب نہ ہوگا اگر مولوی سید محمد عبداللہ ایم اے۔ ڈی لٹ کے مضمون پر جو "شبلی کا نظریۂ تاریخ" کے عنوان سے مارچ اور اپریل ۳۸ء کے معارف کے پرچوں میں شائع ہوا تھا اظہار خیال کر دیا جائے۔ اس سوال کے جواب میں کہ "شبلی کا تاریخی نظریہ خود ان کا اپنا تھا یا یورپین مصنفین کے اثر کا نتیجہ؟ اگرچہ عبداللہ صاحب نے یہ اعتراف کیا ہے کہ "مولانا شبلی یورپ کے نہ مقلد تھے اور نہ عقیدت مند"۔ تاہم ہر ممکن طریقہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شبلی کو مغربی تحریک نے شبلی بنایا۔ ہمیں اُن کے اس نظریہ کی تردید کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ مولانا کو خود اعتراف ہے کہ انھوں نے یورپ کی تاریخی ترقیوں کو نکتہ آفرینیوں کو پیش نظر رکھ کر اپنی تاریخی تصانیف مرتب کی ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"تاریخ کے فن میں اہل مغرب نے جو نئے نئے برگ و بار پیدا کئے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ اشخاص اور اقوام کی تاریخ سے گزر کر علوم و فنون کی تاریخ لکھتے ہیں ...... اس قسم کی کوئی تصنیف اُردو بلکہ فارسی اور عربی میں بھی موجود نہ تھی ...... علم کلام کی تاریخ لکھنے سے ایک طرف تو اسلامی لٹریچر کی ایک بڑی کمی پوری ہوتی ہے تو دوسری طرف یہ تصنیف جو درحقیقت علم کلام کی تصنیف ہے تاریخ کے دائرے میں آجاتی ہے"۔[1]

یورپ کی اس تاریخی ترقی کی بنا پر اُن کو مسلمانوں کی قدیم تاریخی تصنیفات بالکل ناکافی نظر آتی ہیں۔ جن کا اعتراف انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"موجودہ زمانے میں تاریخ کا فن ترقی کے جس پایہ پر پہنچ گیا ہے اور یورپ کی دقیقہ سنجی نے اسکے اصول و فروع پر جو فلسفیانہ نکتے اضافہ کئے ہیں اسکے اعتبار سے ہماری قدیم تصنیفات ہمارے مقصد کے لئے بالکل کافی نہیں"۔[2]

۱؎ علم الکلام : ص ۲ : طبع پنجم : مطبوعہ معارف : سنہ ۱۹۳۹ء

۲؎ المامون : ص ۵ : نقش چہارم : مطبوعہ مفید عام آگرہ : سنہ ۱۸۹۲ء

www.urduchannel.in

تاہم مولوی سید عبداللہ صاحب نے اس نظریہ کو جسطرح ثابت کیا ہے اس سے ہمیں اتفاق نہیں۔ کیونکہ ان کا استدلال محض قیاس پر مبنی ہے۔ جبکا صحیح ہونا ضروری نہیں۔ ایک موقع پر لکھتے ہیں :۔

"... یہ ایک واقعہ ہے جس کا اعتراف خود شبلی نے متعدد مواقع پر اپنی تصانیف میں نہایت جرأت سے کیا ہے۔"

اور پھر ایک جگہ یہ سطریں نظر آتی ہیں :۔

"تصانیف کا شوق مجھے اُن تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی تھیں۔ اور ایک موقع پر مجھکو بہت سی ایک حائل گئی تھیں۔ جنکو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔"

مولانا کی اس تحریر سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ تاریخ نگاری میں یورپ کے مقلد تھے صحیح نہیں ہے۔ انکا مقصد یہ ہے کہ ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد مولانا کو تصنیف کا اسلئے شوق پیدا ہوا کہ اس سے پہلے ہندوستان میں عربی کی ایسی تصانیف موجود نہ تھیں جنسے اسلامی تاریخ و علوم و فنون کے متعلق مواد حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس اقتباس میں جن کتابوں کا حوالہ ہے اُن سے مراد یورپین تصانیف نہیں بلکہ عربی کی وہ قدیم تصنیفات مراد ہیں جو یورپ سے شائع ہوئیں۔ ان کے مطالعہ سے یوروپین مورخین کی تقلید کا نتیجہ کہاں سے نکلتا ہے۔ سید عبداللہ صاحب کے دلائل کی غلطی اس موقع پر سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے جب وہ لکھتے ہیں :۔

"وہ بعض موقعوں پر یورپین تصانیف کے متعلق اپنے جذبۂ تحسین کو چھپا نہ سکتے تھے"

اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں شبلی کا یہ جملہ :۔

"یوروپین مورخوں کی تصنیفات کشت زعفران نظر آتی ہیں"

نقل کرتے ہیں۔ شبلی کے اس جملے کو جو درحقیقت یوروپین مورخین کی تصنیفات کی "ہجو ملیح" ہے "مدح" سمجھنا مضحکہ خیز ہے۔ مشہور ہے کہ کشت زعفران کو دیکھنے سے بے ساختہ ہنسی آتی ہے۔ شبلی کا اس سے مطلب یہ ہے کہ یوروپین مورخین کی تصانیف میں اس قدر تمسخر آمیز معلومات درج ہوتی ہیں جن کو دیکھکر انسان بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔

سید عبداللہ صاحب کے استدلال کی سب سے زیادہ غلط مثال یہ ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"شبلی کے شاگردوں اور دوستوں کی ایک بہت بڑی جماعت انگریزی تعلیم سے بہرہ ور تھی۔ انکے اپنے خاندان میں انگریزی کا رواج عام ہو چکا تھا۔ انکے حقیقی بھائی مہدی[1] اور جنید

---

[1] مہدی وکیل نہیں بیرسٹر تھے۔

بیرسٹر وکیل نہیں تو اور کیا ہوتا؟

مہدی نے لندن سے بیرسٹری ...

www.urduchannel.in

وکیل تھے ۔ اُن کے چچا زاد[1] بھائی مولانا حمید الدین مشرقی اور مغربی تعلیم کے جامع تھے ۔ پھر دوستوں میں شیخ عبدالقادر ایم ۔ اے ۔ ایم مہدی حسن ، سید نواب علی ایم اے ۔ عطیہ فیضی ، اور شاگردوں میں سید سلیمان اور مولانا عبدالماجد وغیرہ[2] سب انگریزی سے واقف تھے ۔ شبلی اپنی تصانیف کی ترتیب و تحریر کے دوران میں اپنے ان انگریزی داں دوستوں اور شاگردوں سے پورا فائدہ اُٹھاتے تھے ۔"

اورنگ زیب قاسمی

سید عبداللہ صاحب نے مولانا کے جن عزیزوں ، شاگردوں اور دوستوں کے نام گنائے ہیں ۔ وہ سب اس زمانے کے بعد پیدا ہوئے جب مولانا اپنی تاریخی تصنیفات کا بلند معیار قائم کر چکے تھے ۔ سید عبداللہ صاحب نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا شبلی کی ذہنی تربیت میں مصر کا بھی کچھ کم حصہ نہیں ۔ اور اس پر ذیل کے دلائل قائم کئے ہیں :۔

(۱) مصر میں مغرب پسند علماء کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا ہو چکی تھی ، جس کی کوشش سے انگریزی لٹریچر کا ایک منتخب سرمایہ عربی زبان میں منتقل ہو چکا تھا ۔ اور بہت سی اوریجنل (Original) تصانیف بھی شائع ہو کر اطراف و اکناف ملک میں پھیل چکی تھیں ۔

(۲) اور مولانا شبلی اس لٹریچر کو منگواتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے رہتے تھے ، کارلائل کی کتاب (Hero & Hero worship) عربی لباس ہی میں ان کے پاس آئی اور انھوں نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا ۔ ایلیڈ مصری ہی ترجمے کے ذریعے ان کی نگاہوں سے گذری ۔ اور فرید وجدی نے اسلام کے ثبوت اور فلسفہ حال کی تطبیق پر مصر سے جو پرچہ نکالا اسکو مولانا شبلی نے بہت پسند کیا ۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا سیاحت مصر سے بہت پہلے اپنا تاریخی معیار قائم کر چکے تھے ، البتہ اسلامی تاریخ کا ہندوستان میں جو سرمایہ تھا تنہا اس سے مولانا کے بلند معیار کے مطابق معلومات حاصل نہیں ہو سکتے تھے ۔ اسلئے انھوں نے روم و مصر و شام کا سفر کیا ۔ تاکہ وہاں کے اسلامی کتب خانوں سے معلومات فراہم کر سکیں

---

[1] حمید الدین ماموں زاد بھائی تھے ۔

[2] سید سلیمان صاحب انگریزی سے بہت کم واقف ہیں ۔ اور عبدالماجد مولانا کے شاگرد نہیں ۔ سید عبداللہ صاحب مولوی ماجد کو عبدالماجد سمجھے اور غالباً انکو مولانا کے اُس خط سے غلط فہمی ہوئی ہے جو انھوں نے شروانی صاحب کے نام ۱۳ جون ۱۹۱۱ء کو لکھا ہے اور جسمیں لکھتے ہیں :۔

" مولوی ماجد میرے شاگرد ہیں اور ادب مجھسے پڑھتے ہیں " ۔ : مکاتیب جلد اول : ص ۱۹۱

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

اسلئے درحقیقت اُن کی ذہنی تربیت میں مصر کا کوئی ہاتھ نہیں۔ البتہ مصر میں جو تراجم اور تصنیفات شائع ہوتے رہتے تھے ان کو وہ ضرور منگوایا کرتے تھے۔ لیکن ان سے انکے ذوق طلب کو بہت کم تشفی ہوتی تھی۔ کارلائل کی کتاب میں لفاظی اور انشاء پردازی کے سوا ٹھوس معلومات بہت کم ہیں۔ اور اس سے مولانا نے صرف سیرۃ النبیؐ میں ایک جگہ فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اسکے چند انشا پردازانہ فقرے نقل کئے ہیں۔ فرید وجدی کے متعلق مولانا کے خیالات یہ ہیں :-

"فرید وجدی کے کمالات کے اعتراف کے ساتھ ہم کو کسی قدر افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انکی مذہبی معلومات سطحی اور سرسری ہیں۔ اسلئے جب وہ حدیث یا قرآن مجید کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو ان کی کم مائیگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے" ۔[۱]

اور مصر کی تصانیف پر اسطرح اظہار رائے کیا ہے :-

"حال میں علم کلام کے متعلق مصر، شام، اور ہندوستان میں متعدد کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ اور نئے علم کلام کا ایک دفتر تیار ہو گیا ہے۔ یا تو وہی فرسودہ اور دور از کار مسائل ہیں جو متاخرین اشاعرہ نے ایجاد کئے تھے یا یہ کیا ہے کہ یورپ کے ہر قسم کے معتقدات اور خیالات کو حق کا معیار قرار دیا ہے۔ اور پھر قرآن و حدیث کو زبردستی کھینچ تان کر اُن سے ملا دیا ہے۔ پہلا کورانہ تقلید اور دوسرا تقلیدی اجتہاد ہے۔ اسلئے میں نے اُن تصانیف سے قطع نظر کی ہے" ۔[۲]

اصل یہ ہے کہ مولانا نے یوروپین تصنیفات اور زمانے کے عام رجحان کے اثر سے تاریخ کا جو معیار قائم کیا وہ اسلامی اور یوروپین دونوں قسم کی تاریخی تصنیفات سے مختلف تھا۔

(۱) یورپ نقل و روایت کی پروا نہیں کرتا تھا۔ لیکن مولانا نے بزرگان سلف کے مقرر کردہ اصول کے مطابق سلسلۂ روایات کو اسلامی تاریخ کا طغرائے امتیاز قرار دیا ہے۔ (۹)

(۲) البتہ یہ سلسلۂ روایات عقلی عنصر کی آمیزش سے خالی تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ اسلامی مورخ نقل و روایت میں سچائی کے خیال سے کسی قسم کی آمیزش کو جائز نہیں خیال کرتے۔

سیرۃ النبیؐ میں مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"ارباب سیر اکثر واقعات کے اسباب و علل سے بحث نہیں کرتے۔ نہ انکی تلاش و تحقیق کیطرف

---

[۱] مقالات شبلی : جلد پنجم : ص ۱۳۶ : مطبوعہ معارف : ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۶ء

[۲] علم الکلام : طبع پنجم : ص ۲ : " : ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء

www.urduchannel.in

متوجہ ہوتے۔ اگرچہ اسمیں شبہہ نہیں کہ اس باب میں یورپ کا طریقہ نہایت غیر معتدل ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

یوروپین مورخ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتا ہے۔ اور نہایت دور از قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلومات پیدا کرتا ہے۔ اسمیں بہت کچھ اسکی خودغرضی اور مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتا ہے تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں۔ بخلاف اسکے اسلامی مورخ نہایت سچائی اور انصاف اور خالص بے طرفداری سے واقعات کو ڈھونڈھتا ہے۔ اسکو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعات کا اثر اسکے مذہب پر، معتقدات پر اور تاریخ پر کیا پڑے گا۔ اس کا تنہا مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے۔ وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے۔ لیکن اس میں حد سے زیادہ تفریط ہو گئی۔ اس بات سے بچنے کے لئے کہ واقعات رائے سے مخلوط نہ ہو جائیں وہ پاس پاس کے ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں ڈالتا۔ اور ہر واقعہ کو خشک اور ادھورا چھوڑ دیتا ہے۔ مثلاً اکثر لڑائیوں کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فلاں قبیلہ پر فلاں وقت فوجیں بھیجدیں۔ لیکن اسکے اسباب کا ذکر مطلق نہیں کرتے جس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ کرنے کے لئے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں۔ اس سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا۔" [1]

اقتباس مذکورۂ بالا سے اسلامی اور یوروپین مورخین میں مولانا نے جو خامیاں محسوس کیں پورے طور پر معلوم ہو جاتی ہیں۔ مولانا نے ان دونوں میں سے کسی کی تقلید نہیں کی بلکہ دونوں کی اچھائیوں کو لے لیا اور برائیوں کو نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ ایک طرف انھوں نے اسلامی مورخین سے صحت روایت کو لیا دوسری جانب سلسلۂ واقعات میں انکے اسباب و علل اور نتائج پر بھی نگاہ رکھی جو یوروپین مصنفین کا طریقہ ہیں۔ بے اعتدالیوں اور قیاس آرائیوں سے احتراز کیا ہے۔ اور تاریخ میں جن عقلی اصول سے کام لیا جا سکتا تھا اُن کا سراغ خود اسلامی تصنیفات سے لگایا۔

(۳) خود سلسلۂ روایات کی تنقید کی اور ایسے اصول قائم کئے جن سے موجودہ حالات و ضروریات کے مطابق اسلامی روایات کی تنقید کی جا سکے۔ لیکن یہ اصول بھی خود ان کی ایجاد نہ تھے۔ بلکہ فقہا اور محدثین

---

[1] سیرۃ النبی ؛ ص ۶۴ ؛ نامی پریس کانپور ؛ ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۸ء۔

www.urduchannel.in

نے خود اس قسم کے اصول قائم کر دئیے تھے۔

اورنگ زیب قاسمی

(۴) اور چونکہ بقول مولانا :۔

"یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہر زمانے کا مذاق مختلف ہے۔ جن باتوں کو قدما نے اس خیال سے نظر انداز کر دیا کہ یہ جزئی اور عام معمولی باتیں تصنیف کی متانت کے شایان نہیں آج انہیں کی تلاش ہے کہ اس عہد کی عام معاشرت اور طرز زندگی کا ان سے اندازہ کیا جائے۔" [1]

یہی وجہ ہے کہ مولانا نے اپنی تاریخی تصنیفات کے دو حصّے کئے ہیں۔ پہلے میں معمولی واقعات کا بیان ہے جو عموماً تاریخوں میں مل سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے حصّے کے لئے جس قسم کے واقعات درکار ہیں اُن کی تلاش و جستجو انہوں نے نہ صرف تاریخی تصنیفات میں کی ہے بلکہ تراجم، طبقات، مقامی جغرافئے، سفرنامے، نقشہ جات وغیرہ سے، جہاں سے بھی انکو مفید معلومات حاصل ہو سکے انسے فائدہ اٹھایا۔ اسلئے ان کی تاریخی تصنیفات مختلف علوم وفنون مثلاً فقہ، حدیث، تفسیر، ادب اور دوسرے علوم وفنون کا مجموعہ بن گئی ہیں۔ جن کی تصدیق اُن کی تصنیفات اور مضامین کے حوالوں سے ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا پر یوروپین تصنیفات کا محض اس قدر اثر پڑا کہ انہوں نے اسلامی تاریخ کا ایک نیا خاکہ تیار کیا لیکن اس خاکے میں انہوں نے جو آب ورنگ بھرا وہ تمام تر اسلامی تصنیفات سے ماخوذ تھا۔ انہوں نے یوروپین مصنفین کی کبھی کورانہ تقلید نہیں کی اور مصر وشام کے بعض مصنفین سے تو کسی قسم کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔

---

[1] المامون : صـ۹ : نقش چہارم : مطبوعہ مفید عام آگرہ : سنہ ۱۸۹۳ء

www.urduchannel.in

تصانیف

تصنیفی زندگی کا آغاز

ظل الغمام فی مسئلۃ القرآۃ خلف الامام

مولانا کے ذوق تصنیف کا آغاز احناف اور غیر مقلدین کے اختلافی مسائل سے ہوا۔ جن پر اُس زمانے میں بحث و مناظرہ عام تھا۔ مولانا ابتداء میں بڑے غالی اور کٹر حنفی تھے۔ اُن کا قول تھا کہ انسان عیسائی ہو سکتا ہے مگر غیر مقلد نہیں ہو سکتا۔ جہاں سن پاتے کہ کسی گاؤں میں کوئی غیر مقلد ہے فوراً اُس سے مناظرہ کے لئے پہونچتے۔ اس زمانے میں آمین بالجہر، رفع یدین، اور قرأۃ خلف الامام وغیرہ کے مسائل پر احناف اور غیر مقلد میں بحث و مناظرہ اور رسالہ بازی عام تھی۔ چنانچہ مولانا کی تصنیف کا آغاز بھی اسی قسم کے ایک رسالے "ظل الغمام فی مسئلۃ القرآن خلف الامام" سے ہوا۔ یہ رسالہ اُنہوں نے مولانا سلامت اللہ کے کسی رسالے کی رد میں، جو قراءت خلف الامام پر تھا لکھا تھا۔ یہ رسالہ ۱۲۹۸ھ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا تھا۔ اور اب نایاب ہے۔ گو یہ رسالہ مولانا کی بالکل ابتدائی تصنیف ہے لیکن اس میں انشاء پردازی اور زور تحریر کے آثار پوری طرح نمایاں ہیں۔

اسکات المعتدی

اس کے چند سال بعد اسی موضوع پر اُنھوں نے دوسرا رسالہ "اسکات المعتدی علی انصات المقتدی" عربی زبان میں لکھا۔ یہ رسالہ مولانا عبدالحیٔ صاحب مرحوم فرنگی محلی کے ایک رسالے "امام الکلام فی ما یتعلق بالقراءۃ خلف الامام" کا جواب ہے۔ مولانا عبدالحی صاحب گو حنفی تھے لیکن "قراءۃ خلف الامام" کے مسئلے میں اُن کی تحقیق یہ تھی کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا نہ پڑھنا علمائے احناف کے نزدیک متفق علیہ نہیں ہے[1]۔ اور اس میں صحیح مسلک یہ ہے کہ سری یعنی ان نمازوں میں جو آہستہ پڑھی جاتی ہیں مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنا چاہئے۔

---

[1] غیر مقلدین کے یہاں ہر حال میں سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔ خواہ تنہا ہو خواہ امام کے پیچھے۔ لیکن احناف کے یہاں امام کے پیچھے نہ صرف واجب نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے۔ لیکن بعض علمائے احناف کا مسلک معتدل ہے۔ جہری نمازوں یعنی ان نمازوں میں تو جو بلند آواز سے پڑھی جاتی ہیں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ لیکن سری یعنی ان نمازوں میں جو آہستہ پڑھی جاتی ہیں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا بہتر سمجھتے ہیں۔ یہی مسلک مولانا عبدالحیٔ صاحب کا تھا۔

www.urduchannel.in

مولانا نے اسکات المعتدی میں مولانا عبدالحئی صاحب کی اسی تحقیق کا رد کیا ہے۔ یہ رسالہ بھی مطبع نظامی کانپور میں ۱۲۹۵ء میں شائع ہوا۔ گو یہ جو بیس صفحوں کا مختصر رسالہ ہے لیکن اس نے بڑی شہرت حاصل کی اور اتنا مقبول ہوا کہ اس کی شہرت مصر و شام اور ترکی تک پہونچ گئی۔ جب مولانا نے ان ممالک کا سفر کیا تو محض اس رسالہ کے مصنف کی حیثیت سے اُن کی بڑی قدر ہوئی۔ اس رسالہ کے کئی جواب لکھے گئے۔ عربی زبان میں مولانا کی یہ پہلی تصنیف ہے جیسا کہ خود لکھتے ہیں :-

"میری سب سے پہلی تصنیف عربی زبان میں ایک چھوٹا سا رسالہ" اسکات المعتدی" نام ہے لیکن وہ چونکہ عربی زبان میں تھا اور ایک جزئی مسئلہ پر تھا اسلئے وہ چنداں شائع نہیں ہوا۔ اسکے بعد سب سے پہلی تصنیف "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" ہے اور وہ بہت پھیلی اور بار بار چھپی ...." [۱]

مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم - ۱۸۸۷ء / ۱۳۰۵ھ

اگرچہ علی گڑھ آنے سے پہلے بھی مولانا شبلی تالیف و تصنیف کے مشغلہ سے دلچسپی رکھتے تھے لیکن "اسکات المعتدی" کو مولانا کا علمی کارنامہ نہیں کہہ سکتے۔

شبلی کی اصلی رنگ میں پہلی جھلک

مولانا علی گڑھ ۱۸۸۳ء / ۱۳۰۱ھ میں آئے اور ۱۸۸۷ء / ۱۳۰۵ھ میں اُن کے قلم سے سب سے پہلا مضمون "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" کے عنوان سے نکلا۔ یہ مضمون ۲۷ دسمبر ۱۸۸۷ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے لکھنؤ کے اجلاس کے موقع پر پڑھا گیا۔ اور اسی سنہ میں ایک رسالہ کی صورت میں شائع بھی ہوا۔ اسی مضمون کے بارے میں مولوی محمد سمیع صاحب کو مولانا اپنے ایک خط مورخہ ۸ مئی ۱۸۸۷ء میں لکھتے ہیں۔

"....... محمڈن تعلیمی مجلس اس سال لکھنؤ میں ہوگی۔ اشتہار میں شائع کیا گیا ہے کہ شبلی مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر ایک وسیع مضمون پڑھے گا۔ شاید یہ مضمون جی لگا کر لکھوں اور گرانمایہ لکھوں....." [۲]

اس رسالہ کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں ہمیں پہلی مرتبہ مولانا کے "تاریخی رجحان" کے وہ نقوش ملتے ہیں جو زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ زیادہ گہرے اور نمایاں ہوتے گئے۔ اور جنکی وجہ سے بعد میں مولانا "ملک میں تاریخ کے معلم اول" [۳] کہلائے۔ یہ پہلا مقالہ ہے جسمیں مسلمانوں کے اسلاف کے کارنامے شرح و بسط سے

---

[۱] مکاتیب شبلی : جلد دوم : طبع دوم : ص ۲۳۵
[۲] " : حصہ اول : " : ص ۹۳
[۳] افادات مہدی : طبع اول : ص ۱۹۲

www.urduchannel.in

بیان کئے گئے ہیں اور یہی وہ افق ہے جہاں مولانا کی شہرت کا آفتاب پہلی بار طلوع ہوا

اورنگ زیب قاسمی

ماخذات

اس تصنیف میں مولانا نے سب سے پہلے مسلمانوں کے خاص علوم، اُن کی ابتدائی تاریخ اور سبب ایجاد کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر اُن تراجم کا ذکر ہے جو مسلمانوں نے دوسری قوموں کے علوم و فنون سے کئے۔ اسکے بعد اسلامی مدارس کی تاریخ، ان کے حالات، طریقۂ تعلیم اور نتائج تعلیم کی تشریح کی ہے۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں کہ شبلی کی تعلیم قدیم طرز کی تھی اور وہ سرسید کی ملاقات سے پہلے مغربی محققین اور اُن کے کارناموں سے بالکل واقف نہ تھے۔ سرسید کے کتب خانہ کے تعلق سے وہ مغربی مصنفین سے روشناس ہوئے۔ چنانچہ صرف اس ایک مضمون میں اتنے مغربی مصنفین اور اُن کی تصانیف کا ذکر آیا ہے:۔

1. Roman Empire by Gibbon.
2. History of Philosophy by Henry Loins. (?)
3. Chambers' Encyclopedia.
4. Encyclopedia ~~Brittanica~~ Britannica

اس مضمون کا ماخذ وہ قدیم عربی تصانیف ہیں جو مصر و یورپ وغیرہ میں شائع ہوئیں۔ اور جو اس زمانے میں ہندوستان میں نایاب تھیں۔ اور عوام کا کیا ذکر عام طور سے خواص تک کی دسترس سے باہر تھیں۔ اس مقالے کے ماخذات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کشف الظنون : مطبوعہ لندن : ۱۸۴۷ء / ۱۲۶۵ھ

(۲) حسن المحاضرۃ فی اخبار المصر والقاہرہ : مطبوعہ مصر : ۱۸۸۱ء / ۱۲۹۹ھ

(۳) نامۂ دانشوران : مطبوعہ ایران

(۴) تاریخ ابن خلدون : مطبوعہ بیروت

(۵) مختصر الدول مع ترجمہ ڈاکٹر پوکاک آکسفورڈ کالج : مطبوعہ لندن : ۱۶۶۳ء / ۱۰۷۴ھ

(۶) جامع القصص الہندیہ : مطبوعہ فرانس : ۱۸۳۷ء / ۱۲۵۴ھ

(۷) تاریخ ہارون الرشید : پامر : مطبوعہ لندن : ۱۸۸۶ء / ۱۳۰۴ھ

(۸) مختصر الدول بیروتی مع دیباچہ پروفیسر شنو : مطبوعہ لندن

ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرسید کے کتب خانے میں ہی ان کی نظر سے گزریں۔

www.urduchannel.in

اگرچہ شبلی کے قلم سے یہ پہلا مقالہ ہے لیکن تحقیق و تلاش و ترتیب میں شبلی نے پوری کوشش کی ہے۔ جس کا
اورنگ زیب قاسمی
اندازہ اُس کے حوالوں سے ہوتا ہے۔ ان سے پہلے اس اہم مضمون پر اُردو زبان میں اور کوئی مضمون نہیں ملتا۔

اس سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن مغربی مصنفین کا ذکر شبلی نے کیا ہے اُن سے براہ راست انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے اُن کو کیونکر واقفیت ہوئی لیکن یہ چنداں لائق التفات نہیں۔ اسکے بہت سے ذرائع ہو سکتے ہیں۔ بایں ہمہ شبلی کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انگریزی سے واقفیت نہ ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے کام کے لئے راہ نکال لی۔

مقالہ کی بحث کا خلاصہ

مولانا نے دوسری زبانوں کے عربی تراجم کی تفصیل نہایت شرح و بسط سے لکھی ہے۔ فلسفہ میں پچیس اہم تراجم کا ذکر کیا ہے۔ جنکے مترجمین کے حالات ملتے ہیں۔ اقلیدس کے عنوان کے تحت میں۔ حجاج ابن یوسف کوفی - ابو عثمان دمشقی - یزیدی - جوہری - ماہانی - ابو حفص الحرث خراسانی ابوالوفاء البوزجانی، ابو قاسم انطاکی، احمد بن محمد الکرابیسی، ابو یوسف الرازی، قاضی ابو محمد عبدالباقی، ابو علی الحسن بن الحسین۔ ابن الهیثم البصری۔ ابو جعفر خاں اہوازی - اور محقق طوسی وغیرہ کا ذکر اور اُن کی تصانیف کی فہرست لکھی ہے۔ فہرستیں زیادہ تر کشف الظنون سے لی گئی ہیں۔ خاص ارسطو کی تصانیف کے متعلق حالات ناسخ التواریخ جلد اول سے لئے گئے ہیں۔

اس مقالے میں یہ خامی نظر آتی ہے کہ مولانا نے اُس میں صرف غیر زبانوں کے ترجموں کا ذکر کیا ہے حالانکہ اس زمانے میں ان علوم میں خود مسلمان مصنفین کی بہت سی مستقل تصانیف ہو گئی تھیں۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہے کہ مستقل تصانیف کا ذکر بہت طویل ہو جاتا۔

مقالہ کے آخر میں مولانا شبلی نے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے متعلق یہ لکھا ہے کہ اس سائٹی نے ہندوستان میں علم و فن کی ترقی کے لئے مغربی زبانوں سے کتابیں ترجمہ کرنے کی تجویز کی تھی اور یہ تجویز غلط تھی شبلی کے اس بیان سے اتفاق یا اختلاف کرنا یہاں زیر بحث نہیں۔

سرسید سے اختلاف کی پہلی آواز

البتہ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ شبلی باوجود سرسید کے احترام کے جن معاملات میں اُن سے اختلاف رکھتے تھے اُس کے اظہار اور اعلان پر بھی جری تھے۔ ان سطور میں انہوں نے صرف سائنٹفک سوسائٹی سے اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ خود سرسید کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں:۔

www.urduchannel.in

"ہمکو اس بات کے معلوم کرنے سے خوشی ہے کہ خود سر سید احمد خاں صاحب نے جو سائنٹفک

اورنگ زیب قاسمی

سوسائٹی کے بانی ہیں متعدد تحریروں میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے" ۔

المأمون

۱۸۸۷ء
۱۳۰۵ھ

کتاب کی تجویز ۱۸۸۷ء / ۱۳۰۵ھ

"مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" کے بعد مولانا نے تاریخ بنی عباس لکھنے کا ارادہ کیا۔ جس کا حوالہ مولانا کے اس خط میں ملتا ہے جو انہوں نے ۱۸۸۳ء میں محمد سمیع صاحب کو تحریر کیا تھا:۔

"...... مجکو تو آج کل تاریخ بنی عباس کی پڑی ہے ...."[۱]

ایک اور دوسرے خط میں لکھتے ہیں :۔

"اسوقت میں معتصم کا حال لکھ رہا ہوں اور پہلی جلد انشاء اللہ یہیں ختم ہوجائیگی"۔[۲]

لیکن بقول مولانا شبلی :۔

"...... مشکل یہ تھی کہ نہ میں تمام خاندانوں کا استقصا کرسکتا تھا نہ کسی خاص سلسلے کے انتخاب کی مجکو کوئی وجہ مرجح نہیں ملتی۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک "رائل ہیروز آف اسلام" (یعنی نامور فرماں روایان اسلام) لکھوں۔ جس کا یہ طرز ہو کہ اسلام میں آج تک خلافت و حکومت کے اعتبار سے اپنا ہمسر نہ رکھتے ہوں اور اس کے حالات اس ترتیب و جامعیت سے لکھے جائیں کہ تاریخ کے ساتھ لائف کا مذاق بھی موجود ہو"۔[۳]

ترتیب کے لحاظ سے (جو مولانا نے قائم کی تھی) فاروق اعظم کا نام پہلا تھا۔ مگر الفاروق کے بجائے پہلے المامون پر کیوں قلم اٹھایا؟ اسکی وجہ سوائے اسکے اور کیا ہوسکتی ہے کہ چونکہ وہ تاریخ بنی عباس کی داغ بیل ڈال چکے تھے اور اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا بھی جا چکا تھا اسلئے سب سے پہلے خلیفہ مامون الرشید کی سوانح لکھ ڈالی۔ ۱۸۸۷ء / ۱۳۰۵ھ میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ "المامون" مولانا کی پہلی مستقل تصنیف

---

[۱] مکاتیب شبلی : جلد اول : طبع دوم : ص ۵
[۲] ؍ ؍ ؍ : ص ۷
[۳] المامون : نقش سوم : ص ۵-۶

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

ہے ۔ اسکے دیباچہ میں انہوں نے اظہار افسوس کیا ہے کہ اگرچہ اُردو دیکھتے دیکھتے ترقی کے بہت سے زینے طے کر چکی ہے اور قریب ہے کہ وہ ایک علمی زبان کی رتبہ تک پہونچ جائے ۔ لیکن اس میں تاریخ کا سرمایہ بالکل نہیں ۔ لوگوں نے توجہ کی تو تذکروں اور ناولوں میں مصروف رہے ۔ لیکن "قومی فیلنگ یا قومی جوش" کو زندہ رکھنے کے لئے جس سرمائے کی ضرورت ہے وہ ابھی تک اس میں نہیں آیا ۔

مولانا کیلئے یہ ممکن نہ تھا کہ تمام اسلامی حکومتوں کی ایک مفصل اور مبسوط تاریخ لکھدیں ۔ اور نہ کسی خاص خاندان کو مخصوص کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں آتی تھی ۔ چنانچہ انھوں نے نامورانِ اسلام کا ایک سلسلہ لکھنے کا ارادہ کیا اور اس لئے مختلف دس حکومتوں کے اُن دس نامور فرمانرواؤں کا انتخاب کیا جنکے کارناموں نے اس زمانے کی دنیا پر اثر ڈالا ۔

(۱) خلفائے راشدین میں حضرت عمرؓ

(۲) بنو اُمیہ " ولید بن عبد الملک

(۳) خلافت عباسیہ " مامون الرشید

(۴) بنو امیہ (اندلس) " عبد الرحمن ناصر

(۵) بنو حمدان " سیف الدولہ

(۶) خاندان سلجوقیہ عراق و ایران " ملک شاہ

(۷) نوریہ موصل " نور الدین محمود زنگی

(۸) خاندان ایوبیہ مصر " سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس

(۹) موحدین اندلس " یعقوب بن یوسف

(۱۰) ترکان عثمانی " سلیمان اعظم

کتاب کے ماخذ

ن

المامون کا ماخذ زیادہ تر عربی کی کتابیں اور بعض مغربی مصنفین کی کتابیں ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں :-

(۱) العیون والحدائق (۲) منتخب کتاب المختار من نوادر الاخبار

(۳) تاریخ الخلفائے سیوطی (۴) الدراری فی ذکر الذراری

(۵) الحکم والآداب یاقوت مستعصمی (۶) مرآۃ الجنان یافعی

مرآۃ الجنان

مُستعصمی

www.urduchannel.in

(۷) تاریخ مکہ ازرقی (مطبوعہ لنڈن برگ جرمنی) (۸) تاریخ کامل ابن الاثیر

(۹) عقد الفرید : ابن عبد ربہ (۱۰) تاریخ ابن واضح عباسی

اورنگ زیب قاسمی

(۱۱) تاریخ ابن خلکان : قاضی ابن خلکان (۱۲) مروج الذہب مسعودی

(۱۳) ثمار الاوراق (۱۴) مقدمہ تاریخ ابن خلدون

(۱۵) فتوح البلدان : بلاذری (۱۶) رومن امپائر : گبن

(۱۷) معجم البلدان : یاقوت (۱۸) مرأت البلدان ناصری

(۱۹) تاریخ ابو الفدا : ابو الفدا (۲۰) نجوم زاہرہ فی تاریخ مصر والقاہرہ

(۲۱) دائرۃ المعارف (۲۲) سفرنامہ ابن جبیر

(۲۳) ازالۃ الخفاء : شاہ ولی اللہ دہلوی (۲۴) حسن المحاضرۃ : سیوطی

(۲۵) آثار الدول قرمانی (۲۶) طبقات الاطباء

(۲۷) Encyclopedia Britannica (۲۸) تاریخ ہارون الرشید : پامر صاحب

(۲۹) نامۂ دانشوران : ناصری (۳۰) کشف الظنون : کاتب چلپی

یہ وہ تصانیف و تالیفات ہیں جن کا حوالہ کتاب میں آیا ہے۔ لیکن زیادہ حالات تاریخ کی کتابوں سے لئے گئے ہیں۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں تمہید، ترتیب خلافت، مامون الرشید کی ولادت، تعلیم و تربیت، ولیعہدی، تخت نشینی، خانہ جنگیاں، فتوحات ملکی اور وفات کا حال مذکور ہے۔ دوسرے حصے میں ان امور کی تفصیل اور تشریح ہے جن سے مامون کے عہد کے ملکی حالات اور اسکے اخلاق و عادات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور اسکے ان علمی کارناموں کی تفصیل ہے جن سے مامون الرشید کا عہد ممتاز سمجھا جاتا ہے۔

المامون کی مقبولیت

"المامون" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۷ء / ۱۳۰۵ھ میں طبع ہوا۔ مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۸۹ء / ۱۳۰۷ھ میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ سرسید نے اسی دوسرے ایڈیشن کی اشاعت پر ایک دیباچہ لکھا تھا۔ اسکے اہم حصے یہ ہیں :-

"اس قدر جزئیات کو تلاش کرنا اور نظم اسلوب سے ایک جگہ جمع کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔
...... حاشیوں پر جس قدر کتاب کے حوالے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں کس قدر جانکاہی ہوئی ہوگی۔ اور مصنف کو کتنے ہزار اوراق تاریخوں کے الٹنے پڑے ہونگے....

www.urduchannel.in

"..... یہ کتاب اُردو زبان میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت کہ دتی

اورنگ زیب قاسمی

والوں کو بھی اُس پر رشک آتا ہوگا .... ہمارے لائق مصنف نے اس کا بہت خیال

رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح

اور دلچسپ ہے۔ اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے۔ جو خوبصورت

ہے خوبصورت ہے۔ جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے۔ نہ خوبصورت کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے،

اور نہ بھونڈے پنے کو زیادہ بھونڈا۔ اور درحقیقت یہ کمال تاریخ نویسی ہے"[1]

المامون کا تیسرا ایڈیشن $\frac{۱۸۹۱ء}{۱۳۰۹ھ}$، اور چوتھا $\frac{۱۸۹۲ء}{۱۳۱۰ھ}$ میں چھپا۔ اسکے بعد سے ابتک اسکے

متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ آخری ایڈیشن دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوا ہے۔ دوسرے ایڈیشن پر

شبلی نے کتاب پر نظر ثانی بھی کی اور حکمائے عہد مامون پر کافی اضافہ کیا ہے۔ بعد کی اشاعتوں میں کوئی

اہم یا خاص تبدیلی نہیں ملتی۔

مامون کو شبلی نے کتاب کا ہیرو بنایا ہے۔ عام طور پر ہندوستانی مصنفین کی یہ کمزوری

ہے کہ عیوب سے چشم پوشی کرتے ہیں بلکہ اُن کو بھی ہنر بنا کر دکھاتے ہیں۔ لیکن شبلی کی یہ تاریخی دیانت ہے

کہ انھوں نے مامون کے عیوب کو چھپایا نہیں بلکہ اُن کو برملا ظاہر کر دیا ہے۔ مثلاً امین کے قتل کے بعد جب اُس کا

سر ایک سپر پر رکھ کر مامون کے سامنے پیش کیا گیا تو اس موقع پر مولانا لکھتے ہیں :-

"اس غیر متوقع فتح کی خوشی نے مامون جیسے رقیق القلب شخص کو بھی ایسا سنگ دل بنایا

کہ اُسنے اپنے بھائی کے خون آلود سر کو مسرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور جوش خوشی میں سجدۂ شکر

ادا کیا۔"[2]

مامون کی ایک اور بڑی کمزوری جسنے ملک میں جابجا بغاوت کے شعلے بھڑکا دئے فضل بن سہل

کا حکومت پر تسلط و اقتدار اور اُس پر مامون کا غیر معمولی اعتماد تھا۔ اگرچہ علامہ شبلی نے فضل کے اس انتہائی عمل و دخل کو

قابل اعتراض سمجھا ہے لیکن مامون کی اس کمزوری کے داغ کو وہ کبھی نہ دھو سکے۔ چنانچہ پورے علم اور واقفیت

کے باوجود مامون، فضل کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ اور جب فضل مارا گیا تو بھی اُس کا خوف مامون پر اس درجہ طاری رہا

کہ اُسنے اُن لوگوں کو جنھوں نے اسکے ہی اشارے سے یہ کام کیا تھا سخت سزائیں دیں۔ اور اکثر کو قتل کر دیا۔ خود

---

[1] ن

[2] المامون : نقش چہارم : مطبع مفید عام آگرہ : ص ۶۷

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

ہرثمہ کے ساتھ جو ایک نامور اور مشہور افسر تھا اور جسنے سادات اور علویوں کی بغاوتوں کو ختم کر کے مامون کی سلطنت کو مستحکم کیا تھا، مامون کا سلوک بہت بُرا رہا۔ جب ہرثمہ دربار میں فضل کی سازشوں کا طلسم توڑنے کے لئے آیا تو مامون نے فضل کے اشارے سے اس کو ذلت سے نکلوا دیا۔ اور قید کرنے کا حکم دیا۔ چند روز بعد فضل نے اس کو قتل کر دیا۔

حضرت علی رضا علیہ السلام کو مامون نے اپنا ولی عہد اور جانشین بنایا۔ اس سے جب عباسی خاندان نے اسکی مخالفت کی اور مامون کے خلاف عام شورش بپا ہو گئی اور اس کی حکومت بغداد سے اُٹھ گئی۔ گو بعد میں مامون نے حالات پر قابو پالیا لیکن اس کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکے تھوڑے ہی دنوں کے بعد زہر سے علی رضا کی وفات ہو گئی۔ اسلئے بعض لوگوں کو یہ شبہہ ہوا کہ مامون کے اشارے سے زہر دیا گیا تھا۔ علامہ شبلی نے ابن واضح کاتب عباسی کے حوالہ سے اس جرم کا مجرم علی بن ہشام اموی کو قرار دیا ہے۔ لیکن یہ الزام بہر حال مامون پر قائم رہ جاتا ہے کہ اُسنے اس واقعہ کی تفتیش نہیں کی بلکہ اہل بغداد اور اپنے گروہ والوں سے حضرت علی رضا کی ولی عہدی کی معذرت کی اور یہ بھی تحریر کیا کہ آپ نے وفات پائی۔ "اب تم لوگ بدستور سابق ہمارے دائرہ اطاعت میں آجاؤ۔" [1]

اس موقع پر مولانا شبلی لکھتے ہیں :-

"جب اُن کو زہر دیا گیا اور مامون کو پورا تجربہ ہو گیا کہ جو خاندان ڈیڑھ سو برس [۱۵۰] سے خلافت پر قبضہ کرتا آیا ہے وہ کسی طرح اپنے فرضی حق سے باز نہیں آسکتا۔ تو مجبوراً اُس نے بھی وہی کیا جو اسکے اسلاف کرتے آئے تھے"۔ [2]

دوسرے اڈیشن میں جس باب کے بڑھ جانے کا ذکر سر سید احمد خاں نے اپنے دیباچہ میں کیا ہے دراصل شبلی کے پہلے مضمون "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" کا ایک خلاصہ ہی ہے جس کا اندازہ دونوں کی بعض مشترکہ عبارتوں سے ہوتا ہے :-

مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم	المامون
ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک محترم شخص تخت پر جلوہ فرما ہے۔ مامون نے بڑھ کر پوچھا کہ آپ کون بزرگ ہیں تخت	ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک محترم شخص تخت پر جلوہ فرما ہے۔ مامون نے نزدیک جاکر پوچھا۔ "آپ کا اسم مبارک"

[1] بحوالہ تاریخ ابن خلدون : اُردو ترجمہ حکیم احمد حسین : صـ ۱۲۳
[2] المامون نقش چہارم : صـ ۱۶۹

www.urduchannel.in

مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم	المامون
نشین نے کہا کہ "ارسطو"۔ مامون پھڑک اُٹھا۔ اور عرض کی اے حکیم اچھی کیا چیز ہے۔ خیالی ارسطو نے جواب دیا کہ جسے عقل اچھا کہے۔ دوبارہ مامون نے درخواست کی کہ میرے لئے کچھ نصیحتیں ارشاد ہوں۔ جواب ملا کہ توحید اور صحبت نیک۔ خواب کا اثر ہوا ہو یا نہیں۔ مگر اس واقعہ سے مامون کے شوق اور محویت کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔ غرض سبب کچھ ہو۔ مامون نے قیصر روم کو نامہ لکھا کہ ارسطو کی کل تصانیف بہم پہنچائی جائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خلفاء کے معمولی خطوط قیصر و فغفور پر فرمان کا اثر رکھتے تھے۔ قیصر تعمیل ارشاد کے لئے آمادہ ہوا مگر روم کے اطراف میں فلسفہ خود گمنام ہو چکا تھا۔ بڑی تلاش سے ایک راہب ملا جس نے پتہ دیا کہ یونان میں ایک مکان ہے جو قسطنطین کے زمانے سے مقفل ہے۔ اور جتنے تاجدار تخت نشین ہوتے گئے قفلوں کی تعداد بڑھاتے گئے۔ قسطنطین نے اُس مکان میں اس غرض سے فلسفے کی کتابیں بند کرادی تھیں کہ اگر فلسفہ و حکمت کو آزادی ملی تو دین مسیحی کو سخت صدمے اُٹھانے پڑیں گے۔	تخت نشین نے کہا "ارسطو"۔ مامون پر خاموشی کی ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ پھر عرض کیا کہ حضرت دنیا میں کیا چیز اچھی ہے۔ خیالی ارسطو نے جواب دیا جسکو عقل اچھا کہے۔ دوبارہ مامون نے درخواست کی کہ مجھکو کچھ نصیحت ارشاد ہو۔ جواب ملا کہ توحید اور صحبت نیک ہاتھ سے نہ دینا۔ مامون یوں بھی فلسفہ پر مٹا ہوا تھا۔ ارسطو کی زیارت نے اور بھی آگ پر روغن کا کام دیا۔ اس نے قیصر روم کو خط لکھا کہ ارسطو کی جس قدر تصانیف مل سکیں دارالخلافہ کو روانہ کی جائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بادشاہان اسلام کے معمولی خط قیصر و فغفور پر فرمان کا اثر رکھتے تھے۔ قیصر تعمیل ارشاد پر مستعد ہوا مگر روم کے اطراف میں فلسفہ خود گمنام ہو چکا تھا۔ بڑی تلاش سے ایک راہب ملا جس نے پتہ دیا کہ یونان میں ایک مکان ہے جو قسطنطین کے زمانے سے مقفل ہے اور جتنے تاجدار اسکے بعد تخت نشین ہوئے قفلوں کی تعداد بڑھاتے گئے۔ قسطنطین نے فلسفہ کی تمام کتابیں ہر جگہ سے جمع کرکے اس مکان میں بند کرادی تھیں کہ اگر فلسفہ و حکمت کو آزادی ملی تو دین عیسوی کو سخت صدمے اٹھانے پڑیں گے۔

شبلی کی مستقل تصانیف میں المامون پہلی کتاب ہے جسمیں انھوں نے مسلمان سلاطین کے علمی کارناموں کو دکھایا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اس تلاش و تحقیق اور اس اسلوب سے اسکو پیش کیا ہے کہ مامون کی علمی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

المامون کے اسلوب تحریر کے متعلق سرسید نے نہایت عمدہ بات کہی ہے۔ چونکہ شبلی کے اسلوب انشاء پردازی پر ہمیں آگے چل کر مفصل تبصرہ کرنا ہے اسلئے سردست اسے یہاں نظر انداز کیا ہے۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

سیرۃ النعمان

۱۸۹۱ء
۱۳۰۹ھ

علی گڑھ کا اثر

شبلی مذہبی آدمی تھے۔ چنانچہ ان کی ابتدائی تصانیف "ظل الغمام" اور "اسکات المعتدی" اس کی شاہد ہیں کہ اگر وہ علی گڑھ نہ آئے ہوتے تو ان کی تصانیف کا کیا رخ ہوتا۔

راقم کا خیال ہے کہ مولانا کا رنگ ہمیشہ قائم رہا البتہ علی گڑھ کے قیام اور زمانے کے مذاق کے اثر سے صرف ان کی شکل بدل گئی تھی۔ اسکی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اس زمانے میں مذہبی بحث و مناظرہ کے تین میدان تھے۔ عیسائی، شیعہ اور اہل حدیث۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو "الکلام"، "علم الکلام"، الفاروق اور سیرۃ النعمان انہیں تینوں مباحث کی بدلی ہوئی اور شائستہ شکلیں ہیں۔ علم کلام کی کتابیں عیسائیوں کے جواب میں، الفاروق شیعوں کے جواب میں اور سیرۃ النعمان اہل حدیث کے مقابلہ میں) خود شبلی نے ان الفاظ میں علی گڑھ کے اثرات کا اعتراف کیا ہے:-

"..... حضرات جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں اگر وہ کوئی پرسنل اور ذاتی معاملہ ہے تو آپ مہربانی سے ذاتی معاملہ کی نسبت بھی مجکو اجازت دیجئے کہ میں اسکو اس عام مجمع میں علانیہ ظاہر کردوں۔ یعنی کالج کے احسانات جو مجھ پر ہیں۔

حضرات! یہ سچ ہے اور بالکل سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار پا سکتا ہے تو اس کا آغاز، اسکی نشو و نما، اسکی ترقی، اسکی نمود، اسکا امتیاز جو کچھ ہوا ہے اسی کالج سے ہوا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہاں آنے سے پہلے میں نے تصنیف کے دائرے میں قدم نہیں رکھا تھا۔ یہ سچ ہے کہ آج سے بہت پہلے میری دو کتابیں چھپ چکی تھیں اور شائع ہو چکی تھیں لیکن ان کا کیا مقصد تھا، آپس کے مذہبی جھگڑے، مسلمانوں کی جماعت کو منتشر کرنا، اور جو انتشار پہلے سے موجود تھا، اسکو اور قوت استحکام دینا۔ میں آج سے بہت پہلے فارسی میں شعر بھی کہا کرتا تھا لیکن وہ کس قسم اور کس درجہ کے تھے۔ آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں اپنی موجودہ شاعری کو اعلیٰ رتبہ کی خیال کرتا ہوں۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ آج کی میری شاعری اگر پست ہے تو پہلے پست تر تھی۔ اور اب اگر خراب ہے تو

www.urduchannel.in

پہلے خراب تر تھی۔ غرض میں نے یہ جو کچھ سیکھا ہے اور جو کچھ ترقی کی ہے وہ اسی کالج کی بدولت

اورنگ زیب قاسمی

ہے اسی لحاظ سے میں جسطرح اس کالج کا پروفیسر ہوں اسی طرح اس کا ایک تربیت یافتہ شاگرد بھی ہوں ....."[1]

المامون کے بعد مولانا نے "الفاروق" لکھنی شروع کی جیسا کہ انہوں نے المامون کے شروع میں لکھا ہے :-

"....... امید ہے کہ اس سلسلے کے باقی حصے خصوصاً الفاروق یعنی حضرت عمرؓ کی تاریخ خلافت جسکی تالیف میں آجکل مشغول ہوں زیادہ جامع اور زیادہ مرتب ہو کر نکلے...."[2]

اور ایک معتدبہ حصہ لکھ بھی لیا تھا کہ بعض موانع کی بنیاد پر کچھ عرصہ کے لئے اس سے ہاتھ اٹھا لینا پڑا۔

سیرۃ النعمان کی ضرورت اور اسکی تجویز کا زمانہ

جسطرح مولانا کو "رائل ہیروز آف اسلام" کا خیال پیدا ہوا تھا اسی طرح وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ علوم و فنون کے بھی جدا جدا خاندان قائم کئے جائیں۔ اور جو لوگ ان خاص فنوں میں یکتائے روزگار ہوئے ہیں ان کو اس سلسلے کا ہیرو قرار دیا جائے۔ اس بنا پر ان خاندانوں کی طرف توجہ کی اور سب سے "فقہ" کو لیا۔ اور حضرت امام ابو حنیفہ کو اس کا ہیرو قرار دیا۔[3] پھر ان کی سوانحعمری لکھنا شروع کی اور پہلے حصہ کو ۱۱ نومبر ۱۸۸۹ء سے قبل ختم ہی کر ڈالا۔[4] دوسرا حصہ ۱۸۹۰ء میں شروع ہو کر ستمبر ۱۸۹۱ء سے پہلے ختم ہوا اور شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ جیسا کہ مختلف خطوط کے اقتباسات سے جو درج ذیل ہیں ظاہر ہوتا ہے :-

"امام ابو حنیفہ کی سوانحعمری کا پہلا حصہ جو قریباً ایک سو چالیس صفحے میں ہے ختم ہو گیا ہے .... آمدم برسر مطلب، حصہ دوم کے لئے جو کتابیں درکار ہیں ان میں سے چند کتابیں ...... روانہ فرمائیے"[5]

"سیرۃ النعمان" لائف ابو حنیفہؒ بالکل تیار ہے۔ اخیر دسمبر میں انشاءاللہ مطبع سے شائع ہو گی۔ تین سو صفحوں کی کتاب ہے......."[6]

"...... سیرۃ نعمان کب کی ہو چکی۔ دوسری بار چھپ رہی ہے"[7]

---

[1] انسٹیٹیوٹ گزٹ : ۶ فروری ۱۸۹۲ء : ص ۱۷۱
[2] المامون : ص ۱ : مطبع مفید عام
[3] سیرۃ النعمان : ص ۳ : مطبع معارف
[4] مکاتیب : جلد اول طبع دوم : ص ۸۶
[5] مکاتیب : جلد اول : ص ۸۱
[6] مکاتیب : جلد اول : ص ۸۲
[7] " : " : ص ۹۰

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

ترتیب و تقسیم "المامون" کی طرح اس کتاب کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں امام ابو حنیفہ رح کا نام، نسب، ولادت، وسن رشد، تعلیم و تربیت، شیوخ حدیث، درس و افتا، بقیہ زندگی اور دربار کے تعلقات، وفات، عام اخلاق و عادات، مناظرات و فتاوے، ذہانت و طباعی کے واقعات اور اسی قسم کے حالات مبسوط اور مفصل ملتے ہیں۔ دوسرے حصہ میں امام صاحب کے علمی و ذہنی کمالات، مختلف فنون میں ان کی مہارت کی تفصیل ہے۔ دراصل یہی حصہ امام صاحب کی عظمت کا مرقع ہے۔ اس میں ان کے جملہ علمی کمالات خصوصاً متکلمانہ و محدثانہ حیثیت اور اُن کے تفقہ پر نہایت تفصیل سے بحث کرکے دکھایا ہے کہ ان علوم میں اُن کا کیا درجہ تھا۔ امام ابو حنیفہ اور فقہ حنفی پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ امام صاحب کی نظر احادیث پر محدود تھی۔ اور فقہ حنفی کی بنیاد حدیث کے بجائے زیادہ تر قیاس پر ہے۔ شبلی نے دلائل سے اسکی پرزور تردید کی ہے۔ اور دوسرے ائمہ کے مقابلہ میں فقہ حنفی کی خصوصیات، ان کی وسعت و جامعیت کو ثابت کیا ہے اور دکھایا ہے کہ امام صاحب کی قلت روایت حدیث میں ان کے مقتدر علم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان شرائط کا نتیجہ ہے جو امام صاحب کے نزدیک صحت حدیث کے لئے ضروری تھے۔ اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

ماخذات اگرچہ امام ابو حنیفہ کی سیرت پر بکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں جن کا ذکر شبلی نے ایک فہرست میں جو کشف الظنون سے ماخوذ ہے کیا ہے لیکن ان میں سے ساری کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ علامہ شبلی کا سب سے بڑا ماخذ جیسا کہ خود انھوں نے لکھا ہے حافظ ابو الحسن محمد بن یوسف دمشقی کی مناقب النعمان ہے۔ اسکے علاوہ حافظ ابن حجر کی "الخیرات الحسان فی مناقب النعمان" اور بہت سے ماخذوں سے جسکی تفصیل آئندہ سطور میں آتی ہے استفادہ کیا ہے۔ لیکن سب سے بڑا ماخذ پہلی کتاب ہے۔ اسکے مصنف حافظ ابو الحسن، امام جلال الدین سیوطی کے شاگرد تھے۔ اور فن حدیث میں بڑا پایہ رکھتے تھے۔ "المامون" کے بعد یکایک ابو حنیفہ کی سیرۃ کیطرف متوجہ ہونا بعض لوگوں کو تعجب میں ڈالے گا، لیکن شبلی نے اس حیرت و استعجاب کو خود دور کیا ہے۔ ناموران اسلام کا سلسلہ شروع کرتے وقت یہ چیز اُن کے ذہن میں تھی کہ اسلام میں "سیف" کے ساتھ "قلم" بھی رہا ہے۔ چنانچہ بعض ناموران اسلام اگرچہ صاحب سیف و تخت نہیں تھے لیکن علم و فضل میں انھیں وہ مرتبہ حاصل تھا جو اکثر بڑے سلاطین کو اپنی حکومت میں بھی میسر نہیں ہوتا۔ اسلئے وہ چاہتے تھے کہ ان علمی ناموروں اسلام کا ایک علیحدہ سلسلہ لکھا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے سیرۃ النعمان کے علاوہ اور کتابیں بھی لکھیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

www.urduchannel.in

امام ابوحنیفہ کی مستقل سوانح عمریوں کے علاوہ رجال و تاریخ کی اور جن کتابوں سے استفادہ

اورنگ زیب قاسمی

کیا جا سکتا تھا ان سے بھی فائدہ اُٹھایا ہے چنانچہ سیرۃ النعمان کے حصۂ اول میں حسب ذیل کتابوں کے حوالے ملتے ہیں۔

(۱) تاریخ صغیر، امام بخاری (۲) معارف ابن قتیبہ (۳) مختصر تاریخ بغداد خطیب (۴) کتاب الانساب۔ سمعانی (۵) تہذیب الاسماء و اللغات۔ نووی (۶) تذکرۃ الحفاظ۔ علامہ ذہبی (۷) دول الاسلام۔ ذہبی (۸) عبر فی اخبار من غبر۔ ذہبی (۹) تہذیب التہذیب۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (۱۰) خلاصۃ الذہیب تہذیب الکمال للعلامہ صفی الدین الخزرجی قابل ذکر ہیں۔ اور ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں ہیں۔

دوسرے حصے میں چونکہ امام صاحب کے علمی کمالات تفقہ و اجتہادات وغیرہ کی بحث ہے اسلئے اس میں تاریخ و تذکرہ کے بجائے زیادہ تر حدیث و فقہ و علم کلام کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس حصے کے مباحث سے امام ابوحنیفہ کی علمی صلابت و عظمت کے ساتھ مصنف کی بھی دقت نظر و نکتہ سنجی کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی تنہا تاریخ ہی کے میدان کے مرد نہ تھے بلکہ مذہبی علوم پر بھی اُن کی نگاہ کتنی گہری تھی لیکن اسکی تفصیل سے یہاں بحث نہیں۔

اُردو سوانح عمریوں میں سیرۃ النعمان کا درجہ

مذہبی لٹریچر، یا مذہبی سوانح عمریوں کی اُردو میں کمی نہیں۔ زبان اُردو صوفیائے کرام ہی کی کوششوں سے پروان چڑھی۔ اور اُن کی بدولت اس میں ابتدا سے مذہبی لٹریچر آنے لگا۔ اس کا مختصر حال ہم تمہید میں لکھ چکے ہیں۔ لیکن یہ لٹریچر کوئی دقیق مذہبی لٹریچر نہ تھا بلکہ زیادہ تر عام لوگوں کی مذہبی واقفیت کی فقہی مسائل کی سیدھی سادھی کتابیں تھیں۔ یا مذہبی مسائل پر معمولی رسائل تھے۔ یا صوفیائے کرام کے ارشادات و ملفوظات اور اس قسم کی دوسری کتابیں تھیں جسطرح اُردو میں تاریخ فلسفہ کی چاشنی سے نا آشنا تھی اسیطرح فقہ و حدیث و تفسیر کی علمی اور فلسفیانہ بحثیں بھی اُردو میں نہ تھیں۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ فارسی علمی اور ادبی زبان تھی اسلئے علماء یا عربی میں لکھتے تھے یا فارسی میں۔ البتہ مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کیساتھ جب عربی فارسی پر بھی زوال آیا اور اُردو نے اسکی جگہ لی اسوقت علماء کو بھی اس زبان کو اختیار کرنا پڑا۔ مولانا شبلی کی تصنیف اس رجحان کی آئینہ دار ہے۔

کتاب کا انداز

امام ابوحنیفہ کی عظمت ثابت کرنے کے لئے کتاب کا پہلا حصّہ کافی تھا لیکن ان کے علمی کمالات اور تفقہ و اجتہاد سے دوسرے حصّہ میں بحث کی گئی ہے اسلئے دراصل یہی حصّہ کتاب کی جان ہے۔ اور اسی سے امام صاحب کی حقیقی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شبلی کی پہلی تصنیف کی طرح اس سے بھی انکی

www.urduchannel.in

وسعت مطالعہ، دقت نظر، تلاش و تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ مطالعہ سے مواد جمع کر لینا آسان ہے لیکن اسکو سلیقہ سے ترتیب دینا اور اسباب و علل کا سلسلہ قائم رکھنا اور نظم و ترتیب کے ساتھ پیش کرنا آسان کام نہیں۔ شبلی کو خود اس دقت کا احساس تھا۔ اس دوسرے حصے کی علمی مباحث کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ علماء ہی کر سکتے ہیں اور عام لوگ اس سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

اورنگ زیب قاسمی

سفرنامۂ روم و مصر و شام

(۱۸۹۴ء / ۱۳۱۲ھ)

سفر کی ضرورت اور مقاصد

"الفاروق" کے لئے مسالہ و مواد اکٹھا کرنے کے سلسلے میں مولانا کو خیال پیدا ہوا کہ انھیں اسلامی ممالک کا سفر کر کے وہاں کے کتب خانوں کو دیکھنا چاہئے۔ چنانچہ مئی ۱۸۹۱ء میں وہ اپنے اس علمی سفر پر روانہ ہونے کے لئے تیار تھے جیسا کہ سطور ذیل سے معلوم ہوتا ہے:۔

"...... ماہ مئی تک انشاء اللہ یہ کتابیں فارغ ہو جائیں گی اور اسی مہینے میں قسطنطنیہ روانہ ہو جاؤنگا۔ جسکے تمام سامان ہو گئے ہیں اور اسوقت تک باقی بھی ہو جائیں گے۔ وہاں سے آکر "الفاروق" لکھنا شروع کرونگا۔"[1]

مگر پھر نہ جانے کن وجوہ کی بنا پر انھیں اپنا یہ ارادہ کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دینا پڑا اور وہ اس سال نہ جا سکے۔ آخر اپریل ۱۸۹۲ء کو وہ پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ اس سفر پر روانہ ہوئے۔[2]

سفرنامے کی اشاعت کا خیال

قسطنطنیہ کے دوران قیام میں ہی مولانا نے سفرنامہ لکھنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مگر واپسی پر اس خیال کو انھوں نے اپنے دل سے نکال دیا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ جو کچھ اور جسطرح لکھنا چاہتے تھے وہ بعضوں کے نزدیک خلاف مصلحت تھا۔ مگر لوگوں کے پیہم اصرار سے مجبور ہو کر اور مقتضائے زمانہ کا خیال رکھتے ہوئے ۱۸۹۳ء / ۱۳۱۱ھ میں اسکی ترتیب میں مشغول ہوئے۔ ۲۷ اکتوبر ۱۸۹۴ء سے پہلے

---

[1] مکاتیب شبلی : جلد اول : طبع دوم : ص ۸۱
[2] " : " : " : ص ۳
[3] " : " : " : ص ۹۲

www.urduchannel.in

یہ کتاب مفید عام پریس آگرہ سے چھپ کر شائع ہو گئی جیسا کہ ۲۷ اکتوبر ۱۸۹۴ء کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے :-

اورنگ زیب قاسمی

"جناب من ! سفرنامہ میرے یہاں سے ملتا ہے مگر میں آجکل سفر میں تھا اب علی گڑھ پہنچا ہوں لیکن سر دست اسکی جلدیں یہاں نہیں رہیں۔ آگرہ کو لکھا ہے۔ کتابیں آئیں گی۔ فوراً تعمیل ہو گی۔" [1]

دیباچہ میں مولانا تحریر فرماتے ہیں :-

"سفرنامے میں جس قسم کی اطلاعیں لازمی اور ضروری ہیں یعنی ملک کی اجمالی حالت، انتظام کا طریقہ، عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیت، عمارتوں کے نقشے، اس میں سے ایک چیز بھی اس سفرنامے میں نہیں۔" [2]

مہدی الافادی مرحوم کو مولانا سے "لٹریری نقصان" کی جو شکایت پیدا ہوئی اور جسے انھوں نے مولانا کی "فروگذاشت" سے تعبیر کیا ہے اسکی وجہ سفرنامے میں انھیں بحث طلب امور کا چھوڑ جانا ہے جس کو مولانا نے عمداً اور قصداً قلم انداز کر دیا ہے۔ اور جسکے متعلق اعترافاً خود تحریر فرماتے ہیں :-

"میں نے اگرچہ اس کتاب میں ترکوں کی تمدنی یا ملکی حالت سے کچھ بحث نہیں کی ہے اور نہ اس قسم کی بحث میرے منصب وحالت کے لحاظ سے مناسب تھی، تاہم اس کتاب کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں ترکوں کی تہذیب وشائستگی کا جو درجہ قائم ہوگا۔ وہ اس سے مختلف جو یورپ کے عام لٹریچر سے ظاہر ہوتا ہے۔" [3]

مہدی الافادی مرحوم نے اپنے مخصوص اور دلنشیں انداز میں سفرنامے پر یوں اظہار خیال کیا ہے :-

"ہندوستان کا مشہور اور فاضل مورخ بھی ہم کو اس حیثیت سے (کہ ٹرکش سوسائٹی اور اُسکے نظامات زندگی کے متعلق مخلصانہ اظہار خیال کا کوئی ذریعہ ہاتھ آتا) بے نیاز نہ کر سکا۔ سفرنامہ ٹرکی میں وہ امور نہیں دکھائے گئے جن کو وہ خود متقدمین کی تالیفات میں ڈھونڈھتا ہے۔ گویا اسکی مورخانہ عظمت کی تکمیل کے لئے ہندوستان سے باہر کا لے کوسوں محض قسطنطنیہ کا انتخاب کافی تھا۔"

---

[1] مکاتیب شبلی : جلد دوم : طبع دوم : ص ۱۹۷

[2] دیباچہ سفرنامہ : ص ۲

[3] سفرنامہ روم ومصر وشام : طبع معارف : ص ۳

www.urduchannel.in

سفرنامے کی اہمیت

اگر چہ شبلی کی تصانیف میں "سفرنامے" کی کوئی بڑی اہمیت نہیں۔ لیکن ان کے بعض نظریوں کو سمجھنے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ اس سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی تاریخ اور سوانح عمریاں لکھ کر نہ صرف اسلاف کو زندہ کرنا چاہتے تھے بلکہ اپنی مثال سے اخلاف میں بھی ذوق و شوق پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے باوجود سفر کی ان دقتوں کے جو قدیم زمانے میں تھیں اور جن کو موجودہ دور کی ایجادات نے بڑی حد تک دور کر دیا ہے تمام دنیا کا سفر خالص علمی اور تحقیقی ذوق کے لئے اختیار کیا۔ اس قسم کے سیاحوں کے سفرناموں میں ابن بطوطہ، ابن حوقل، بشاری مقدسی، اصطخری اور بہت سے نام نظر آتے ہیں۔ شبلی نے خود بھی سفرنامے میں اس کا ایک موقع پر ذکر کیا ہے۔ اور اظہار افسوس کیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی اس قدیم روش کو یک سر ترک کر دیا ہے۔ شبلی کے اس سفر کی یہ اہمیت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ہندوستان میں پرانی وضع کے لوگوں میں ہندوستان سے باہر محض علمی اور تحقیقی ذوق کے باعث سفر کرنے کی یہ پہلی مثال ہے۔ جسطرح شبلی کا سفر تفریحی سیاحت سے مختلف ہے اسی طرح ان کا "سفرنامہ" عام سفرناموں سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ دراصل یہ سفرنامہ ممالک اسلامیہ کی علمی، تعلیمی اور معاشرتی حالت کا جائزہ اور اُن کے نوادر علمی کی ایک مختصر فہرست ہے۔ شبلی نے خود مقاصد سفر میں کتب خانوں کی سیر اور ممالک اسلامی میں تعلیمی حالت کا اندازہ کرکے دو خاص مقصد بیان کئے ہیں:-

سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں مسلمانوں کا کتنا درد تھا۔ اور اسکی زبوں حالی اور بدبختی کا اثر کتنا اثر تھا۔ سمائی قوم کے ملاحوں کی متبذل حالت و حرکات کو دیکھکر اس غلط فہمی میں کہ وہ عرب ہیں اُن کی جو حالت ہوئی اسکو وہ خود لکھتے ہیں:-

> ان خیالات سے بے اختیار میرا دل بھر آیا۔ یہاں تک کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور بے اختیار زبان سے نکلا "قمر یا عمرؓ" [1]

اسی طرح جب مصر پہونچے اور دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی "جامعہ ازہر" کو دیکھا کہ وہاں کے طالب علم فقیروں کی طرح روٹیاں لینے کے لئے صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں اور ہاتھ پھیلا کر روٹی لینے میں انھیں کچھ عار نہیں تو انھیں بڑی ندامت ہوتی ہے۔ یا جہاں جہاں کوئی اچھی دوکان اور عالی شان مکان نظر آیا اور یہ معلوم ہوا کہ یہ کسی غیر مسلم کا ہے اور مسلمانوں کی حالت خراب و خستہ ہے تو نہایت درجہ غمگین ہوئے۔ خود قسطنطنیہ

---

[1] سفرنامہ روم : ص ۳

www.urduchannel.in

کے دو حصّوں کا حال علیحدہ علیحدہ لکھا ہے۔ ایک حصہ جس میں غیر ملکیوں کی آبادی ہے نہایت صاف ستھرا شہر ہے۔ یہ وہی حصّہ ہے جس کا ذکر ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں کیا ہے اور اسکی گندگی کی شکایت کی ہے۔ اصل شہر جس کی ابن بطوطہ نے تعریف کی ہے اس کا حال اب پہلے کے بالکل برعکس ہے۔ اور وہ نہایت ناصاف، ناہموار اور گنجان ہے۔ شبلی نے اس پر حیرت اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔ پورے سفر نامے میں قدم قدم پر مسلمانوں سے محبت کا صاف اظہار ہوتا ہے۔ یہاں شبلی کے سفر کے پورے نتائج کا احاطہ کرنا بہت دشوار ہے۔ اسلئے صرف چند مباحث لئے گئے ہیں

اورنگ زیب قاسمی

تعلیمی تحقیق

سائپرس (قبرس) پہونچے تو سب سے پہلے جامع مسجد میں گئے جہاں ایک مکتب بھی تھا۔ مکتب میں مدرس سے ملاقات اور تعلیم کا مختصر حال بیان کیا ہے۔ اصل تفصیل قسطنطنیہ کی تعلیمی حالت کی ہے اس سلسلے میں انھوں نے حسب ذیل امور کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے:۔

تعلیم کے مختلف طریقے۔ ابتدائی تعلیم۔ رشدیہ۔ اعدادیہ، سلطان حال کے زمانے کی تعلیمی ترقی، تعلیم کے سالانہ مصارف، مشہور کالجوں اور اسکولوں کی فہرست اور ان میں پڑھائے جانے والے مضامین کا تذکرہ۔ طریق تعلیم کے متعلق قابل لحاظ امور، فرنچ زبان کا لازمی ہونا۔ سائنس اور فنون کی تعلیم، تاریخ کی اعلیٰ تعلیم، علوم جدیدہ کی تعلیم ترکی زبان میں، بورڈنگ کا طریقہ، طالب علموں کا لباس، بورڈروں کی معاشرت، قدیم تعلیم میں بعض چیزوں کی کمی، مکتبہ حربیہ کا تفصیلی حال، تعلیم کی متعدد شاخیں، ارکان حربیہ، پروفیسر اور ٹیچروں کی تعداد، مکتب سلطانی، اس کا صرف، مکتب کا دستور العمل، مکتبہ ملکیہ، طالب علموں کی تعداد، قدیم تعلیم اور مدارس قدیمہ، طالب علموں کی تعداد، اُن کی بسراوقات کا طریقہ، بورڈنگ، نصاب تعلیم، ترکوں کی علمی حالت، ترکی زبان میں کتابوں کا ترجمہ، ترکی میں تاریخی تصنیفات، بیوگرافی یعنی رجال و تراجم، قاموس الاعلام (انسائیکلوپیڈیا) ترکی کی تصنیفات کی کثرت، ترکی لٹریچر، ترک مصنفین، ترکی اخبار اور رسالے، اخبار کے آزاد نہ ہونے کا سبب، کتابوں کے چھپنے میں روک ٹوک، چھاپے خانے، کتب خانے، کتب خانوں اور کتابوں کی تعداد، کتب خانوں کے لئے اوقات، کتابوں کی ظاہری حالت، اوقات کا انتظام، کتب خانوں کی بعض خصوصیات، نسخوں کی عمدگی اور صحت، خط کی عمدگی اور زرافشانی، تاریخ اور ادب کی نایاب تصنیفات، حکماء اور آئمہ فن کی تصنیفات، کتب خانوں سے وہاں کے باشندوں کا متمتع ہونا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی نے اپنے سفر کا اصل مقصد حاصل کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اور اسمیں وہ کامیاب ہوئے۔ ترکی کی تعلیم کے اس جائزے سے اسوقت کی تعلیمی حالت کا مکمل اندازہ ہوجاتا ہے،

www.urduchannel.in

ایسے علمی اور تحقیقی جائزے سے بالخصوص جب دوسرے ممالک کے تعلیمی طریقے اور دار العلوم بھی نظر کے سامنے ہوں بڑا

اورنگ زیب قاسمی

فائدہ ہوسکتا ہے۔ آگے چل کر مولانا نے اپنے تجربات سے جو نتائج حاصل کئے تھے اُسے ندوہ کی صورت میں جلوہ گر کیا۔

کتب خانوں اور کتابوں کی سیر

شبلی کو علی گڑھ جانے کے بعد ایسی تصانیف کا پتہ لگا جن سے ہندوستان کے تحقیقی کام کرنے والے بالکل بے خبر تھے۔ چنانچہ اپنے پہلے مضمون "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" میں انھوں نے "کشف الظنون" کے حوالے سے ایسی بہ کثرت تصانیف کا ذکر کیا ہے جن کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس سفر سے اُن کی یہ آرزو پوری ہوئی۔ اور انھیں کتابوں کے نادر نسخوں کے دیکھنے اور اُن پر نوٹ لینے کا موقع ملا۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ :-

"تمام اسلامی دنیا میں قسطنطنیہ عربی تصنیفات کا سب سے بڑا مرکز ہے"۔

شبلی نے ۴۵ کتب خانوں کا ذکر کیا ہے جن میں کل ۸۵ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ کتب خانے بالعموم امراء، سلاطین اور اہل دول کے وقف کئے ہوئے ہیں جن سے اُن لوگوں کے مذاق علمی، تلاش اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتب خانوں کی ظاہری حالت بہت اچھی نہیں۔ لیکن ان میں نادر کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا۔ عبد القاہر الجرجانی کی "اسرار البلاغت" کا ہندوستان میں بڑی تلاش سے صرف ایک نسخہ ملا جو بالکل غلط تھا۔ قسطنطنیہ میں اسکے متعدد صحیح اور قدیم نسخے نظر میں آئے۔ اسی طرح کتاب البیان والتبیین جاحظ، تذکرہ ابن حمدون، معجم الادباء یاقوت حموی، کتاب انساب الاشراف للبلاذری، تاریخ کبیر امام بخاری کے نہایت صحیح اور مستند نسخے ملے۔ شبلی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ مشہور حکماء اور ائمۂ فن کی کتابیں جس کثرت سے یہاں موجود ہیں اور کہیں نہیں مل سکتیں۔ چنانچہ امام غزالی۔ بوعلی سینا، فخر الدین رازی، اور فارابی کی نایاب کتابیں وہاں موجود ہیں۔ ابن سینا کی نایاب کتاب حکمت مشرقیہ کا نسخہ بھی یورپ کے محققین جسکو تلاش کرکے نا اُمید ہو چکے تھے وہاں موجود تھا۔ تاریخ اور ادب کی نایاب کتابوں کی ایک فہرست علٰحدہ دی گئی ہے لیکن شبلی نے اس پر بہت اظہار افسوس کیا ہے کہ خود یہاں کے لوگ معمولی مباحث اور مسائل سے آگے نہیں بڑھتے۔ اور ان علمی ذخیروں سے انھیں خود کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ قسطنطنیہ کے علاوہ بیروت کی علمی ترقی اور مدارس کا بھی مختصر ذکر کیا ہے اور بعض مدرسوں کی تفصیلی حالت بھی لکھی ہے۔

---

www.urduchannel.in

الفاروق

اورنگ زیب قاسمی

(۱۸۹۸ء / ۱۳۱۶ھ)

الفاروق کی اہمیت

اگرچہ مولانا نے رائل ہیروز آف اسلام کے سلسلے میں جن مختلف خاندانوں کے ممتاز ترین افراد کا انتخاب کیا تھا اُن میں خلفائے راشدین میں سے حضرت عمرؓ خلیفہ دوم کو ترتیب میں سرفہرست رکھا تھا لیکن خاندان عباسیہ کے ہیرو مامون الرشید کے سوانح حیات اور انکے کارنامے "المامون" کے نام سے سب سے پہلے اُن کے قلم سے نکلے۔ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں مولانا تاریخ بنی عباس کے سلسلے میں کام کر رہے تھے۔ اسلئے مامون الرشید کے حالات اور ان کے عہد کی ترقیوں پر لکھنا نسبتاً زیادہ آسان معلوم ہوا ہوگا۔ برخلاف اسکے حضرت عمرؓ کے حالات زندگی اور ان کے عہد کی ترقیوں کو ضبط تحریر میں لانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ فاروق اعظم رضؓ کے سوانح نگار کو اپنے فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جن دقتوں اور نزاکتوں کا سامنا کرنا پڑتا اُسے مولانا نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔ ایم مہدی حسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"میں آجکل "الفاروق" لکھ رہا ہوں۔ طبری کی باقی جلدیں آگئیں۔ اب کوئی حالت منتظرہ نہیں رہی۔ البتہ زور قلم اور مساعدتِ وقت درکار ہے۔ دعا فرمائیے کہ اس پُل صراط سے زندہ و سلامت اُتروں۔ حضرت عمرؓ کی لائف ہے

"رہ بردم تیغ است قلم را" [1]

الفاروق سے پہلے اس موضوع پر ایک اور تصنیف

مسالا اور مواد (بہتر)

"الفاروق" کے سلسلے میں مسالہ و مواد فراہم کرنے کے سلسلے میں اگرچہ مولانا قسطنطنیہ کا سفر کر چکے تھے لیکن وہ ابھی تک تکمیل کو نہ پہونچی تھی کہ منشی سراج الدین نے "الفاروق"* لکھ کر شائع کر دی۔ مولانا اس سے بہت بددل ہوئے اور اس تالیف کا خیال قریب قریب چھوڑ دیا تھا[2] لیکن لوگوں کے پیہم اصرار سے مجبور ہو کر پھر آمادہ کار ہوئے۔ منشی سراج الدین کی اس نازیبا حرکت پر بانی مدرسۃ العلوم نے مارچ ۱۸۹۲ء میں ایک لمبا چوڑا مضمون شائع کیا :-

"اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف

---

[1] مکاتیب شبلی : جلد دوم : صـ ۱۹۶
[2] دیکھو دیباچہ الفاروق (جسمیں غالباً اسی طرف اشارہ ہے)
* سراج الدین کی کتاب کا نام "سیرۃ الفاروق" تھا۔

www.urduchannel.in

سے ملک کو بہت فائدہ پہونچایا ہے ۔ المامون، سیرۃ النعمان، کتب خانۂ اسکندریہ، اور الجزیہ بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں ۔ اور اگر نعوذ باللہ وہ اپنے رسالے الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہیں "فاتوا بسورۃ من مثلہ" تو کچھ تعجب نہ ہوگا ۔ جزیہ کا ایسا بیجا اور غلط الزام اسلام پر تھا جس کا آجتک کسی نے اس عمدگی سے حل نہیں کیا۔ "اُجرۃ الا اللہ" ۔ باینہمہ انہوں نے مثل علمائے متقدمین خدا الذین "لا ینظرون الی الدنیا وحطامہا بل ینظرون الی رحمۃ اللہ وبرکاتہا او الی حالۃ القوم واصلاحہا" کوئی ذاتی فائدہ ان کتابوں کی تصنیف سے نہیں اٹھانا چاہا ۔ بلکہ بالکلیہ مدرسۃ العلوم کو دیدیا ۔ اور جب ان کی حالت معاش پر نظر کی جاوے تو ان کی یہ فیاضی بہت زیادہ اور اعلیٰ درجہ کی باوقعت ہوجاتی ہے ۔ "ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء" اور جب ایسے شخص کو جو کیا بحیثیت علم اور کیا بلحاظ عمدگی تالیف اور کیا بنظر طریقۂ ترتیب مضامین یادگار سلف ہے ۔ الفاروق لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور بہت کچھ اس کا سامان بھی جمع کیا تھا جس کا جمع کرنا نہ آسان کام ہے نہ ہر ایک شخص کا کام ۔ اور ہنوز بہت کچھ جمع کرنا باقی ہے تو ہمارے دوست منشی سراج الدین صاحب کو بلاشبہ مناسب تھا کہ اُسی مضمون پر کتاب لکھ ڈالتے ۔ بلکہ اُسی رحمت کے منتظر رہتے جو خدا کو مولوی شبلی سے ملک کو پہنچانی تھی ۔ ہیروز آف اسلام میں حضرت عمرؓ کی لائف کا لکھنا ایک بہت نازک کام ہے ۔ ممکن ہے ان کی لائف اس طرح پر لکھی جائے جو انسان کے لئے باعث رحمت ہو ۔ یا اس طرح لکھی جائے جو باعث آفت ہو ۔ یا اس طرح لکھی جائے کہ دونوں فریق شیعہ اور سُنّی کے بجز گمراہی کے اور کچھ حاصل نہ ہو ۔ سب سے مقدم بات یہ ہے کہ اول اُس کا لکھنے والا شیعہ اور سُنّی دونوں مذہبوں کی قید سے اپنے تئیں آزاد سمجھے ۔ اور سچا ہسٹورین بن کر اُن کی لائف لکھے یا یہ کرے کہ ان امور کو جو دونوں فریق میں متنازعہ فیہ ہیں مطلق نہ چھیڑے ۔ اور اُن واقعات وحالات کو اور اُن کی اس خصلت کو، قوت کو اور اس برکت کو جو ان کے زمانۂ خلافت میں اسلامی دنیا میں پہنچی جن سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا ۔ مشکل یہ ہے کہ کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں ہے کہ اسکے ہر ایک فعل کو دو پہلو نیک اور بد سے تعبیر نہ کیا جائے ۔ یہ مشکل اسوقت اور زیادہ ہوتی ہے جبکہ کسی اکابر دین کی جیسے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں ۔ لائف لکھی جائے ۔ پس

اورنگ زیب قاسمی

MUSLIM UNIVERSITY LIBRARY ALIGARH
T. 56

www.urduchannel.in

حضرت عمرؓ کی لائف لکھنا ایسا آسان کام نہ تھا جیسا کہ ہمارے دوست منشی سراج الدین صاحب نے سمجھا۔ مگر ہم کو افسوس ہوتا ہے جبکہ اُن کی نسبت کوئی الزام بددیانتی کا دیا جاتا ہے منشی سراج الدین صاحب ایک نیک آدمی ہیں۔ قومی بھلائی کا وہ خیال ظاہر کرتے ہیں بیشک ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے غلطی کی۔ جو کام اُن کو نہ کرنا چاہیئے تھا انہوں نے کیا۔ بلکہ وہ کام انکے قابو سے باہر تھا۔ بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے مخدوم وحید العصر مولوی شبلی کے قابو سے بھی باہر ہے مگر کسی بدنیتی یا طمع نفسانی کا الزام جو لوگ منشی سراج الدین احمد کی نسبت لگاتے ہیں نہ ہم اسکو پسند کرتے ہیں نہ درست سمجھتے ہیں۔ فرض کرو ایک شخص نے ایک مضمون پر کتاب لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس مضمون پر دوسرے شخص نے بھی کتاب لکھی۔ اس میں نقصان کیا ہوا۔ بلکہ جب دونوں کتابیں موجود ہوں گی تو لوگوں کو دونوں میں تمیز کرنے کا نہایت عمدہ موقع ملے گا۔ اور یہ صادق آویگا۔ " فنتقبل من احدهما ولم يتقبل من الاخر " یہ سمجھنا کہ منشی سراج الدین صاحب کے سیرۃ فاروق رضؓ تحریر کرنے سے مولوی شبلی بے دل ہو گئے ہیں اب نہ وہ ہیروز آف اسلام لکھیں گے اور نہ الفاروق محض غلط خیال ہے۔ اگر اہل ملک مولوی شبلی کی تصانیف کو سمجھتے ہوں تو وہ یقین کریں گے کہ اگر ایک ہی مضمون دس شخص بھی لکھیں تو اُن کو کیا پرواہ ہے۔ کہ اور کسی نے بھی کچھ لکھا ہے۔"[1]

الفاروق کی تصنیف کا زمانہ

غرض علامہ شبلی نے ۱۸ اگست ۱۸۹۴ء سے مستقل اور مسلسل اس کام کو شروع کیا[2] اگرچہ اب بھی بعض وجوہ کی بناء پر اکثر کئی کئی مہینہ کا ناغہ ہو جاتا تھا پھر بھی کام چونکہ قطعی بند نہیں ہوا تھا اسلئے کچھ نہ کچھ ہوتا ہی گیا۔ اب تک مولانا کے قلم سے جتنی کتابیں نکلی تھیں وہ محض مقتضائے وقت کے خیال سے تھیں مگر "الفاروق" لکھتے وقت دل کا بھی تقاضا شامل تھا۔ اسلئے دوران تالیف میں اگر ایک طرف دماغ اور قلم صرف کر رہے تھے تو دوسری طرف روح بھی برسر کار تھی۔ ایم مہدی حسن کو لکھتے ہیں:-

"الفاروق میں کوشش بھی ہے کہ تمام خوبیوں کی جامع ہو۔ دیکھئے کہاں تک کامیابی ہوتی ہے۔"[3]

---

[1] میں نے اس مضمون کو بلاکم و کاست اسلئے نقل کر دیا ہے کہ اس سے بعض لوگوں کی اس بدگمانی کی تردید ہو جاتی ہے کہ سرسید نہیں چاہتے تھے کہ شبلی "الفاروق" لکھیں۔ ۔ مؤ

[2] دیکھو دیباچہ "الفاروق"

[3] مکاتیب : جلد دوم : ص۱۹۷

یہاں بند مند اتنا کہہ دینا کافی نہیں - "بعض لوگوں" سے کون مراد ہے - یہ ظاہر کرنا ضروری اور یہ بتانا بھی لازم ہے کہ وہ "بدگمانی" کس طرح پیدا ہوئی کن لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے - ع ح

www.urduchannel.in

۱۹ دسمبر ۱۸۹۷ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"الفاروق کانپور مطبع نامی میں بڑے اہتمام اور نگرانی سے قاسمی کے زیر اہتمام چھپ رہی ہے۔ ایک حصہ جسکے ۳۱۲ صفحے ہیں پورا چھپ کر تیار ہو گیا ہے۔ لوح طلائی اور لاجوردی چھپ رہی ہے اور اس کا کاغذ اتنا نفیس دیا گیا ہے کہ ہندوستان میں آجتک ایسا کاغذ کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ جو قدردان صاحب چرمی کاغذ پر لوح چھپوانا چاہتے ہیں وہ دیکھیں گے تو اس کاغذ کو چرمی کاغذ پر ترجیح دینگے ....." [1]

منقولہ بالا سطور سے یہ امر متیقن ہو جاتا ہے کہ الفاروق ۱۹ دسمبر ۱۸۹۷ء سے پہلے مکمل ہو چکی تھی۔ اس کتاب کو مولانا نے جس محنت و کاوش سے مرتب کیا ہے وہ مہدی کی زبان قلم سے سننے کے قابل ہے :۔

"پروفیسر شبلی کی تالیف موعود (الفاروق) جس کا ذکر ضمناً آگیا ہے اور جس پر ریاض الاخبار میں ایک نوٹ دیا گیا ہے نہایت خوشی کی بات ہے کہ شائع ہو گئی۔ "یہ گوہر شب چراغ" اسی قیمتی سلک (سلسلہ آصفیہ) کا ایک خوش آب موتی ہے۔ جسمیں تمدن عرب کے اجزا پروئے گئے ہیں۔ غالباً یہ عمروں کی کمائی ہے۔ بڑے کاوش اور اہتمام سے سالہا سال کی مورخانہ تلاش اور تدقیق کے بعد ناموران اسلام کے سلسلے میں خلیفہ دوم (حضرت عمرؓ) کی لائف پر یہ ضخیم تالیف تیار کی گئی ہے۔ مورخ نے محض تحقیق واقعات کے لئے ممالک غیر یعنی ٹرکی و مصر وغیرہ کے مصائب سفر برداشت کئے۔ سیکڑوں قدیم و نایاب تاریخوں کے ہزاروں ورق الٹنے پڑے اور جہاں تک دسترس تھا اصلی ماخذ کی چھان بین میں یورپ کا تاریخی سرمایہ بھی بچنے نہ دیا۔

غرضکہ معلومات کا جو ذخیرہ جمع کیا گیا ہے وہ میرے خیال میں تاریخ فاروقی کے مہات مسائل ہیں جنکی نسبت یہ عام دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کسی زبان میں اس قدر مواد یکجا نہیں مل سکتا۔" [2]

یہ سچ ہے کہ مولانا نے الفاروق کی آخری سطریں بخار کی حالت میں کشمیر میں لکھیں۔ مگر مؤلف تاریخ ادب اردو" اور صاحب "سیر المصنفین" دونوں سے مولانا کی روانگی کشمیر کے تعین وقت میں غلطی ہوئی ہے [3]

---

[1] مکاتیب شبلی : جلد دوم : ص ۱۹۷ [2] افادات مہدی : ص ۳۸-۳۹

[3] تاریخ ادب اردو : ص ۶۸ ، سیر المصنفین : حصہ دوم : ص ۱۱۵

www.urduchannel.in

کیونکہ دونوں اصحاب متفق الرائے ہیں کہ مولانا اس سفر[1] ۱۸۹۹ء میں روانہ ہوئے حالانکہ یہ سفر جون ۱۸۹۸ء میں ہوا۔

اورنگ زیب قاسمی

شبلی کی تصانیف میں بہ اعتبار شہرت، قبول عام اور اہمیت "سیرۃ النبی صلعم" کے بعد "الفاروق" ہی کا درجہ ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے سوانح عمریوں میں "المامون" اور "سیرۃ النعمان" لکھی جا چکی تھیں اور ان میں سیرۃ نگاری کی ایک نئی روش نظر آتی ہے۔ لیکن اصولی حیثیت سے "الفاروق" ان دونوں سے ممتاز ہے۔ اس میں تاریخ کے اصول اور فلسفہ کے متعلق اردو میں پہلی مرتبہ فلسفیانہ اور منطقیانہ تبصرہ ملتا ہے۔ اس سلسلے میں دنیا کی مختلف قوموں میں تاریخ کے عناصر کا ذکر اور عربوں میں تاریخ کی ابتداء کا مجمل حال لکھ کر ان کی تاریخ دانی پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اسکے بعد قدیم تاریخوں اور قدماء کی تصانیف کا ذکر آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کی نظر کتنی وسیع تھی۔

دیباچہ کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جہاں "روایت" اور "درایت" کی صحت اور عدم صحت کے اصولوں سے بحث کی ہے۔ اصل میں یہ کتاب کی بنیاد ہے اور آگے چل کر اکثر روایات کو انھیں اصولوں پر قبول ورد کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں شبلی کا منطقیانہ طرز استدلال اردو میں اپنی قسم کا پہلا نمونہ ہے۔

اس سوانحعمری کا ہیرو اسلام میں عظمت و جلال کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ کتاب کے صفحہ صفحہ سے جلالت فاروقی نمایاں ہے۔ حضرت عمرؓ کی سیرت کا یہ پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ باوجود انتہائی سادہ زندگی کے خلیفۃ المسلمین کی پوری شان رکھتے تھے۔ شبلی نے اس سادہ عبارت میں کس پرزور طریقے سے اس خیال کو ظاہر کیا ہے:۔

> "سکندر اور تیمور تیس تیس ہزار فوج رکاب میں لے کر نکلتے تھے۔ جب اُن کا رعب قائم ہوتا تھا
> عمر فاروق رضہ کے سفر شام میں سواری کے ایک اونٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن چاروں طرف غل پڑ
> ہوا تھا کہ مرکز عالم جنبش میں آ گیا ہے۔"[2]

ماخذات

شبلی نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضہ کے حالات میں جو مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں وہ موجود نظر سے اتنی نامکمل ہیں کہ اُن سے حالات و واقعات کا صحیح اور پورا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اسلئے شبلی کو حدیث، تاریخ و طبقات وغیرہ کی بکثرت مذہبی و غیر مذہبی کتابوں سے مدد لینا پڑی۔ جنکی تفصیل بہت طویل ہے۔ ان میں سے کچھ کتابوں کے نام جن سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے حسب ذیل ہیں:۔

---

[1] مکاتیب شبلی : جلد دوم : طبع دوم : ص

[2]

www.urduchannel.in

(۱) الاحکام السلطانیہ: ماوردی (۲) مقدمہ ابن خلدون

اورنگ زیب قاسمی

(۳) کتاب الخراج (۴) اخبار القضاۃ : محمد بن خلف الوکیع

(۵) کتاب الاوائل لابی ہلال العسکری (۶) مجالس الوسائل الی الاخبار الاوائل

(۷) عقد الفرید (۸) کتاب البیان والتبیین للجاحظ

(۹) کتاب العمدہ لابن رشیق القیروانی (۱۰) کتاب الامثال

(۱۱) سیرۃ العمرین (۱۲) ازالۃ الخفا وغیرہ

ازالۃ الخفا عن تاریخ الخلفاء

ان میں سے سیرۃ العمرین، اخبار القضاۃ اور مجالس الوسائل کے نسخے قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں دیکھے تھے اور وہیں ضروری نوٹ لئے تھے۔

کتاب کی ترتیب

ابتدائی بحث کے بعد جس کا ذکر آچکا ہے پہلے باب میں حضرت عمرؓ کا نام و نسب، سن رشد و تربیت کا حال آٹھ صفحوں میں لکھا گیا ہے۔ اسکے بعد قبول اسلام اور ہجرت کے واقعات ہیں۔ اگلے باب میں سنہ ۱ھ سے وفات رسول اللہ صلعم تک کے حالات ہیں۔ پھر حضرت ابو بکرؓ کی خلافت اور حضرت عمرؓ کے استخلاف کا حال لکھا ہے۔ اور اسکے بعد کتاب کا پہلا حصہ عہد فاروقی کی فتوحات اور معرکہ آرائیوں کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ چونکہ ان معرکوں میں پہلی مرتبہ عربوں اور عجموں میں تصادم ہوا ہے اور مسلمان پہلی مرتبہ ایک عظیم الشان سلطنت کی تمام قوتوں کے مقابلے میں صف آرا ہوئے ہیں اسلئے ان کی تفصیل تاریخ اسلام کے نہایت اہم واقعات میں سے ہے۔ گو ان معرکہ آرائیوں میں خود حضرت عمرؓ بہ نفس نفیس شریک نہیں ہوئے اور ایک مرتبہ انہوں نے ایران کی مہم میں نکلنے کا ارادہ کیا لیکن حضرت علیؓ نے روک دیا کہ آپکے مدینہ چھوڑنے سے ملک میں انقلاب برپا ہو جائیگا۔ لیکن اسکے باوجود فوج کی نقل و حرکت اور حملہ جنگی مہمات انھیں کے مشورہ سے انجام پاتے تھے۔ اور اہم معرکوں میں میدان جنگ کا نقشہ منگا کر، اسے دیکھکر، جنگ کے متعلق ہدایات بھیجتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کو ان لڑائیوں سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسکے علاوہ علامہ شبلی نے ان معرکوں کے ان پہلوؤں کو خاص طور سے دکھایا ہے جنھوں نے عربوں کو ایران و روم جیسی بڑی متمدن سلطنتوں پر غالب کر دیا تھا۔ اور اس سے اس روح کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو اسلام نے عربوں کے اندر پھونک دی تھی۔ پہلا حصہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بیان پر ختم ہوا ہے اور دو سو سے زیادہ صفحات پر محیط ہے۔ دوسرے حصے میں فتوحات فاروقی پر ایک اجمالی نگاہ ڈالی گئی ہے اور فتح کے ان اسباب کو جو یورپین مورخین نے ان فتوحات کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے لکھے ہیں نقل کر کے

"عمرؓ یہ"

www.urduchannel.in

اُن کی تردید کی ہے۔ اور دنیا کے بعض نامور فاتحوں کی فتوحات سے ان کا موازنہ کیا ہے۔ اسکے بعد نظام حکومت، ملک کی تقسیم، صوبہ جات اور اضلاع، عہدہ داران ملکی اور مختلف صیغہ جات انتظامی کا حال علیحدہ علیحدہ لکھا ہے۔ ذمی رعایا کے حقوق پر ایک باب علیحدہ ہے۔ امامت اور اجتہاد پر علیحدہ فصل ہے۔ آخر میں ذاتی حالات، اخلاق و عادات، ازواج و اولاد کا ذکر ہے۔ خاتمہ میں حضرت عمرؓ کا موازنہ دنیا کے مشہور فرمانرواؤں اور ارباب فضل و کمال سے کرکے آپ کی ترجیح ثابت کی ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

الفاروق پر ریویو

تمام سوانحعمریوں کی طرح یہی حصّہ کتاب کی جان ہے۔ جسطرح پہلا حصّہ "تاریخ عروج اسلام" کہا جاسکتا ہے اسی طرح یہ دوسرا حصّہ اسلامی سیاست کی تاریخ اور اسکے نظام حکومت پر ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے حضرت عمرؓ کی سیاست و تدبیر کے ساتھ ان کی انتظامی قابلیت کا پورا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے چند سال کے اندر نہ صرف ایران و روم کی عظیم الشان حکومتوں کو زیر کرلیا بلکہ ایک اعلےٰ درجہ کا نظام حکومت بھی قائم کردیا، جس میں ایک متمدن حکومت کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ مثلاً رسول اللہ صلعم کے خاندان والے خود کو خمس یعنی مال غنیمت کے پانچویں حصّے کا جو آنحضرت صلعم اپنے اور اپنے خاندان والوں کے لئے لیتے تھے اور اسکو دوسرے مساکین پر بھی صرف کرتے تھے، مستحق قرار دیتے تھے۔ اور اکثر لوگ اُن کے اس دعوی کے موید تھے لیکن حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ خمس کا یہ حق ہمیشہ کے لئے قائم نہیں ہوا تھا۔

امامت اور اجتہاد کا باب بھی بہت اہم ہے۔ اگرچہ اس میں متکلمانہ موشگافیاں نہیں ہیں لیکن اس سے مذہبی مسائل میں حضرت عمرؓ کی دقیقہ سنجی اور نکتہ رسی کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اصحاب نظر علماء کی رائے ہے کہ حضرت عمرؓ نے جن مذہبی مسائل میں خواہ وہ نظری ہوں یا عملی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں اپنے علم و اجتہاد سے جو فیصلہ کیا ہے اس سے زیادہ قرین عقل فیصلہ ممکن نہ تھا۔ علامہ شبلی نے اُن میں سے بعض کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً مسئلہ قضا و قدر۔ تنظیم شعائر اسلامی۔ نبی کے اقوال و افعال کہاں تک منصب نبوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ احکام شریعت و مصالح عقل پر منحصر ہیں۔

الفاروق کا شمار بظاہر تاریخ و سوانح میں کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ اسلامی سیاسیات کے بنیادی مسائل اور اسکے اصول نساب کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں خلافت کے تمام اہم پہلوؤں اور خلیفۃ المسلین کے تمام اوصاف و خصوصیات کا پورا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ اور اس کی روشنی میں ہر دور کے سیاسی مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ موجودہ زمانے کے بہت سے سیاسی و معاشی مسائل

www.urduchannel.in

کے اسلامی مباحث کا مرجع و ماخذ الفاروق ہی ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

الغزالی

سنہ ۱۹۰۲ء
۱۳۲۰ھ

تاریخ تصنیف یہ کہنا کہ حیدر آباد کے سررشتۂ علوم و فنون کی نظامت کے دوران میں مولانا نے علم کلام کی طرف توجہ کی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں کا زمانہ فروری سنہ ۱۹۰۱ء سے فروری سنہ ۱۹۰۵ء تک کا ہے۔ مولانا نے الفاروق کی تالیف کے بعد ہی "تاریخ" کی طرف سے ہٹ کر "فن" کیطرف توجہ کی۔ چنانچہ شروانی صاحب کو ۱۸ فروری سنہ ۱۸۹۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

"میں نے علم کلام پر لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس فن کی کتابیں دور دور سے آرہی ہیں اس قلمی کتاب کی نقل کا سامان کیجئے۔"[1]

پھر ۸ جنوری سنہ ۱۸۹۹ء کو رقمطراز ہیں:۔

"..... میں نے اپنے لئے تین تجویزیں پیش نظر رکھی ہیں۔ قرآن مجید پر ریویو، (نعوذ باللہ جرح مراد نہیں) اس میں فن بلاغت و فلسفۂ کلامیہ کے دقیق مطالب ادا ہوتے ہیں۔ عرب کی شاعری کی تاریخ۔ امام غزالی کی لائف جس میں علم کلام پر پورا پورا ریویو ہوتا۔ کیونکہ موجودہ علم کلام کے موجد وہی ہیں۔ اسمیں سے آپ جسکو پسند کریں اس کو چھوڑ دوں۔"[2]

اس خط سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ امام غزالی کی لائف لکھنے کا خیال ان کے دماغ میں تھا۔ مگر مکتوب بنام[3] شروانی صاحب مورخہ ۶ جولائی سنہ ۱۸۹۹ء سے نہ صرف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پوری

---

[1] مکاتیب شبلی : جلد اول : طبع دوم : ص ۱۱۱
[2] 〃 : 〃 : 〃 : ص ۱۱۶
[3] 〃 : 〃 : 〃 : ص ۱۱۸-۱۱۷

www.urduchannel.in

طرح لکھنے کا ارادہ کرلیا بلکہ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے اور دیگر کتب اس سلسلہ میں مواد و مسالہ فراہم کرنے میں منہمک تھے اور بہت سی کتابیں اُن کی نظر سے گذر چکی تھیں۔ مگر کچھ اپنی بیماری، کچھ والد کی علالت و وفات اور اسکے ساتھ ساتھ امور خانہ داری کی الجھنوں کی وجہ سے یکسوئی نہ تھی۔ اسلئے قلم اٹھانے کی نوبت نہیں آئی۔ مگر جب ۲۲ فروری سنہ ۱۹۰۱ء میں مولانا کا نظامت پر تقرر ہوا تو انھوں نے نئے سرے سے علم کلام کی متعدد تصنیفوں کا خاکہ تیار کیا۔ "الغزالی" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"علم کلام جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک مہتم بالشان علم اور ان کا سرمایہ ناز ہے آجکل اسکی نہایت بسوط تاریخ لکھ رہا ہوں۔ اور اسکے چار حصے قرار دئے ہیں۔

(۱) علم کلام ابتداءً، اسکی مختلف شاخیں، عہد بہ عہد کی ترقیاں اور تبدیلیاں۔

(۲) علم کلام نے اثبات عقائد اور ابطال فلسفہ کے متعلق کیا کیا اور کس حد تک کامیابی حاصل کی۔

(۳) آئمہ کلام کی سوانح عمریاں۔

(۴) جدید علم کلام۔

پہلا حصہ بقدر معتدبہ لکھا جا چکا تھا کہ بوجوہ چند رک گیا۔ اور تیسرا حصہ شروع ہوگیا۔ اس حصہ میں امام غزالی کی سوانح عمری ہوگئی تو بڑھتے بڑھتے ایک مستقل کتاب بن گئی۔ چونکہ پوری کتاب کی تیاری کو ایک عرصہ درکار تھا۔ مناسب معلوم ہوا کہ بلا انتظار باقی یہ حصہ الگ شائع کر دیا جائے۔" [1]

غرض ۵ فروری سنہ ۱۹۰۲ء سے پہلے "الغزالی" انجام کو پہونچی۔ چنانچہ محمد سمیع صاحب کو لکھتے ہیں :-

"..... "الغزالی" چھپنے کے لئے گئی ہے........" [2]

۵ فروری سنہ ۱۹۰۲ء

امام غزالی کا مرتبہ

امام محمد بن محمد غزالی جن کا لقب "حجۃ الاسلام" ہے۔ متکلمین میں بڑا پایہ رکھتے ہیں۔ بلکہ انھیں اگر علم کلام کا بانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کا زمانہ ایک اعتبار سے شبلی کے زمانے سے بہت ملتا جلتا تھا۔ اسلام کی تعلیمات اور عقائد نہایت صاف و سادہ ہیں جن میں کسی قسم کی

---

[1] دیباچہ الغزالی : ص ۱ [2] مکاتیب : جلد اول : ص ۱۰۵

www.urduchannel.in

پیچیدگی نہیں۔ عہد سعادت کے مسلمان اس پر قائم رہے لیکن جب اسلامی فتوحات کا دائرہ بڑھا اور دوسری قومیں اسکے زیرنگین ہوئیں، مسلمانوں سے ان کا ربط ضبط بڑھا اور ان قوموں میں اسلام کی اشاعت ہوئی تو قدرتی طور پر دونوں ایک دوسرے کے عقائد و خیالات سے متاثر ہوئے۔ بہت سے نومسلم گو مسلمان ہو گئے تھے لیکن وہ اپنے قدیم عقائد و خیالات کو یک سرنہ مٹا سکے تھے۔ اور ان کے اثر سے اسلامی عقائد میں بھی رخنہ اندازی شروع ہو گئی۔ خصوصاً عباسی دور میں جب مسلمانوں میں یونانی فلسفے کی اشاعت ہوئی اور مذہبی عقائد کو عقل کی میزان میں تولا جانے لگا تو بہت سے مذہبی مسائل، خصوصاً مابعد الطبعی مسائل پر اعتراضات شروع ہو گئے۔ اسلئے ضرورت محسوس ہوئی کہ عقل پرستوں کے اعتراضات کا جواب اسی حربے سے دیا جائے اور عقائد کو عقل کی میزان میں صحیح ثابت کیا جائے۔ یہ کام متکلمین نے کیا۔ امام غزالی امام المتکلمین تھے، اسکی مزید تفصیل آئندہ الکلام و علم الکلام کے تبصرہ میں آئے گی۔ شبلی کے عہد میں یونانی علوم کی طرح مغربی علوم و فنون اور فلسفے کے اثرات ہندوستان میں عام ہونے لگے تھے۔ علوم کی نشر و اشاعت، مشنریوں کے اعتراضات، آریوں کے مباحث و مناظروں نے وہی کیفیت پیدا کر دی تھی جو عہد عباسی میں نظر آتی ہے۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے اسوقت وہی کیا جو پرانے متکلمین نے اپنے دور میں کیا تھا۔ ان میں علامہ شبلی سب سے آگے تھے۔ الغزالی، علم الکلام اور الکلام اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

کتاب کی ترتیب

شبلی نے تمہید میں خود بیان کیا ہے کہ علم کلام مسلمانوں کی خاص ایجاد ہے اور اس پر عرصہ تک ان کو ناز رہا ہے۔ چنانچہ انھوں (شبلی) نے اس علم کلام کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا اور اسکے چار حصے تجویز کئے۔ پہلے حصہ میں علم کلام کی ابتداء اور اسکی مختلف شاخوں اور اسکی عہد بہ عہد کی ترقیوں کی تفصیل ہے۔ دوسرے میں علم کلام کی خدمات کہ اُسنے اثبات عقائد اور ابطال میں کیا کام کیا۔ تیسرا حصہ ائمہ کلام کی سوانح عمریوں کے لئے مخصوص تھا۔ اور آخری حصہ جدید علم کلام کے لئے رکھا گیا تھا۔ ان میں پہلا حصہ لکھا جا چکا تھا لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر شائع نہ ہو سکا۔ اور تیسرے حصے میں امام غزالی کا حال لکھا جانے لگا۔ جو بڑھتے بڑھتے کتاب بن گیا۔ چنانچہ باقی حصوں کی تکمیل کئے بغیر یہ حصہ شائع کر دیا گیا۔ پہلے اور دوسرے حصے کا ذکر آئندہ آئیگا۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں صاحب سوانح کے حالات، ولادت، تسمیہ، تعلیم، دربار سے تعلق، نظامیہ کی تدریس، ترک تعلق، تصوف کے عملی تجربات، عروج اور حاسدوں کی دشمنی، وفات،

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

اور شاگردوں کے حالات وغیرہ کا ذکر ہے ۔ دوسرے حصے میں امام صاحب کے علمی کمالات اور ان کے علمی خدمات کی تفصیل ہے ۔ اس میں اُن کی تصانیف کا ذکر اور ان پر مختلف حیثیتوں سے بحث اور اہم تصانیف پر تبصرہ ہے ۔ احیاء العلوم پر نہایت مفصل ریویو ہے ۔ اس میں امام صاحب کے فلسفۂ اخلاق اور اسکی خصوصیات کا خلاصہ آگیا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ اسوقت تک علم اخلاق کا سرمایہ کیا تھا ۔ احیاء العلوم نے اس میں کیا اضافہ کیا اور فلسفۂ اخلاق پر امام صاحب کی نظر کتنی گہری تھی ۔ اسکے بعد علم کلام پر مختصر اور رد فلسفہ میں امام صاحب کی خدمات اور اس سلسلے کی ان کی مشہور کتاب 'تہافتہ الفلاسفہ' پر تبصرہ ہے ۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عقل پرست مسلمانوں پر فلسفہ کا جو رعب چھایا ہوا تھا اسکو امام صاحب نے خود فلسفہ کے ذریعہ سے کسطرح دور کیا ۔ پھر عقائد کے بارے میں امام صاحب کی مختلف تصنیفات کے اختلاف کے اسباب ظاہر کئے ہیں ۔ اور قدیم علم کلام میں امام صاحب کی اصلاحوں کا ذکر کرکے اُن کے رسالہ التفرقہ بین الاسلام والزندقہ پر تبصرہ کیا ہے ۔ جس میں امام صاحب نے نصوص شرعیہ کی تفسیر و تاویل کے اصول و قواعد منضبط کئے ہیں ۔ پھر ان اصول موضوعہ کی روشنی میں امام صاحب کے کلامی مباحث مثلاً صفات باری، نبوت، معجزات، تکلیفات شرعیہ، عذاب و ثواب، حالات بعد موت، قیامت روح کی حقیقت، لذت، بہشت وغیرہ پر مفصل روشنی ڈالی ہے ۔ اور امام صاحب نے تصوف کی جو خدمات انجام دیں اور عقائد تعلیم و اخلاق کی اصلاح میں جو مجددانہ کارنامے انجام دئے ان کی تفصیل ہے ۔ آخر میں اسلامی عقائد اور علوم و فنون پر امام صاحب کے جو اثرات پڑے ان کو ظاہر کیا ہے ۔ ان مباحث سے امام صاحب کی علمی عظمت اور انھوں نے جو مختلف النوع کارنامے انجام دئے اور مسلمانوں کی ذہنی سطح جس قدر بلند کی اسکا اجمالی اندازہ ہوجاتا ہے ۔

ماخذات

اس کتاب کی تالیف میں حسب ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ۔

(۱) المنقذ من الضلال امام غزالی — (۲) شرح احیاء العلوم غزالی مقریزی ؟ مرتضیٰ زبیدی ؟

(۳) اخلاق جلالی — (۴) وفیات الاعیان ابن خلقان خلکان

(۵) تبیین المفتری ابن عساکر دمشقی — (۶) طبقات الشافعیہ سبکی

(۷) ابن الاثیر — (۸) کشف الظنون

(۹) تذکرہ مجمع الفصحاء — (۱۰) تہذیب الاخلاق ابن مسکویہ

www.urduchannel.in

(۱۱) تاریخ فلسفہ : جارج ہنری لوئس اور نگ (۲) ایک کتاب المنتہیہ : راغب اصفہانی

(۱۳) تاریخ سلجوقیہ : عماد الدین اصفہانی ۔ وغیرہ

ان میں سے پہلی کتاب خود امام غزالی کی تصنیف ہے ۔ اور ان کے حالات میں سب سے زیادہ معتبر ۔ تبیین المفتری میں امام صاحب کے حالات گو امام ابوالحسن اشعری کے ضمن میں ہیں لیکن جس قدر ہیں مستند ہیں ۔ تیسری کتاب بھی نہایت معتبر ہے ۔ اور اس میں نہایت مفصل حالات ہیں ۔ باقی کتابوں سے جستہ جستہ استفادہ کیا گیا ہے ۔

ریویو

الغزالی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام غزالی شروع میں یونانی فلسفے سے بہت متاثر تھے چنانچہ مقاصد الفلاسفہ میں انہوں نے یونانی فلسفے کے مسائل نہایت ترتیب و عمدگی سے لکھے ہیں ۔ اسلامی ملکوں میں اس کا وجود نہیں لیکن اسپین کے کتب خانے میں اس کا نسخہ موجود ہے ۔ اس کا عبرانی ترجمہ یورپ سے شائع ہوا تھا ۔ اصل کتاب کے بھی چند صفحے شائع ہوئے تھے جنھیں مولانا شبلی نے دیکھا تھا ۔ اس میں منطق کے ابتدائی مسائل ہیں ۔ ان کی رائے ہے کہ اس اختصار و وضاحت کے ساتھ ان مسائل کو کسی نے نہیں لکھا ۔

اس موضوع پر غزالی کی دوسری اہم فلسفیانہ کتاب نبوت کی حقیقت اور امام صاحب کے مذہبی خیالات کے تغیر کے حالات میں ہے ۔ یہ کتاب بھی یورپ میں زیادہ مقبول ہوئی ۔ تہافتہ الفلاسفہ نہایت اہم تصنیف ہے جس میں یونانی فلسفے کے مسائل کی تردید کی گئی ہے ۔ الغزالی کے کلامی مباحث اگرچہ انہی قدیم مسائل سے متعلق ہیں جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے ۔ لیکن امام غزالی کا طرز استدلال فلسفیانہ ہونے کے ساتھ اس قدر سریع الفہم اور دلنشیں ہے کہ نازک سے نازک اور دقیق سے دقیق مباحث کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی اور اُن سے دماغ ہی کی نہیں دل کی بھی تشفی ہو جاتی ہے ۔ امام صاحب سے پہلے یہ مسائل ایک چیستان تھے ۔ امام صاحب نے ان کو پانی بنا دیا ۔

کتاب کا وہ حصہ جو احیاء العلوم سے متعلق ہے نہایت اہم ہے ۔ اس میں شبلی نے فلسفۂ اخلاق کی تاریخ، یونانی فلسفہ میں اخلاق پر اہم تصنیفات، مسلمانوں میں فلسفۂ اخلاق کی ابتدائی تصانیف کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ فلسفہ اور مذہب دونوں کو ترتیب دیکر امام غزالی نے احیاء العلوم تصنیف کی ۔ جسے ائمۂ اسلام الہاماتِ ربانی کہتے ہیں ۔ اور یورپ کے فلسفی اسے فلسفہ کی ایک اہم تصنیف قرار دیتے ہیں ۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ اسکے بے شمار خلاصے لکھے گئے ۔ جن میں سے چھ کا ذکر خود شبلی نے کیا ہے ۔

www.urduchannel.in

شبلی نے احیاء العلوم پر اس انداز سے تبصرہ کیا ہے کہ جو لوگ زبان عربی اور فلسفہ دونوں سے ناآشنا ہیں وہ بھی غزالی کی اس تصنیف سے پورا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے علمی تحقیق کے اس نکتہ پر بہت زور دیا ہے کہ غزالی نے اپنی تصنیف قدماء کی تصانیف کو سامنے رکھ کر لکھی تھی۔ اور انہوں نے ہر جگہ دیانت داری اور بے تعصبی سے اس کا اعتراف کیا ہے۔ احیاء العلوم کے مطالعہ سے غزالی کا فلسفۂ اخلاق غالباً اتنا ہی واضح ہوگا جتنا خود شبلی نے خلاصہ لے کر دیا ہے۔ غزالی کے فلسفیانہ مباحث کی صحت یا عدم صحت کا تعلق فلسفہ کے طالب علم کا کام ہے اور اسلئے ہمارے مضمون سے خارج ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ بعض فلسفیانہ مباحث علم الکلام اور الکلام کے سلسلے میں دوبارہ زیر بحث آئیں گے۔ اس لیے بخوف طوالت اُن کا بیان یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

علم الکلام

سنہ ۱۹۰۲ء

الغزالی کے بعد مولانا نے علم الکلام کی طرف توجہ کی جیسا کہ اُن کے مکتوب مورخہ ۸ فروری سنہ ۱۸۹۹ء بنام شروانی سے معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"......... میں نے علم کلام پر لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس فن کی کتابیں دور دور سے آرہی ہیں۔ اس قلمی کتاب کی نقل کا سامان کیجئے۔" [1]

۲۲ فروری سنہ ۱۹۰۲ سے پہلے وہ اس کتاب کو تقریباً اختتام تک پہونچا چکے تھے۔ چنانچہ ۲۲ مارچ سنہ ۱۹۰۲ء کو مولانا حمید الدین کو لکھتے ہیں :-

"غزالی ختم ہو کر مطبع میں جا چکی۔ شاید سیرۃ النعمان کے لگ بھگ ہو جائے۔ علم کلام کی تاریخ لکھ رہا ہوں وہ بھی قریب الختم ہے۔ اب کلام جدید کا مرحلہ ہے ......" [2]

---

[1] مکاتیب شبلی : جلد اول : طبع دوم : ص ۱۱۱

[2] " " : " : " : ص ۱۰

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

ان دنوں مولانا تپ و لرزہ میں مبتلا تھے اور ضعف بہت بڑھ گیا تھا۔ پھر بھی وہ تکیہ کے سہارے پڑے لکھتے ہی رہتے۔[1] اور جس طرح بنا تمام کرکے اسے مطبع "مفید عام آگرہ" میں چھپنے کے لئے بھیجدیا۔ چنانچہ نواب وقار الملک کے نام انہوں نے جو خط ۲۱ اپریل ۱۹۰۲ء کو لکھا ہے اس سے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

> "الغزالی کانپور میں چھپ رہی ہے۔ افسوس ہے کہ منشی رحمت اللہ دو دن کا کام برسوں میں کرتے ہیں چھ مہینے ہو گئے ابھی تک صرف ۱۲۰ صفحے لکھے گئے ہیں۔
>
> اسی وجہ سے میں نے اپنی ایک تازہ تصنیف یعنی علم الکلام کی تاریخ آگرہ چھپنے کے لئے روانہ کی ہے۔ یہ انشاءاللہ جلد چھپ جائیگی۔"[2]

علم الکلام کی تاریخ

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اسلام کے عقائد نہایت سادہ و صاف ہیں۔ صحابۂ کرام جو کچھ رسول اللہ صلعم سے سنتے تھے یا آپ کو جو عمل کرتے دیکھتے تھے اسکی صحت پر ایمان رکھتے تھے۔ اور بے چون و چرا اُس پر عمل کرتے تھے۔ گو بعض صحابہ اسلامی عقائد و تعلیمات پر عقلی حیثیت سے بھی غور کرتے تھے۔ لیکن عقل کو ان کی صحت کا معیار نہ بنایا تھا۔ جو چیز عقلی حیثیت سے سمجھ میں نہ آتی تھی اس پر ایمان کے لئے قبول رسولؐ کافی تھا۔ لیکن جتنا زمانہ گزرتا گیا ایمان کی یہ قوت کمزور پڑتی گئی۔ خصوصاً عباسی دور میں جب یونان و ایران کا فلسفہ اور اُن کے علوم عربی زبان میں منتقل ہوئے اور دوسری قوموں سے مسلمانوں کا ربط و ضبط بڑھا تو وہ قدرتاً اُن کے عقائد و خیالات سے متاثر ہوئے۔ عباسی دور میں مختلف قوموں اور فرقوں کو مذہبی بحث و مناظرے کی عام آزادی تھی۔ اسکے اثر سے مسلمانوں میں بھی عقائد میں موشگافیاں اور نئے نئے مسائل اور فرقے پیدا ہوئے۔ اسکے علاوہ مفتوحہ قوموں نے جو تلوار سے مسلمانوں کا مقابلہ نہ کرسکتی تھیں اُن پر ذہنی اور دماغی حملے شروع کردئے۔ ان اسباب نے ضعیف العقیدہ مسلمانوں کے عقائد میں رخنہ پیدا کردیا۔ اور وہ دوسری قوموں کے عقائد و خیالات سے متاثر ہونے لگے۔ گو اس وقت آسانی سے ممکن تھا کہ حکومت کے زور سے نکتہ چینوں کی زبانیں بند کردی جاتیں لیکن علمائے اسلام نے اس سے زیادہ مؤثر اور کارگر طریقہ اختیار کیا۔ علاج بالمثل کے طریقہ سے فلسفہ کے اعتراضات کا رد فلسفہ ہی کے ذریعہ کیا۔ خصوصاً معتزلہ نے جنکے عقائد کی بنیاد عقل پر تھی اسلامی عقائد کی حفاظت میں فلسفہ کا سنگین حصار قائم کردیا۔ اور عقلیت کا سیلاب اُس سے ٹکرا کر بکھر گیا:۔

---

[1] بحوالہ حیات شبلی ص ۳۷۲

[2] مکاتیب شبلی جلد اول ص ۳۴۸۔۳۴۹

www.urduchannel.in

ان ہی معرکوں کے کارنامے ہیں جو آج علم کلام کے نام سے مشہور ہیں۔"[1]

نئے علم کلام کی ضرورت

زمانے کی رفتار اور انسان کی ذہنی و دماغی ترقی کے ساتھ ساتھ اہل زمانہ کا مذاق اور رجحان بھی بدلتا رہتا ہے۔ عباسیوں کے زمانے میں فلسفہ یونانی کا زور تھا اور ہر چیز اسی کے معیار سے جانچی جاتی تھی۔ اب زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ دنیا کی ذہنی و دماغی سطح بہت بلند ہو گئی ہے۔ اور یونان کے قیاسی و ظنی فلسفہ کی جگہ جدید فلسفہ و علوم نے جنکی بنیاد تجربات و مشاہدات پر ہے لے لی ہے۔ اور اعتراضات اور ان کے جوابات کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے صرف چند مذہبی عقائد تک اعتراضات محدود تھے۔ اب اسکی زد میں مذہب کے ساتھ تاریخ، تہذیب، معاشرت غرض قوم و مذہب کا پورا نظام زندگی آگیا ہے۔ جسکے جواب کے لئے ایک جدید علم کلام کی ضرورت تھی۔ مولانا شبلی نے اس پر قلم اٹھانے سے برسوں پہلے اس کو محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ندوہ کے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۵ء میں علماء کے فرائض پر جو مضمون پڑھا تھا اس میں علماء کو خاص طور پر ان الفاظ میں توجہ دلائی تھی۔

"دوسرا بہت بڑا فرض جو علماء پر ہے وہ اس دہریت و الحاد کے اثر کا روکنا ہے۔ جو آجکل یورپ میں پھیل کر ہندوستان کی طرف بڑھتا آتا ہے۔ غالباً اس مرض کے پھیلنے سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ گفتگو جو کچھ ہے علاج کے طور و طریقے میں ہے۔ لیکن میرے نزدیک ہم کو اس باب میں زیادہ غور و فکر کی حاجت نہیں۔ یہ بیماری ایک دفعہ پہلے بھی اسلامی ممالک میں پھیل چکی ہے۔ اور اطبائے شریعت یعنی علمائے سلف کا علاج اسکے دفع کرنے میں کارگر ثابت ہوا۔ عباسیوں کا اول اول زمانہ تھا کہ یونانی فلسفہ کا ترجمہ ہوا۔ اور ساتھ ہی چاروں طرف الحاد کی ہوا چل گئی۔ اکثر فقہاء اور بعض محدثین نے اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ سرے سے فلسفہ پڑھایا نہ جائے۔ یہانتک کہ علم کلام کو اس لحاظ سے ممنوع قرار دیا کہ اس میں عقلیات کی آمیزش تھی۔ امام شافعی کا قول ہے کہ "حکمی فی اہل الکلام ان یضربوا بالجرید و یطاف بہم فی القبائل"۔ یعنی اہل کلام کے بارے میں میرا یہ فیصلہ ہے کہ اُن کو دُرّے لگائے جائیں اور قبائل میں اُن کی تشہیر کیجائے۔ اس علاج نے بلحاظ حالت موجودہ کسی قدر فائدہ دیا۔ یعنی بعض نیک دل فلسفہ پڑھنے سے رک گئے۔ لیکن پورا نفع نہ ہوا۔

[1] علم الکلام: نقش پنجم: ص ۲ (مطبوعہ معارف پریس ۱۹۳۹ء)

www.urduchannel.in

کیونکہ سینکڑوں ہزاروں مسلمان منطق و فلسفہ پر ایسے فریفتہ ہو گئے تھے کہ اسکو بالکل نہ چھوڑ سکتے تھے۔ آخر علماء نے دوسرا علاج سوچا۔ یعنی فلسفہ کے مسائل پر اطلاع حاصل کر کے فلسفہ کے روکنے کے لئے علم کلام ایجاد کیا۔ اس علاج کے مجوز امام غزالی، امام رازی، ابن رشد، قاضی عضد وغیرہ تھے۔ اور واقعی ان کی یہ تدبیر نہایت کارگر نکلی۔ اسی کا اثر ہے کہ اگرچہ درس نظامیہ میں تمام علوم و فنون سے زیادہ منطق و فلسفہ کی کتابیں زیر درس ہیں تاہم مذہبی عقائد کو اُن سے کچھ ضرر نہیں پہونچتا۔

ہمارے زمانے میں بھی اسی مرض نے ظہور کیا ہے اور پہلی قسم کا علاج بھی ہو چکا ہے۔ اب اگر وہ علاج مفید ثابت ہو تو فبہا ورنہ دوسرے قسم کا علاج شروع کیا جائے۔ اور امام غزالی اور امام رازی کی روحیں تازہ کی جائیں۔"[1]

جدید علم کلام پر تصانیف

مغربی علوم اور مغربی تہذیب کا حملہ ساری دنیائے اسلام پر یکساں تھا۔ اسلئے مصر و شام و ترکی وغیرہ کے زمانہ شناس علماء نے بھی جدید علم کلام کی ضرورت محسوس کی اور اسکے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھیں۔ ہندوستان میں سب سے پہلے سرسید ادھر متوجہ ہوئے۔ انھوں نے اسلامی عقائد و تعلیمات کی تطبیق اصول فطرت (نیچر) سے کرنے کی کوشش کی جس کا نمونہ ان کی تفسیر ہے۔

مولانا شبلی نے جو وقت علم کلام کی طرف توجہ کی اسوقت اُن کے سامنے اسکے دو نمونے تھے ایک قدیم علم کلام کا نمونہ جس پر قدماء کی بکثرت کتابیں موجود تھیں۔ لیکن جدید علوم نے پرانے فلسفے، اسکے اعتراضات اور ان کے جوابات و طریقۂ استدلال کو بالکل بے کار کر دیا تھا۔ ان کے اعتراضات کے مقابلہ کے لئے بالکل نئے علم کلام کی ضرورت تھی۔ جسکی بنیاد نئے علوم اور اسکے طریقۂ استدلال پر ہو۔ دوسرا نمونہ سرسید کے علم کلام کا تھا کہ جہاں اسلامی عقائد و تعلیمات اور جدید علوم و فنون میں کوئی تعرض ہو تو اسلامی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر اُن کے مطابق بنایا جائے۔ یا اُن کی صحت سے انکار کر دیا جائے۔ یہ طریقہ پہلے طریقہ سے بھی زیادہ مہمل تھا۔ اس سے اسلام کا چہرہ ہی سرے سے مسخ ہو جاتا تھا۔ اسلئے مولانا شبلی نے ان دونوں کے درمیان ایک تیسری راہ اختیار کی۔ اور نئے علم کلام کو بھی بالکل اسی اصول پر مرتب کرنا چاہا۔ جس اصول پر

---

[1] خیالاتِ شبلی : ص ۳۵-۳۶ : مطبوعہ معارف پریس : ۱۹۱۱ء

www.urduchannel.in

پر انھوں نے فن تاریخ کا ایک جدید خاکہ تیار کیا تھا۔ یعنی انھوں نے علم کلام کو موجودہ مذاق اور موجودہ ضروریات کے لحاظ سے کیا لیکن بزرگان سلف کی بھی محنتوں کو ضائع نہیں ہونے دیا۔ اور وہ اس راہ میں جو کام کر گئے تھے اسکو انھوں نے نئے انداز سے پیش کیا۔ اور اس سلسلہ میں انھوں نے پہلے علم کلام کی تاریخ لکھی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہر عہد میں علم کلام کی کیا نوعیت رہی۔ اور اس میں کیا کیا ترقیاں اور تغیرات ہوئے۔ اور ہر دور میں اعتراضوں کی نوعیت کیا تھی اور ائمۂ اسلام نے اسکے رد کا کیا طریقہ اختیار کیا۔

قدیم علم کلام کی بھی دو جداگانہ قسمیں تھیں۔ اور ان دونوں کے مقاصد بالکل الگ الگ تھے

ایک علم کلام تو وہ تھا جو خاص اسلامی فرقوں کے آپس کے اختلاف عقائد سے پیدا ہوا اور دوسرا وہ تھا جو فلسفے کے مقابلے کے لئے ایجاد ہوا۔ امام غزالی کے زمانے تک دونوں بالکل الگ الگ رہے۔ امام غزالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے ان دونوں کو آپس میں ملا دیا۔ امام رازی نے اسکو ترقی دی۔ لیکن متاخرین نے اس قدر خلط مبحث کر دیا کہ فلسفہ، کلام، اصول عقائد سب مل ملا کر معجون مرکب بن گیا[1] شبلی سے پہلے علم کلام کا یہی انداز قائم تھا۔

شبلی کی تجویز

مولانا پہلے شخص ہیں جنہوں نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے عقلی علم کلام کے نمونے پر نئے علم کلام کو مرتب کیا۔ اس سلسلے میں پہلا سوال جو ان کے دل میں پیدا ہوا یہ تھا:-

(۱) قرآن مجید میں جو کچھ مذکور ہے اسکو بالکل عقل کے موافق ثابت کیا جائے۔ مگر یہ آسان کام نہ تھا۔ قدیم زمانہ میں عقلی علم کلام کے بانیوں میں ابو مسلم اصفہانی، ابوبکر اصم، ابو القاسم بلخی وغیرہ نے بالکل عقلی اصول کے مطابق قرآن مجید کی تفسیریں لکھیں تھیں۔ اور ان اعتراضات کی تردید کی تھی جو معقول اور منقول میں تطبیق دیتا تھا۔ عام طور پر اگرچہ یہ لوگ معتزلی اور بدعقیدہ سمجھے جاتے تھے تاہم امام رازی نے اُن کے اس قسم کے اقوال تفسیر کبیر میں درج کر دئے ہیں۔ اور بعض موقعوں پر اُن کی نسبت تحسین آمیز کلمات لکھے ہیں[2]۔

چونکہ مولانا کے نزدیک یہی مسائل امام رازی کے اصل خیالات اور علم کلام کی جان ہیں اسلئے انھوں نے علم کلام کی تاریخ میں اُن کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کیا ہے۔

(۲) عقلی اصول پر علم کلام کے مرتب کرنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ وہ مسائل جو علم کلام کے دائرے سے خارج سمجھے جاتے تھے اور جن کی بناء پر مخالفین اسلام قرآن مجید یا اسلام پر اعتراض کرتے تھے ان کی تنقید بھی

---

[1] بحوالۂ علم الکلام

[2] بحوالۂ علم الکلام

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

علم کلام کا ایک جزو قرار پائی۔ اصول یہ ہے کہ عقلی علم کلام کے مخاطب دراصل معترضین اسلام ہیں۔ امام غزالی امام رازی اور معتزلہ نے اسی گروہ کو مخاطب کیا تھا۔ اور خود مولانا کے نزدیک بھی یہی ان کے مخاطب تھے۔ جیسا کہ مولانا کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے :-

"امام رازی نے مطالب عالیہ میں نبوت کی بحث کو تخمیناً ساٹھ صفحوں میں لکھا ہے۔ اس میں قریباً پچاس صفحے صرف ملاحدہ کے اعتراضات کی تفصیل میں ہیں۔ اسی طرح نہایت العقول میں قرآن مجید کے معجز ہونے پر منکرین کی زبان سے سینکڑوں اعتراضات نقل کئے ہیں۔ انھیں اعتراضات اور شبہات کا اٹھانا درحقیقت اصلی علم کلام ہے۔" [1]

مولانا نے جدید علم کلام میں اسلام کے اصلی عقائد و مسائل کے اثبات پر دلیلیں قائم کی ہیں لیکن یہ دلائل عام متکلمین کے دلائل سے مختلف ہیں۔ متاخرین متکلمین کا یہ انداز تھا کہ وہ مسائل پر استدلال کا وہ طریقہ اختیار کرتے تھے جو زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتا تھا اور جس میں قدم قدم پر مشکلیں پیش آتی تھیں مگر مولانا نے اس طریقے سے احتراز کیا۔ مولانا شبلی فطرتاً سادگی، سلاست اور صفائی پسند کرتے تھے، اسلئے وہ متاخرین کے اس طریقہ کو پسند نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ جدید عہد میں جس میں شبلی تھے، تحریر کی صفائی، دلیل کی وضاحت اور سلجھاؤ ہی سب سے ضروری چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ شبلی اس نکتہ کی اہمیت و ضرورت سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

"سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ دلائل و براہین ایسے صاف اور سادہ پیرائے میں بیان کئے جائیں کہ سریع الفہم ہونے کے ساتھ دل میں اتر جائیں۔ قدیم طریقے میں پیچ در پیچ مقدمات، منطقی اصطلاحات اور نہایت دقیق خیالات سے کام لیا جاتا تھا۔ اس طریقہ سے مخالف مرعوب ہو کر چپ ہو جاتا تھا۔ لیکن اسکے دل میں یقین اور وجدان کی کیفیت نہیں پیدا ہوتی تھی۔" [2]

اسی بنا پر مولانا نے ان لوگوں کو بھی متکلمین میں داخل کر لیا ہے جو بظاہر متکلمین میں داخل نہ تھے۔ اور انھیں کی زبان سے اُن مسائل کو ثابت کیا ہے۔ سوانح مولانا روم رح کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ فقر و تصوف ہے۔ اور اس لحاظ سے

---

[1] علم الکلام، نقش پنجم : ص ۱۸۷ [2] الکلام : نقش چہارم : مطبوعہ معارف پریس : ص ۶

www.urduchannel.in

متکلمین کے سلسلے میں اُن کو داخل کرنا اور اس حیثیت سے اُن کی سوانح عمری لکھنا لوگوں کو موجبِ تعجب ہوگا لیکن ہمارے نزدیک اصلی علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کیجائے اور اسکے حقائق و معارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بخود دلنشین ہو جائیں مولانا نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے مشکل سے اسکی نظیر مل سکتی ہے - اسلئے ان کو زمرۂ متکلمین سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے"۔ [1]

اورنگ زیب قاسمی

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں :-

"....... اشاعرہ اور مولانا کے طرزِ استدلال میں یہ فرق ہے کہ اشاعرہ جس چیز کو ثابت کرتے ہیں اس کو بزور منوانا چاہتے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ اگر یہ نہ ہوگا تو یہ لازم آئیگا ۔ اور یہ لازم آئیگا تو محال لازم آئیگا ۔ مخاطب ان فرضی محالات کے دام میں گرفتار ہو جانے کے ڈر سے بعض اوقات مسئلہ کو مان لیتا ہے ۔ لیکن جب دل کو ٹٹولتا ہے تو اس میں یقین یا ظن کی کوئی کیفیت نہیں پاتا ۔ بخلاف اسکے مولانا محالات اور ممتنعات کا ڈراوا نہیں دکھاتے بلکہ مسئلہ مبحوث فیہ سے جو استبعاد ہوتا ہے اسکو مختلف تمثیلات اور تشبیہات سے دور کرتے ہیں ۔ اور ایسے قرائن پیش کرتے ہیں جن سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا یوں ہونا زیادہ قرینِ عقل ہے ...." [2]

شبلی کا کام آسان نہ تھا - ہندوستان میں عربی کی درسی کتابیں تو مل جاتی تھیں لیکن قدماء کی اہم تصانیف یا تو ملتی نہیں تھیں یا اگر خال خال کہیں تھیں بھی تو عام طور پر اُن کا علم نہ تھا - پھر وہاں تک رسائی ناممکن تھی - اسی لئے شبلی علی گڑھ آنے سے پہلے یورپ کی شائع کردہ عربی کتابوں کے مطالعے سے قبل اس قسم کا کوئی کام شروع نہ کر سکے - لیکن علم الکلام لکھتے وقت متکلمین کی قدیم تصانیف کو پیش نظر رکھنا ضروری تھا - اسلئے کہ اُن میں بکثرت خود کلام مجید سے استدلال ہوتا تھا - چنانچہ علم الکلام میں ابن رشد کے ذکر میں لکھتے ہیں :-

"علم الکلام میں عام طریقہ یہ تھا کہ مسائل عقائد پر جو اصلی استدلال پیش کرتے تھے وہ اپنی ایجاد ہوتے تھے - بخلاف اسکے علامہ موصوف نے مسائل مذکورہ بالا پر جو دلیلیں قائم کیں سب

---

[1] سوانح مولانا روم : ص : مطبوعہ معارف پریس : سنہ ۱۹۳۸ء
[2] " " " : ص۲ : " " "

www.urduchannel.in

خاص قرآن مجید سے اخذ کیں۔ علامہ موصوف کا دعویٰ ہے کہ قواسکو انہوں نے بخوبی ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کے دلائل جسطرح خطابی اور اقناعی ہیں یعنی عام آدمی کو ان سے تسلی ہو جاتی ہے اسیطرح وہ قیاسی اور برہانی بھی ہیں۔ یعنی منطق کے اصول اور معیار پر پورے اتر سکتے ہیں۔"[1]

شبلی کے علم کلام کا نمونہ بعض مسائل پر بحث

اس طریقے کے مطابق انھوں نے خدا کے اثبات پر قرآن مجید کے استدلال کے طرز پر یہ دلیل قائم کی ہے کہ 'عالم' کامل اور بے نقص ہے، موزوں و مرتب ہے، ایسے اصول اور ضوابط کا پابند ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتے۔ یہ دلیل کا صغریٰ ہے کبریٰ خود ظاہر ہے یعنی جو چیز کامل مرتب اور مستمر النظام ہوگی وہ خود بخود پیدا نہیں ہوگئی ہوگی۔ بلکہ کسی صاحب قدرت اور صاحب اختیار نے اسکو پیدا کیا ہوگا۔ اس استدلال میں 'عالم' کے حدوث و قدم کی کوئی بحث پیش نہیں آتی۔ بلکہ اگر عالم کو قدیم بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ دلیل صحیح ہوگی۔ اس بنا پر انھوں نے ملاحدہ کے اعتراضات کے جواب میں یہ تسلیم کر لیا ہے کہ عالم اجزائے دیمقراطیسی سے بنا ہے۔ عالم قدیم ہے۔ مادہ کے اجزاء متحرک ہیں۔ حرکت مادہ کی ذاتیات میں سے ہے۔ مختلف قوانین قدرت ہیں جنکے موافق اجزاء باہم ملتے ہیں۔ ترکیب پاتے ہیں اور پھر ان میں خاص خاص قویٰ اور خواص پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی کائنات کا عقدہ حل نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک ایسے وجود کی اب بھی ضرورت پڑتی ہے جو ان تمام قوانین میں باہم توافق، تناسب اور ربط و اتحاد پیدا کردے۔ اور یہی معنی ہیں قرآن مجید کی اس آیت کے:-

وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا - زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے سب اُسکا کہنا مانتے ہیں۔ بجبر یا بخوشی۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ وہ مادہ کو غیر مخلوق مانتے تھے۔ قرآن و حدیث سے جو کچھ ثابت ہے وہ صرف یہ ہے کہ عالم خدا کا مخلوق ہے۔ لیکن اسکے قدیم یا حادث ہونے سے قرآن بحث نہیں کرتا۔ چنانچہ علم الکلام میں لکھتے ہیں:-

"..... لیکن جو مسائل مذہب سے نہایت قریب کا تعلق رکھتے ہیں اُن کو بھی درحقیقت مذہب سے بہت کم تعلق ہے۔ مثلاً عالم کا قدیم ہونا۔ متکلمین کے نزدیک بالکل مذہب کے خلاف ہے۔ لیکن قرآن و حدیث میں عالم کے قدم و حدوث کا کچھ اشارہ نہیں۔ متکلمین کہتے ہیں کہ عالم اگر قدیم

---

[1] علم الکلام : ص ۱۸۵

www.urduchannel.in

گا تو خدا اسکا خالق نہیں ہو سکتا۔ لیکن حکماء اکو نزدیک قدیم قدیم فلاسفہ مخلوق ہونا متضاد باتیں نہیں

ہیں۔ انکے نزدیک عالم قدیم بھی ہے اور خدا کا پیدا کیا ہوا بھی ہے۔ ہاتھ کو جس وقت حرکت

ہوتی ہے۔ قلم کو بھی اسی وقت حرکت ہوتی ہے۔ یعنی دونوں کی حرکت کا زمانہ ایک ہے۔

باوجود اسکے کہ قلم کی حرکت ہاتھ ہی کی حرکت سے پیدا ہوئی ہے۔" ؎۱

اس بناء پر اگر یہ مان لیا جائے کہ مولانا مادہ کو حقیقتاً قدیم مانتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس کو غیر مخلوق بھی مانتے ہیں۔

اسلامی عقائد میں سب سے اہم عقیدہ نبوت کا اثبات ہے۔ اور اشاعرہ نے اسکو معجزہ کی دلیل سے ثابت کیا ہے۔ مولانا اگرچہ معجزات کے منکر نہیں تھے اور خود الکلام میں انہوں نے اس پر مستقل بحث کی ہے اور عقلاً معجزات کے وجود کو ثابت کیا ہے۔ تاہم نبوت کے اثبات کا یہ طریقہ چونکہ گوناگوں اعتراضات کا مورد تھا اور بالخصوص بدیہات کے دور میں جب معجزہ کے قائل کم لوگ رہ گئے تھے اسلئے امام غزالی، امام رازی، ابن رشد اور شاہ ولی اللہ کی تصریحات سے نبوت کے ثبوت کے ایسے طریقے اختیار کئے ہیں جنکے بعد معجزات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ نبوت کے ثبوت کے بعد رسول اللہ صلعم کی نبوت کو خاص طور پر ثابت کیا ہے:۔

"نبوت کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد آنحضرت صلعم کا نبی ہونا ایک بدیہی مسئلہ رہ جاتا ہے۔ نبی کی حقیقت جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اجزائے ذیل سے مرکب ہے۔

(۱) خود کامل ہو (۲) دوسروں کو کامل کر سکتا ہو (۳) اسکے علوم و معارف اکتسابی نہوں بلکہ من جانب اللہ ہوں۔ یہ تمام باتیں جس کمال کے ساتھ آپ کی ذات مبارک میں موجود تھیں۔ کیا ابتدائے آفرینش سے آج تک اسکی نظیر مل سکتی ہے۔" ؎۲

ان الفاظ کی بناء پر کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا نبوت کو ایک کسبی چیز سمجھتے تھے۔ یہ عقائد وہ ہیں جو قدیم علم کلام کی کتابوں میں بھی مذکور ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان مسائل پر ان سے پہلے غور و فکر ہو چکا تھا۔ تاہم شبلی کی اہمیت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جدید طریقہ پر پیش کیا۔ اور ان کے متعلق جو معلومات محققین کی کتابوں میں منتشر تھیں ان کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا۔ لیکن ان کے علاوہ جدید علم کلام کے اور بھی اجزاء ہیں جو قدیم علم کلام کی کتابوں میں مذکور نہیں کیونکہ:۔

؎۱ علم الکلام : صفحہ ۱۸۵ ؎۲ الکلام نقش چہارم : صفحہ ۱۳۰

www.urduchannel.in

"........ قدیم علم کلام میں صرف عقائد اسلام کے متعلق بحث ہوتی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں مخالفین نے اسلام پر جو اعتراضات کئے تھے عقائد کے متعلق تھے۔ لیکن آجکل تاریخی، تمدنی اخلاقی، ہر حیثیت سے مذہب کو جانچا جاتا ہے۔ یورپ کے نزدیک کسی مذہب کے عقائد اس قدر قابل اعتراض نہیں جس قدر اسکے قانونی اور اخلاقی مسائل ہیں۔ ان کے نزدیک تعدد نکاح، طلاق، غلامی، جہاد کا کسی مذہب میں جائز ہونا اس مذہب کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس بناء پر علم کلام میں اس قسم کے مسائل سے بھی بحث کرنی ہوگی۔ اور یہ حصہ بالکل نیا علم کلام ہوگا۔"[1]

مولانا نے اس قسم کے جن مسائل پر الکلام میں بحث کی ہے وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) حقوق انسانی۔

(۲) وراثت۔

(۳) عورتوں کے حقوق

(۴) اسلام ترقی اور تمدن کا مانع نہیں مؤید ہے

(۵) دین و دنیا کا باہمی تعلق۔

تعداد ازدواج، غلامی اور جہاد پر انھوں نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں وہ سرسید اور ان کے بعض رفقاء کی تحریروں کو کافی سمجھتے تھے۔ لیکن اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] الکلام : ص ۶

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

الکلام

الکلام پر اعتراضات، انکی نوعیت اور جواب

الکلام کی اشاعت کے ساتھ ہی اس پر اعتراضات کی بارش شروع ہو گئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ علامہ نے جن مباحث پر قلم اٹھایا تھا ان کے بارے میں تین قسم کے خیالات کے اشخاص تھے۔ ایک پرانی لکیر کے فقیر جنھیں جدید فلسفہ سے اور مغربی علوم و فنون سے بالکل آگاہی نہ تھی۔ دوسری جماعت مغرب زدہ انتہا پسندوں کی تھی جو ہر مغربی مصنف کے خیال کو وحی اور الہام سمجھتے تھے حتیٰ کہ اسلام پر ان کے اعتراضات کو بھی وہ ناقابل تردید تصور کرتے تھے۔ تیسری جماعت اعتدال پسندوں کی تھی جن میں قدیم و جدید کا نہایت اچھا امتزاج تھا۔ سرسید اور ان کے تمام رفقاء اسی آخر الذکر جماعت میں تھے۔ اور پرانے خیال کے علماء پہلی جماعت میں اور جدید مغربی ذہنیت کے لوگ دوسری جماعت میں۔ الکلام میں چونکہ اعتدال کی راہ اختیار کی گئی تھی اسلئے اس سے قدامت پسند اور جدت پسند دونوں جماعتوں میں برہمی پیدا ہو گئی تھی۔ اول الذکر جماعت میں اسلئے کہ شبلی نے پرانی ڈگر سے الگ نئی راہ کیوں اختیار کی۔ اور جدت پسندوں میں اسلئے کہ انھوں نے اسکو قدامت کا جدید نمونہ سمجھ کر ناقابل قبول تصور کیا۔ اور اس پر سخت اعتراضات کئے۔ اس جماعت کے نمائندے مسٹر عبدالماجد حال مولانا عبدالماجد نے "الکلام" پر "الناظر" میں تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ انھوں نے شبلی پر مختلف قسم کے اعتراضات کئے ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) جدید علم کلام لکھنے کے لئے عقائد اسلام سے پوری واقفیت ہونے کے ساتھ ساتھ جدید فلسفہ کا جاننا بھی ضروری ہے جس سے مولانا شبلی محروم ہیں۔

(۲) شبلی کی تصنیف فرید وجدی ایک مصری مصنف کی تصنیف سے ماخوذ ہے۔

(۳) شبلی نے جن فلسفیانہ مسائل مثلاً مذہب و سائنس، وجود باری، معجزہ اور نبوت، روحانیت وغیرہ پر بحثیں کی ہیں اُن کی تردید کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مسٹر عبدالماجد نے (طالب علم کے نام سے) اپنی سے ہر ایک عنوان پر مخالف گروہ کی دلائل نہایت شرح اور تفصیل سے پیش کئے ہیں۔

(۴) یہ بھی اعتراض ہے کہ مسائل زیر بحث میں سے اکثر پر شبلی نے نہایت سرسری بحث کی ہے۔

www.urduchannel.in

ان تنقیدوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ناقد جیسا کہ اسلامی رائٹر میں علامہ عبداللہ یوسف علی نے لکھا تھا، مذہب کو نہایت اورنگ زیب قاسمی محدود معنوں میں استعمال کرتا ہے اور اسکے بیانات جو بظاہر نہایت وقیع معلوم ہوتے ہیں نہایت سطحی ہیں۔ طالب علم نے اپنے خیالات کی تائید میں بکثرت مغربی مصنفین کی رائیں اور ان کی تصانیف سے سند پیش کی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکو خود اپنے اعتراضات پر اعتماد نہیں۔ اور اسے ڈر ہے کہ پڑھنے والے اُسے تسلیم نہ کریں گے اس سے انکار نہیں کہ شبلی نے متنازعہ فیہ مسائل پر جو کچھ لکھا ہے اسکو قطعی اور آخری نہیں کہا جا سکتا۔ مابعد الطبیعاتی مسائل کا کیا ذکر ہے خود سائنس میں جہاں پر نتیجہ بدیہیات اور تجربات سے حاصل کیا جاتا ہے کسی چیز کے متعلق قطعیت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ طالب علم نے دکھایا ہے کہ جن مسائل پر الکلام کی بنیاد ہے، مغربی مصنفین نے کس طرح اُن کی تردید کی ہے۔ طالب علم اگر تلاش کرتے تو خود مسلمان اور خاص طور سے مشرق کے ملحدوں میں ان مسائل پر مختلف بحثیں مل جاتیں۔ اسلئے ان مسائل کا متنازعہ فیہ ہونا کسیطرح کتاب کی وقعت کو کم نہیں کرتا۔ پھر یہ کہ شبلی کو ایک بہت بڑے مفکر یا فلسفی کا درجہ نہیں دیا جاتا۔ جس سے غلطی کا امکان نہ ہو۔ اگر یہ اعتراض تسلیم کر لیا جائے کہ اصل کتاب فرید وجدی کی ہے تو کوئی اعتراض ہی باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ فرید وجدی جدید فلسفہ سے واقف ہے۔ تنقید الکلام کے سلسلے میں جوابی تنقیدیں بھی نکلیں۔ ان میں زیادہ تر منطقیانہ استدلال سے کام لیا گیا ہے۔ اور "وجود باری تعالےٰ" اور "نبوت کی ضرورت" کو منطقیانہ دلائل سے ثابت کیا گیا ہے لیکن یہ تنقیدیں نہایت سرسری ہیں۔ طالب علم صاحب نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ باوجود خامیوں کے کتاب میں بعض ایسی خوبیاں بھی موجود ہیں جو سرسید کی بعض تصانیف کے سوا اردو میں اور کسی تصنیف میں نہیں مل سکتیں۔ شبلی نے خطابیات سے کام نہیں لیا ہے اور نہ :-

> "خطابی جملوں کو منطقی دلائل کا قائم مقام بنایا ہے"۔ [1]

شبلی کی مخصوص متانت کا اعتراف طالب علم کو بھی ہے۔ اور اسکو تسلیم کرتے ہیں کہ تمام کتاب میں :-

> "ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جو متانت کے خلاف ہو۔ یا جس سے کسی فرقہ کی دل آزاری و دل شکنی ہو۔ نہ کسی مقام پر طعن و تشنیع ہے اور نہ کہیں توہین و تحقیر کے الفاظ ہیں"۔ [2]

ایک اور خصوصیت یہ ہے :-

---

[1] الناظر جلد اول نمبر ۱ : جنوری ۱۹۱۱ء : ص ۶

[2] 〃 〃 〃 〃 : ص ۸

www.urduchannel.in

"الکلام کا کوئی صفحہ کھولو اس قدر دلچسپی اور بلاغت کی کیفیت پائی گی کسی خشک علمی تصنیف کے یہ معلوم ہوگا کہ کوئی دلچسپ افسانہ پڑھ رہے ہو۔ ممکن ہے کوئی شخص جہاں تک مضمون کا تعلق ہے الکلام کے تمام استدلالات کو غلط و بادر ہوا تصور کرے لیکن بڑے سے بڑا مخالف بھی ان کی دلفریب طرز ادا کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔"[1]

الکلام کی اہمیت

اس بحث سے یہ نتیجہ نکالنا نامناسب نہ ہوگا کہ شبلی کی یہ تصنیف باوجود بعض نقائص کے اُردو میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہے۔ ان مسائل کو سرسید کے سوا اور کسی مصنف نے اس طریقہ سے پیش نہیں کیا ہے۔ لیکن سرسید کی تصانیف پر ایک تو مذہبی نقطۂ نظر سے اعتراضات ہیں دوسرے اُن کی تحریر ایسی رنگین اور لوچدار نہیں جیسی الکلام کی ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ الکلام کے بعد بھی کوئی دوسری کتاب اس سے بہتر تو کیا اس پائے کی بھی لکھی نہ جا سکی۔ شبلی کی تصنیف فرید وجدی کی کتاب سے ماخوذ سہی[2] لیکن اسکے بعد بھی دنیا کے مختلف حصوں میں لوگوں نے ان مسائل کی تائید میں سوچا اور سمجھا ہوگا۔ کسی قدیم وجدید کی طبقہ میں کوئی ایسا مصنف نہیں پیدا ہوا جو خود اجتہاد نہ کر سکتا تو کم از کم کسی دوسرے کے ہی خیالات کو اپنا کر اپنی زبان میں ادا کر دیتا۔ شبلی نے جو کچھ کیا اس کا اعتراف نہ کرنا بڑی ناشکری ہوگی۔

[2] ماخوذ نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ الکلام میں فلسفۂ جدید کے اقوال جو مادیین کے رد میں ہیں، ان کو جس میں [illegible] اثبات ہے وہ وجدی کی کتاب سے لئے گئے ہیں۔
س

---

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

سوانح مولانا روم

مولانا اور انکی مثنوی کا پایہ

مولانا روم صوفیا اور متکلمین اسلام میں بڑا پایہ رکھتے ہیں۔ ان کی مثنوی کو "ہست قرآں در زباں پہلوی" کہا گیا ہے۔ اور جن کتابوں کا اثر متکلمین اور صوفیاء دونوں نے قبول کیا ہے ان میں مولانا کی یہ مثنوی بھی ہے۔ عصر حاضر کے مفکر شاعر علامہ اقبال نے اُن کو اپنا مرشد قرار دیا ہے اور باوجود روایتی تصوف کے خلاف ہونے کے انھوں نے اپنی شاعری میں مثنوی سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ متکلم کی حیثیت سے شبلی نے مولانا روم کو پہلی مرتبہ پیش کیا ہے۔ لیکن ایک خاص زاویۂ نظر سے۔ وہ اسلامی تعلیم و عقائد کے شاعر بہت پہلے سے تسلیم کئے جاتے ہیں اور ان کی مثنوی اسلامی تصوف کی مہمات کتب میں شمار کیجاتی ہے اور اسکی بہت سی شرحیں اور حواشی لکھے جا چکے ہیں۔

سوانح کی ترتیب و تقسیم

کتاب کے دو حصے ہیں۔ مولانا روم کے سوانح، نام و نسب، ولادت و تعلیم، سلسلۂ باطنی، معاصرین اور اَرباب صحبت، اخلاق اور عادات کا ذکر پہلے حصے میں ہے اور دوسرے حصہ میں ان کے مسائل تعلیمات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مولانا روم کے حالات تذکروں میں نہایت کم ملتے ہیں۔ اسلئے سوانح کا حصہ بہت مختصر ہے۔ ان کی ایک مستقل سوانح عمری ان کے شاگرد سپہ سالار نامی نے لکھی ہے۔ مناقب العارفین میں بھی اُن کے کچھ حالات ہیں۔ اسلئے شبلی نے انھیں دو کتابوں کو اپنا مآخذ قرار دیا ہے۔ البتہ مولانا کے کلام اور بالخصوص مثنوی اور اسکے مباحث پر ایک مفصل تبصرہ ہے۔

علم کلام اور مثنوی

علم کلام کے جو مسائل مثنوی میں مذکور ہیں وہ بیشتر وہی ہیں جو شبلی الکلام میں بیان کر چکے ہیں۔ یعنی ذات باری، صفات باری، حقیقت نبوت، حقیقت وحی، مشاہدۂ ملائکہ، تصدیق نبوت، معجزہ، روح، معاد، جبر و قدر۔ مثنوی علم کلام کے ساتھ چونکہ تصوف و سلوک کی بھی کتاب ہے اسلئے اس میں بہت سے مسائل علم کلام سے زیادہ ہیں۔ مثلاً توحید، وحدت الوجود، مقام سلوک و فنا، و عبادات وغیرہ۔ مولانا شبلی مثنوی کے کلامی مباحث کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

"موجودہ علم کلام کی بنیاد امام غزالی نے ڈالی اور امام رازی نے اس عمارت کو عرش کمال تک پہنچایا۔ اسوقت سے آجتک سینکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ سارا دفتر ہمارے سامنے ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ مسائل عقائد جس خوبی سے مثنوی میں ثابت کئے گئے ہیں یہ تمام دفتر اسکے آگے ہیچ ہے۔ ان تمام تصنیفات کے پڑھنے سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین غلط کو صحیح، دن کو رات، زمین کو آسمان ثابت کر سکتے تھے۔ لیکن ایک مسئلہ میں بھی یقین اور تشفی کی کیفیت نہیں پیدا کر سکتے۔ بخلاف اس کے مولانا روم جس طریقہ سے استدلال کرتے ہیں وہ دل میں اتر کر جاتا ہے۔ اور گو وہ شک و شبہات کے تیرباران کو کلیتاً روک نہیں سکتا۔ تاہم طالب حق کو اطمینان کا حصار ہاتھ آجاتا ہے۔ جسکی پناہ میں وہ اعتراضات کے تیرباران کی پرواہ نہیں کرتا۔"[1]

ذات باری تعالےٰ کے وجود پر پہلا استدلال وہی ہے جو دوسرے متکلمین نے اختیار کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

دست پنہاں وقلم بیں درگزار　　اسپ درجولاں وناپیدا سوار
پس یقیں در عقل ہر دانندہ است　　اینکہ با جنبیدہ، جنبانیدہ است
گر تو آں رامی نہ بینی در نظر　　فہم کن اما بہ اظہار نظر
تن بہ جاں جنبد نمی بینی تو جاں　　لیک از جنبیدن تن جاں بداں

دوسری دلیل یہ ہے کہ تمام عالم میں نظم و ترتیب پائی جاتی ہے۔ اسلئے اس کا کوئی صانع یا مرتب ضرور ہے۔ اسکے علاوہ فلسفیانہ دلائل بھی ہیں:۔

کلامی مسائل میں صفات باری تعالےٰ کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ اسلام کے مختلف فرقوں میں زیادہ تر اختلاف کی بنیاد یہی مسئلہ رہا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ خدا کی نسبت صرف اسقدر معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ "ہے" لیکن اسکی صفات کیا ہیں۔ وہ کیا ہے، کہاں ہے، ادراک انسانی سے باہر ہے۔ مولانا نے ایک چرواہے کی حکایت لکھی ہے جو اللہ تعالےٰ کو مخاطب کر رہا تھا کہ "اے خدا تو مجکو ملتا تو میں تیری خدمت کرتا اور تجھکو اچھے اچھے کھانے کھلاتا" حضرت موسیٰؑ نے اُسے تنبیہہ کرنا چاہی جس پر وحی نازل ہوئی ؎

ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم　　ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم

---

[1] سوانح مولانا روم: مطبوعہ معارف پریس: ص ۹۱

www.urduchannel.in

چنانچہ حکماء اور اہلِ نظر میں خدا کی ذات و صفات پر جو بحث ہے وہ انھیں اصطلاحوں کی ہے۔ مولانا

اورنگ زیب قاسمی

کی حکایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک اصل چیز "نیت" اور اخلاص ہے۔ اسکے ظاہری طریقۂ ادا سے زیادہ بحث نہیں۔ اسکی تفصیل میں مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ 'انگور' کے بارے میں ایک عرب، ایک ترک اور ایک رومی آپس میں جھگڑتے ہیں، مقصد سب کا انگور ہی ہے۔ اور ان میں سے ہر شخص انگور ہی کا نام لیتا ہے لیکن اپنی اپنی زبان میں۔ جس کو وہ نہیں سمجھتے اور آپس میں جھگڑتے ہیں۔ خدا کی ذات و صفات کے بارے میں مولانا کا مسلک یہ ہے کہ انسان خدا کی نسبت صرف اتنا معلوم کرسکتا ہے کہ وہ "ہے"۔ باقی یہ کہ وہ کیا ہے، کہاں ہے، اسکے اوصاف کیا ہیں، ادراکِ انسانی سے باہر ہے۔

دوسرا مسئلہ نبوت کا ہے۔ جس میں وحی کی حقیقت سے بحث کرتے ہوئے مولانا نے صوفیوں کے تجربے کی بناء پر لکھا ہے کہ علاوہ حواسِ خمسہ کے انسان میں ایک خاص قوت ہے جو حواسِ ظاہری کے توسط کے بغیر چیزوں کا ادراک و احساس کرسکتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں؂

آئینۂ دل چوں شود صافی و پاک　　نقشہا بینی بروں از آب و خاک

پس بدانی چونکہ رستی از بدن　　گوش و بینی چشم می تاند شدن

اسطرح وحی کی حقیقت، نبوت اور معجزہ کی بحثیں ہیں۔ آخری بحث 'جبر و قدر' کی ہے۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اس زمانے میں جبکہ اشعری عقائد کی بناء پر عموماً مسلمان 'جبر' کے قائل تھے مولانا نے 'قدر' کی حمایت کی ہے۔ صوفیائے کرام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُن کی تعلیمات نے انسان کو اسکی مجبوری اور بے بسی کا یقین دلاکر اور یہ خیال پیدا کرکے کہ جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ پہلے طے ہوچکا ہے' ولولے اور جد و جہد کی تمام راہیں مسدود کردیں۔ شبلی نے اس مسئلہ کو تفصیل سے نہیں لکھا ہے لیکن مثنوی کے مطالعہ سے صاف مولانا کے عقائد معلوم ہوجاتے ہیں۔ خود اقبال نے مثنوی 'اسرارِ خودی' کے آغاز میں مولانا کے یہ تین شعر لکھے ہیں؂

(حاشیہ: صوفیہ)

دے شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر　　کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت　　شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما

گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزوست

www.urduchannel.in

مثنوی میں مسئلۂ ارتقاء

اورنگ زیب قاسمی

یہ بات غالباً تعجب سے سنی جائیگی کہ مثنوی میں بعض ایسے مسائل ہیں جو یورپ کے علماء نے بہت بعد میں معلوم کئے ۔ مثلاً مسئلۂ ارتقاء ۔ یعنی اس نظریہ کا موجد کہ "انسان" جمادات، نباتات اور حیوانات کی منزل سے گذر کر انسان بنا ہے ۔ اور خارجی اسباب سے اسکی صورت اور سیرت میں تبدیلی ہوتی گئی ہے" ۔ ڈارون کو سمجھا جاتا ہے حالانکہ ڈارون سے صدیوں پہلے مولانا کی مثنوی میں مسئلہ ارتقاء موجود ہے ۔ فرق اتنا ہے کہ ڈارون نے نہایت تفصیل سے اس کا مطالعہ کیا اور سائنٹفک اصولوں پر اپنی تحقیقات کی بنیاد رکھی ۔ اور مولانا نے صرف چند اشعار میں اسکی جانب اشارہ کر دیا ؎

آمدہ اول بہ اقلیم جماد — از جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد — وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چون بحیواں اوفتاد — نامدش حالے نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں — خاصہ در وقت بہار و ضیمران
ہمچو میل کودکاں با مادراں — سر میل خود نداند در لباں
ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت
تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

اسی طریقہ سے مسئلہ تجاذب اجسام بھی مثنوی میں موجود ہے ؎

جملہ اجزائے جہاں از حکم پیش — جفت جفت و عاشقان جفت خویش
ہست ہر جزوے بہ عالم جفت خواہ — راست ہمچوں کہربا و برگ کاہ
آسماں گوید زمیں را مرحبا — با توام چوں آہن و آہن ربا

کتاب جیسا کہ شبلی کی تمہید سے معلوم ہوتا ہے جدید علم کلام کے سلسلے کی چوتھی اور آخری کڑی ہے ۔ اسمیں صرف مولانا روم کے کلامی مسائل کو پیش کیا گیا ہے ۔ چونکہ ان مسائل پر علم الکلام میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے ۔ اسلئے شبلی نے ان کی تائید و تردید کی ضرورت محسوس نہیں کی ۔ اسیوجہ سے کتاب کے دوسرے حصے میں جہاں مولانا کی تعلیمات کا بیان ہے زیادہ تر مولانا کے اشعار نقل کر دینے پر اکتفا کی ہے ۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مثنوی چھ ضخیم جلدوں میں ہے اور اسکے مسائل سینکڑوں صفحوں میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں تو ہمیں شبلی کی تلاش و مطالعہ، انتخاب و ترتیب، ایجاز و اختصار کی بیاختہ

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

داد دینا پڑتی ہے۔ بعض مسائل جو نہایت اہم ہیں مولانا نے نظر انداز کر دیئے ہیں۔ مثلاً مسئلہ جہاد یا تصوف آخر الذکر کے متعلق انھوں نے صرف پانچ صفحے لکھے ہیں۔ اور فٹ نوٹ میں خود اعتراف کیا ہے :-

”تصوف کے عنوان کو میں نے بہت مختصر لکھا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ میں اس کوچہ سے نابلد ہوں“۔ ؎۱

تصوف کے متعلق جو بحث ہے وہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے مکتوب ششم سے ماخوذ ہے۔ جس کا اعتراف خود شبلی نے کیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں شبلی ذاتی واقفیت نہیں رکھتے تھے تو سنی سنائی باتوں کے بیان کرنے کے مقابلہ میں خاموش رہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

مثنوی کے سلسلے میں موجودہ دور کے بزرگوں کی خدمت کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ ایک قاضی تلمذ حسین صاحب جنھوں نے مرآۃ المثنوی مرتب کر کے اس سے استفادے کو بہت آسان بنا دیا۔ اور اُس کے متحد المضمون اشعار کو علٰحدہ علٰحدہ عنوانوں سے مرتب کر کے ایک نہایت مفصل اشاریہ دیدیا ہے۔ جس سے مثنوی سے استفادہ میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ دوسرے سر اقبال مرحوم جنھوں نے مولانا کے فلسفے اور عقائد کی نہایت بلیغ ترجمانی کی ہے۔ اور مثنوی کی روح کو جدید قالب میں ڈھال دیا ہے۔

یہ فقرہ خط کشیدہ خلاف واقعہ ہے۔ بات اتنی ہے کہ اقبال نے اپنی مثنویوں کے لیے مولانا روم کی مثنوی کو نمونہ بنایا ہے اور [illegible] کے لیے [illegible] سے [illegible] اپنی مثنوی روحی تیار کی ہے [illegible] ہر چند کہ [illegible] زمانہ کے لوگوں کو مولانا روم سے حسن عقیدت پیدا کرا دیا ہے۔ مولانا روم کی مثنوی ہی تو فلسفہ پر مبنی ہے اور اقبال کی مثنویاں [illegible] فلسفہ پر

www.urduchannel.in

موازنۂ انیس و دبیر

تاریخ تصنیف

مولانا نے موازنۂ انیس و دبیر حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں لکھا تھا۔ چنانچہ ۹ نومبر ۱۹۰۳ء سے پہلے وہ اپنی اس تصنیف کو اختتام تک پہونچا چکے تھے۔ جیسا کہ ان کے مکتوب مورخہ ۹ نومبر ۱۹۰۳ء سے معلوم ہوتا ہے:۔

"میں نے میر انیس کے کلام پر ایک مفصل ریویو لکھا ہے۔ جو ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوگا۔"[1]

لیکن وہ حیدر آباد سے شائع نہ ہو سکا۔ ۱۹۰۵ء میں جب مولانا وہاں سے مستعفی ہو کر لکھنؤ آگئے تو یہاں بھی کچھ ایسی پریشانیاں رہیں کہ وہ اسے پریس میں نہ بھیج سکے۔ موازنہ کے دیر میں شائع ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس کا مسودہ حیدر آباد میں معتمد تعمیرات کے پاس پڑا رہا۔ انھوں نے خود اسکو چھپوانے کی فکر کی اور نہ مسودہ کو بھیجا[2]۔ مولانا جب اُسطرف سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے ۱۹۰۶ء میں موازنہ کو پھر سے ترتیب دینا شروع کیا۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۶ء کے ایک خط میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

"موازنۂ انیس نہایت عمدہ چھپ رہا ہے۔ مسودات کی ترتیب نے شعر العجم میں ہرج ڈالدیا ہے۔ چار مہینے سے کچھ نہیں لکھا گیا۔"[3]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۶ء سے پہلے مولانا اسے دوبارہ مکمل کر کے مطبع میں دے چکے تھے۔

مرثیہ کی تاریخ، شبلی کا بیان اور اس پر کچھ اضافہ، دکن اور شمالی ہند کی مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ

اس میں شک نہیں کہ انیس اپنے کمال سے زندہ ہیں لیکن ان کمالات سے روشناس کرانے کا سہرا شبلی کے سر ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شمالی ہند میں ہمایوں کی ایران سے واپسی اور شاہ طہماسپ صفوی سے تعلقات قائم ہونے سے پہلے مجالس عزا کا پتہ نہیں چلتا۔ خود ایران

---

[1] مکاتیب شبلی : جلد اول : طبع دوم : صفحہ ۱۰۶ [2] بحوالہ حیات شبلی : صفحہ ۳۸۲

[3] 〃 〃 : 〃 : 〃 : صفحہ ۲۰۸

www.urduchannel.in

میں شاہ طہماسپ سے پہلے مرثیہ کو ادبی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ شبلی نے موازنہ کی تمہید میں صحیح لکھا ہے کہ ایران میں قصیدہ گوئی کا رواج تھا جس نے عرصہ تک مرثیہ گوئی کو فروغ پانے کا موقع نہ دیا۔ شاہ طہماسپ صفوی کے عہد حکومت میں اسکی فرمائش پر محتشم کاشی (المتوفی سنہ ۹۹۶ء) نے اپنا مشہور مرثیہ لکھا جو اب تک ہفت بند کاشی کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ :-

"محتشم کاشی نے آٹھ دس بندوں کا ایک مرثیہ لکھا جو درد و غم کی اصل تصویر ہے"۔[1]

محتشم کے بعد اس صنفِ شاعری کو بڑا فروغ ہوا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ شاعری کے عام انداز کے برعکس اس میں خلوص اور صداقت کو زیادہ دخل تھا۔ اور اس میں ان تکلفات کا التزام نہیں ہوتا تھا جو فارسی ادب بالخصوص شاعری کے خصوصیات ہیں۔ بایں ہمہ غزل اور قصیدہ نے عرصہ تک مرثیہ کو پنپنے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ طالب آملی، غزالی، میلی، سلیم، کلیم، اور دیگر متاخرین شعراء کے یہاں مرثیوں کا فقدان نظر آتا ہے۔ مقبل[1] نے البتہ اسکی طرف توجہ کی اور مرثیہ کو پہلی مرتبہ تاریخ کے رنگ میں لکھا۔ شبلی نے مقبل کا ذکر کیا ہے لیکن اسکی یہ خصوصیت بیان نہیں کی ہے کہ اُس نے ابتدائے سفر سے لے کر شہادت تک کے تمام واقعات بالتفصیل اور مسلسل لکھے۔

شبلی نے ہندوستان میں مرثیہ کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ لیکن دکنی مراثی کے متعلق اس عہد کی معلومات ناقص تھیں۔ اسی وجہ سے شبلی اُن کا ذکر نہیں کر سکے۔ بعد کی تحقیقات یہ ہیں کہ عادل شاہی اور قطب شاہی خاندانوں کے بانی امامیہ مذہب کے پیرو تھے۔ اور اُن کی وجہ سے اثنا عشری عقائد کو اسی طرح دکن میں فروغ ہوا جس طرح ایران میں صفویوں کے عہد میں ہوا تھا۔ بیجاپور اور گولکنڈے میں شاہی عاشور خانے موجود تھے۔ بیجاپور کے شاہی عاشور خانے کا نام "حسینی محل" تھا۔ جسکی تعریف میں ملک الشعراء نصرتی کا کلام موجود ہے۔ گولکنڈے میں جو شاہی عاشور خانے تھے وہاں باقاعدہ عزاداری ہوتی تھی۔ دکنی مرثیہ گویوں میں عام طور پر وجہی، غواصی، لطیف، کاظم، افضل، مرزا نوری، اور ہاشمی کے نام زیادہ مشہور ہیں۔ ان لوگوں نے مرثیہ کو علاوہ قدیم رنگ میں لکھنے کے اُردو نثر میں بھی لکھا ہے۔ دکنی مراثی کا عام رنگ یہ ہے کہ یہ بالعموم ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر لکھے گئے ہیں۔ ان میں ادبی اور فنی شان موجود نہیں۔ بعض دکنی حضرات اس پر مصر ہیں کہ ان مراثی میں ادبی شان پائی جاتی ہے۔ لیکن مرثیوں کے مطالعہ سے اسکی تصدیق

---

[1] موازنہ انیس و دبیر : ص ۷ : انتخاب پریس لکھنؤ ۵۲ بحوالہ موازنہ انیس و دبیر

www.urduchannel.in

نہیں ہوتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نظم ہونے کیوجہ سے جا بجا استعارات اور لطیف کنائے مل جاتے ہیں۔ مرثیہ کی زبان البتہ نہایت سادہ ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

شمالی ہند میں مرثیہ گوئی کی ترقی کا ذکر شبلی نے سب سے پہلے سودا کے سلسلے میں کیا ہے۔ حالانکہ اورنگ زیب کے عہد میں یہاں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا عام طور پر رواج ہو گیا تھا۔ علاوہ فضلی کے جن کی دہ مجلس کا ذکر آزاد نے بھی کیا ہے، مسکین، حزیں، اور غمگین نے بڑا نام پیدا کیا۔ شبلی نے مسکین کا نہایت سرسری تذکرہ سودا کے اس شعر کے حوالے سے کیا ہے [۵]

استقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہیں

حالانکہ مسکین اور اسکے دو بھائی حزیں اور غمگین اردو مراثی کے سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ شیخ چاند درگاہ قلی کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"وے بہ زبان ریختہ گفتن مہارت تمام دارند و در ہمہ شہر کلام ایشہا شہرت دارد۔ و در واقعہ ہر سہ کس بسیار خوب می گویند۔ و الفاظ الم آور و بہ مضامین حسرت آگیں ایجاد می کنند۔ مسودۂ اشعارش بہ تلاش بدست می آرند۔ و در امثال و اقران افتخار می کنند۔ طرز ہائے عجیب و تلاش غریب در فکر این عزیزان می آید۔ حق تعزیہ در کلام خود ادا می کنند۔ وخصوص محنت طیبین و طاہرین برہم گنان ظاہر است۔ صلۂ معتدبہ کہ معاش وفا کند از مکان ہائے معین دارند۔ و فکر غیر از منقبت بخاطر نمی رسانند۔۔۔" [۵]

سودا کے سلسلے میں شبلی نے یہ تو صحیح لکھا ہے کہ انھوں نے مرثیہ کی ترقی میں پہلا قدم اٹھایا۔ اور مرثیہ کو مسدس میں لکھا۔ لیکن اسطرح شبلی سودا کے ساتھ پورا انصاف نہ کر سکے۔ سودا نے صرف مسدس ہی نہیں اختیار کیا بلکہ منفردہ، مثلث، مستزاد، مربع، مربع مستزاد، مخمس ترکیب بند، مخمس ترجیع بند، اور دوہرہ بند اصناف کو بھی اختیار کیا۔ بعض مراثی میں انھوں نے واقعات کربلا کو مسلسل تاریخی ترتیب سے بھی لکھا ہے۔ مثلاً جنگ کی تیاری، شہادت حضرت امام حسینؓ، دربار یزید میں پیشی، وغیرہ۔ انھوں نے سب سے پہلے مراثی میں تشبیب لکھی، جسکی طرف لکھنؤ والوں نے بہت دیر میں توجہ کی۔ کردار نگاری اور منظر نگاری کی بھی مثالیں

---

[۵] بحوالۂ سودا از شیخ چاند مرحوم صـ۲۵۳

www.urduchannel.in

ں ملتی ہیں ۔

میں مرثیہ کی تاریخ

اسکے بعد شبلی نے لکھنؤ میں مرثیے کی ترقی کا ذکر کیا ہے ۔ اور سب سے پہلے ضمیر کا نام لیا ہے ۔ لیکن اُن کے کلام کا اتنا مختصر انتخاب دیا ہے کہ پڑھنے والا ان کو انیس بلے میں لانے کی جرأت نہیں کر سکتا ۔ صرف چند نمونے ملاحظہ ہوں ۔

گھوڑے کی تعریف

گھوڑا تھا چھلاوا کبھی یاں اور کبھی واں تھا — آتا تھا نظر اور کبھی نظروں سے نہاں تھا
جوں برق قیام ایک جگہ اس کو کہاں تھا — گہ میمنہ گہ میسرہ کی سمت رواں تھا
بے حکم تو قسم کے وہ ٹھہرا نہ کہیں پر
رفتار میں رہ رہ گیا سایہ بھی زمیں پر

تھا اسکا عجب رنگ، عجب ڈھنگ، عجب چال — دل دیکھنے والوں کے ہوئے جاتے تھے پامال
فخری تھی، نہ باکھر تھی، نہ تھا موتیوں کا جال — خوشبوئی میں تھے مشک ختن چوٹیوں کے بال
اٹھتا قدم انداز سے رکھتا تھا ادا سے
بیکل ہوا جاتا تھا وہ ہیکل کی صدا سے

سراپا علی اکبر

سر پیچ کا دستار پہ تھا اور ہی سامان — کلغی و جیغہ کی نظر آتی تھی عجب شان
اور موتی کے مالے کی گلے میں تھی نئی شان — خلعت کے ہر اک تار میں تھا برق کا عنوان
اک پھولوں کا اک موتیوں کا ہار پڑا تھا
ڈوبا ہوا وہ حُسن کے دریا میں کھڑا تھا

پانوں سے کیا تھا شب شادی جو منہ لال — سرخی سی گلے میں وہی موجود تھی تا حال
اور ہاتھ میں آیا ہوا سسرال کا رومال — پوشاک کی بو باس کا کیا میں کہوں احوال

www.urduchannel.in

خوشبو میں نہ اس گل [illegible] کم تھا
اورانگ زیب قاسمی
خود عطر میں ڈوبا ہوا سر تا بقدم تھا

منظر نگاری

نکلا جو سرِ مہر گریبانِ سحر سے — انجم کے گہر گر گئے دامانِ سحر سے
مہتاب کا رنگ اڑ گیا دامانِ سحر سے — روشن ہوا صحرا رخِ تابانِ سحر سے
جو وادیٔ ایمن میں ہوا طور کا عالم
وہ خیمۂ شبیر میں تھا نور کا عالم

وہ نور کا تڑکا ادھر اور صبح کا عالم — گھٹنا مہ و انجم کی تجلّی کا وہ کم کم
آتی تھی صدائے دہلِ صبح بھی پیہم — چلتی تھی نسیمِ سحری دشت میں تھم تھم
کرتا تھا چراغِ سحری عزم سفر کا
اور شور درختوں پہ وہ مرغانِ سحر کا

وہ رن میں صبح کا عالم وہ نور کا تڑکا — نفیس رن میں وہ بولک تھی کہ صلِّ علیٰ
کسی کا سبز عمامہ کہیں سفید قبا — دلوں میں جنگ کی حسرت زباں پہ ذکرِ خدا
حسین امام کو کس کس مزے سے تکتے تھے
سبھوں کے شوقِ شہادت میں دل ہمکتے تھے

جذبات نگاری

عابد سے جب سکینہ نے یہ ماجرا سنا — کہتی چلی کہ العطش اے شاہ کربلا
لپٹی سموں سے آن کے گھوڑے کے اور کہا — اتنی ہی دیر میں مجھے تم نے بھلا دیا
دیکھو تو بہ رہا ہے لہو میرے کان سے
فریاد کرنے آئی ہوں میں بابا جان سے

اے بابا گود میں لو کہ لگتا ہے مجھکو ڈر — تم تھے کہاں کہ جل گیا سارا تمہارا گھر

www.urduchannel.in

جب لٹ چکی تو آئیں بی بی آن کی خبر　　صدقے گئی بلائیں لیں مار مار کر
اورنگ زیب قاسمی

حق میں مرے لحاظ نہ تھا انکو آپ کا
سمجھے تھے سایہ اٹھ گیا سر پر سے باپ کا

رُباعی

کسی کا کندہ نگینہ پہ نام ہوتا ہے　　کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جسمیں شام و سحر　　کسی کا کوچ، کسی کا قیام ہوتا ہے

سلام

مجرئی جبکہ سرور سے محبت ہوگی　　وہ محبت تو کلید در جنت ہوگی
جب عیاں مجرئی خاتون قیامت ہوگی　　حشر میں حشر، قیامت میں قیامت ہوگی
صبح نزدیک جو پہنچی تو کہا سرور نے　　جوں چراغ سحری اب مری رخصت ہوگی
نزع کے وقت یہ اکبر نے کہا بابا سے　　ہم جو مر جائیں گے کیا آپ کی حالت ہوگی
اے ضمیر اسلئے ہے مجھکو تمنائے اجل
کہ علیؑ کی مجھے تربت میں زیارت ہوگی

ان کے کلام پر نظر ڈالیں تو بہت ہی باتیں معلوم ہوتی ہیں - جن کی طرف شبلی نے اشارہ بھی نہیں کیا ہے۔ ان سے پہلے مراثی بہت مختصر ہوتے تھے - انھوں نے اسّی نوّے بند کے مرثیے لکھے اور اکثر مراثی تو سو بند سے بھی تجاوز کر گئے ہیں -

لکھنوی شاعری میں جہاں لوگ ہزل، ریختی، ہجو اور اندر سبھا کی طرف مائل تھے، ضمیر نے سب سے پہلے لوگوں کی توجہ اخلاقی شاعری کی طرف موڑی، اور انہیں کا یہ وہ امتیاز ہے جو اُن کو سرآمد شعراء کے صف اولیں میں ممتاز درجہ بخشتا ہے -

ضمیر کے معاصرین میں دلگیر بھی تھے، علامہ شبلی نے اُن کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ یہ قادر الکلام اور پرگو شاعر تھے، اور ان کے مراثی نول کشور پریس نے سات ضخیم جلدوں میں شائع کئے ہیں - اسمیں سے ہر جلد اوسطاً پانچسو صفحات پر مشتمل ہے - اور ہر صفحے پر تقریباً نو بند یعنی ستائیس شعر ہیں - اسطرح ان کے اشعار کی مجموعی تعداد چوالیس

www.urduchannel.in

ہزار سے کچھ اوپر ہوتی ہے۔ انکی شہرت اور مقبولیت کا انداز[illegible] کی اس کثرت سے ہوتا ہے تو دوسری طرف خود ان مراثی کے ناشرین لکھتے ہیں:۔

اورنگ زیب قاسمی

"مدار کل خواندگان مرثیہ و شائق گریہ با حوال آل عبا علیہ السّلام اسی پر ہے۔ علی الخصوص نامی خواندگان کا بلکہ موجد طرز سوزخوانی میر علی صاحب و سلطان علی خانصاحب اور اکثر اہل کمال کی سوزخوانی اور خواندگی انھیں مرثیوں پر تھی" [1]

میر ضمیر کی طرح اِنھوں نے بھی تلوار کی تعریف، گھوڑے کی تعریف، سراپا، رزمیہ علٰحدہ علٰحدہ لکھا ہے:۔

تلوار کی تعریف

گہ صدر پہ، گہ شانوں پہ، گہ فرق لعیں پر   گہ رخ پہ، گہے کوہ پر، اور گاہ زمیں پر
اسوار پہ تھی گاہ، گہے گھوڑے کی زیں پر   تھمتی تھی کسی جا پہ، نہ رکتی تھی کہیں پر
گہ برق تھی، گہ شعلہ تھی، اور گاہ ہوا تھی
بند آنکھ ہوئی جاتی تھی ہر بار قضا کی

گھوڑے کی تعریف

دونوں ان پیاروں کے گھوڑے تھے عجب چھل بل کے   تیز رو ایسے تھے دو ٹکڑے ہوں جوں بادل کے
تھے سبک گام وہ سب اور تھے راکب بل کے   حکم پر پھرتے تھے گویا تھے وہ مرکب کل کے

واقعہ نگاری

ہر چند بہت پیاسا تھا وہ صاعقہ رفتار   پر پانی پہ منہ ڈالا نہ اس گھوڑے نے زنہار
حیوان تھا پر انساں سے سوا مرتبہ داں تھا   منہ پھیر کے عباس کی جانب نگراں تھا

بعد میں انیس نے اسی مضمون کو اسطرح ادا کیا ہے ؎

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند   پانی کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند   چمکارتے تھے حضرت عباسؑ ارجمند

---

[1]

www.urduchannel.in

تڑپا یا تھا جگر کو جو اور تیغ رز آب تا فتا کل مسی
گردن پھر کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

جذبات نگاری

میداں میں شاہ لے چلے جس وقت وہ بسیر
ہر چند غش تھا پیاس سے وہ غیرت قمر
شرکت کا خون کی نہیں جاتا ہے پر اثر
شکل رباب تکنے لگا منہ کو پھیر کر
مادر کا ہوش پیار کی چیتوں نے کھو دیا
صغرٰی کی سمت دیکھ کے ماں نے بھی رو دیا

تشبیہات

تمام طور ادھر روسیاہیوں کا تھا
کہوں نہ فوج کہ جنگل سیاہیوں کا تھا

خود دوڑ کے مانند فرس جاتی تھی تلوار
صابون صفت کوہ میں دھنس جاتی تھی تلوار

ضمیر اور دلگیر کے علاوہ فصیح بھی اس عہد کے نامور شعراء میں تھے۔ لیکن وہ ہندوستان سے ہجرت کرکے حج کو چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔ اسی لئے ان کے کلام کا سرمایہ زیادہ ہم تک نہ پہونچ سکا۔ تاہم جذبات نگاری اور واقعات نگاری کی مثالیں اُن کے یہاں بھی موجود ہیں۔ خلیق کا ذکر شبلی نے خود کیا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ جو کلیات خلیق کے نام سے مشہور ہے اگر وہ فی الحقیقت خلیق کا ہے تو انیس کو ترجیح کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

اس تمہید کے بعد مولانا شبلی نے انیس کی مرثیہ گوئی پر بالتفصیل اظہار خیال کیا ہے اور بتایا ہے کہ انیس کی منظر نگاری ترکہ میں ملی تھی۔ پھر فصاحت و بلاغت کے اصول قائم کئے ہیں اور ان پر انیس کی شاعری کو پرکھا ہے۔ یہ اصول نہایت مستحکم اور قابل قدر ہیں۔ اسکے بعد ایک الگ عنوان قائم کرکے بتایا ہے کہ حسن کلام کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کئے جائیں۔

جدید تعلیم یافتہ گروہ قافیہ و ردیف کے التزام کو مضمون کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تصور کرتا ہے۔ مولانا کے نزدیک ردیف تال اور سم کا کام دیتی ہے۔ جسطرح راگ بغیر تال کے بدمزہ ہے

www.urduchannel.in

معلوم ہوتا ہے اسطرح شعر بغیر ردیف کے۔

اورنگ زیب قاسمی

علم معنی کی کتابوں میں سب سے پہلے فصاحت و بلاغت سے بحث کیجاتی ہے۔ مولانا پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس فن میں وسعت پیدا کی اور اسکو اُردو شاعری پر منطبق کیا۔ اسکے بعد تشبیہات اور استعارات کی بحث آتی ہے جسے مولانا نے دلنشین پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اور ان کے جزئیات اور مدارج پورے طور پر سمجھائے ہیں۔

صنائع و بدائع مولانا کے نزدیک یہی شاعری اور انشا پردازی کا دیباچۂ زوال ہیں تاہم اُن کے نزدیک بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ بے تکلفی سے بغیر کسی اہتمام کے آجائیں تو کلام میں حُسن پیدا ہوجاتا ہے۔

موازنہ پر بحث

شبلی کی تنقید کا جائزہ لینے سے پہلے بعض امور کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ مثلاً مرثیہ کی ترقی فنی حیثیت سے انیسؔ و دبیرؔ سے کم از کم سَو سال پہلے بارھویں صدی ہجری میں سوداؔ، غمگینؔ، مسکینؔ وغیرہ کے عہد میں شروع ہوچکی تھیں۔ انیسؔ سے پہلے خود لکھنوی شعراء مرثیہ کو اس قالب میں ڈھال چکے تھے جس میں وہ انیسؔ کے یہاں ملتا ہے۔ جزئیات نگاری مقبول ہوچکی تھی اور واقعات کربلا کے مختلف حصّے کسی نہ کسی شاعر کے یہاں نظم ہوچکے تھے۔ منظر نگاری اور جذبات نگاری دونوں میں داد کمال انیسؔ سے پہلے دی جاچکی تھی۔ بایں ہمہ شبلی نے انیس کے کلام میں حسب ذیل خوبیاں بتائی ہیں۔

(۱) ان کا کلام فصیح ہے

(۲) نظم میں کلام کی اصلی ترتیب قائم رہتی ہے۔

(۳) روزمرہ کا استعمال بہت خوبی سے کیا ہے۔

(۴) مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

(۵) موزوں بحر، ردیف، قافیہ، منتخب کرتے ہیں۔

(۶) علاوہ فصاحت کے بلاغت کلام اور اسکے جزئیات کا بھی لحاظ رکھتے ہیں۔

(۷) جذبات انسانی کے نظم کرنے کا خاص سلیقہ ہے۔

(۸) منظر نگاری اچھی کرتے ہیں۔

(۹) واقعہ نگاری میں کمال حاصل ہے۔

www.urduchannel.in

ان خوبیوں کو شبلی نے دو سو تیرہ ۲۱۳ صفحات میں متعدد مثالوں سے واضح کیا ہے۔ آخر میں میر انیس کے کلام پر اعتراضات کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کا جواب دیا ہے۔ اور یہاں کتاب کا ایک حصہ ختم ہو جاتا ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

اصل بحث انیس و دبیر کے موازنہ کی ہے۔ مولانا شبلی دبیر کے متعلق لکھتے ہیں :-

"فصاحت اُن کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی۔ بندش میں تعقید اور اغلاق، تشبیہات و استعارات اکثر دور از کار۔ بلاغت نام کو نہیں۔ کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں خیال بندی اور مضمون آفرینی البتہ ہے۔ لیکن اکثر جگہ اسکو سنبھال نہیں سکتے۔" ؎۱

اس بیان میں شبلی نے دبیر ہی کے ساتھ نہیں، اپنے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا ہے۔ تنقید میں شبلی کا یہ لہجہ اس اعتبار سے اور زیادہ تعجب انگیز ہے کہ یہ رنگ اُن کی تصانیف میں کہیں نہیں ملتا ان اعتراضات کی شہادت میں شبلی نے جو اشعار پیش کئے ہیں وہ اس سرمایہ کلام سے کوئی نسبت نہیں رکھتے جو دبیر کی تصنیف ہے۔ سید نظیر الحسن نے موازنہ کا جواب "المیزان" کے نام سے لکھا ہے اور بتایا ہے کہ دبیر کے کلام میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو شبلی نے انیس کے یہاں بتائے ہیں۔ اور انیس کے یہاں وہ تمام اسقام پائے جاتے ہیں جو دبیر کے یہاں ثابت کئے گئے ہیں۔ اس تصنیف سے دبیر کے شاعرانہ جوہر منظر عام پر آئے۔ کتاب پر خود شبلی، مصنف کے نام ایک خط میں اسطرح اظہار خیال کرتے ہیں :-

"........ ضعف کیوجہ سے روزمرہ کے ضروری مشاغل کے سوا کسی کام کا نہیں رہا۔ تاہم آپکی کتاب کی دلچسپی نے میرا کافی وقت لیا۔ آپنے نہایت متانت و سنجیدگی سے کتاب کا جواب لکھا ہے۔ جو اس زمانے میں نہایت غنیمت ہے۔ آج مجھکو موازنہ کی قدر ہوئی۔ کیونکہ اس بہانہ سے اُردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا۔ اور ایک باکمال (مرزا دبیر مرحوم) کے جواہر اچھی طرح کھلے۔

آپ کی عنایت کا مشکور اور طرز تحریر کا مداح ہوں۔" ؎۲

دراصل انیس اور دبیر کی شاعری میں دہلی اور لکھنؤ کے رنگ کا فرق ہے۔ انیس کا سارا خاندان میر حسن اور خلیق سے لے کر انیس تک اپنی رفتار و گفتار میں آخر تک دہلوی رہے۔ یہی روایات انکی شاعری میں ملتی ہیں۔ وہ جذبات نگاری پر زیادہ زور دیتے ہیں اور شاعری میں اُن کا مسلک "مضمون آفرینی"

؎۱ موازنۂ انیس و دبیر : صفحہ ۲۳۳ : مطبوعہ انالظر پریس لکھنؤ : سنہ ۱۹۲۴ء

؎۲ مقالات شبلی : جلد اول : صفحہ ۳۲۷

www.urduchannel.in

کی جگہ "اثر آفرینی" ہوتا ہے۔ مرزا دبیر اگرچہ دہلی میں پیدا ہوئے لیکن سات برس کی عمر میں لکھنؤ چلے آئے۔ ان کی والدہ بھی لکھنوی تھیں اسلئے دہلی کی خصوصیات ان کا مزاج نہ بن سکیں۔ علاوہ ازیں اسی عہد کے مذاق کے مطابق دبیر نے تحصیل علوم میں کافی وقت صرف کیا۔ چنانچہ علمیت نے اُن میں شاعرانہ اختراع کی استعداد کو جو تخیل کی پیداوار ہے مزید قوت پہونچائی۔

اورنگ زیب قاسمی

لیکن اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ شبلی نے دبیر کے ساتھ وہ انصاف روا نہیں رکھا جسکے وہ مستحق تھے اور انیس کی بیجا پاسداری کی ہے تو بھی اسمیں شک نہیں کہ انیس میں شاعری کا ملکہ خداداد تھا۔ وہ مرثیہ کے دم سے زندہ نہیں ہیں مرثیئے کو اُن کے دم سے فروغ ہوا۔ دبیر مرثیہ گو نہ ہوتے تو شاید اُن کو وہ شہرت بھی نصیب نہ ہوتی جو مرثیہ کیوجہ سے اُن کو حاصل ہے۔ دبیر اپنا کمال منوانے کی کوشش کرتے ہیں، انیس کے سامنے ہم خود جھک جاتے ہیں۔

مولانا شبلی نے فصاحت وبلاغت، جذبات واحساسات اور شاعری کے دیگر لوازم کے متعلق اس کتاب میں جو نکات درج کئے ہیں وہ اردو زبان کی کسی اور کتاب میں مجموعی طور پر نہیں مل سکتے۔ اس لئے موازنہ کو اُردو میں معانی وبیان کی کتاب بنا دیا ہے۔ جس سے استفادہ ہر ادیب وشاعر کے لئے ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ قدیم وجدید کی آمیزش کا پرتو جو ان کی تمام تصنیفات میں پایا جاتا ہے اس کتاب میں بھی موجود ہے۔ قدیم عربی زبان کی ادبی کتابوں میں شاعری کے محاسن ومعائب کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اور جدید دور میں جو چیزیں شاعری کا معیار کمال سمجھی جاتی ہیں اُن سب کو انہوں نے نہایت خوبی سے میر انیس کے کلام پر منطبق کر دیا ہے۔ اسلئے اُردو زبان میں شاعری کا ایک مکمل معیار قائم ہو گیا ہے۔ آج تک مرثیہ شاعری کی صرف ایک صنف سمجھا جاتا تھا لیکن مولانا نے مرثیہ کے تمام اجزاء کی تحلیل کرکے یہ دکھلایا ہے کہ وہ شاعری کے متعدد اصناف کا مجموعہ ہے۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

شعر العجم

شعر العجم کی حیثیت

خالص ادبی اور تنقیدی صنف میں شعر العجم شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اگرچہ "موازنۂ انیس و دبیر" میں انھوں نے نہایت سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ لیکن اسکو شعر العجم کے مباحث کی وسعت، گہرائی اور دقیقہ سنجی سے کوئی نسبت نہیں۔ انیس ہمیشہ سے مرزا دبیر کے حریف سمجھے جاتے تھے۔ اور ان دونوں کے کلام کا موازنہ کیا جاتا تھا۔ شبلی نے اگرچہ اپنے نزدیک اس کا فیصلہ کر دیا لیکن درحقیقت یہ بحث ابھی تک باقی ہے۔ اور چونکہ موازنہ میں انیس کی طرفداری صاف جھلکتی ہے اسلئے وہ بے لاگ تنقید کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ انیس کی شاعرانہ عظمت مسلم ہے۔ ان کے کلام نے لکھنؤ کی سوسائٹی اور وہاں کی شاعری دونوں کی اصلاح کی۔ لیکن اس سے ان کے ادبی رجحانات کی کیفیت پوری طرح معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ مرثیہ شاعری کی صرف ایک صنف ہے۔ اسکے مقابلہ میں شعر العجم شعرائے ایران کا تنقیدی تذکرہ ہے۔ لیکن شاعری کے اس دفتر میں ان کی تہذیب، تمدن، معاشرت، جذبات، معتقدات، سب کچھ آگئے ہیں۔ اسلئے شعر العجم صرف شعر العجم نہیں ہے بلکہ ایران کی کئی سو سال کی ذہنی تاریخ بھی کہی جا سکتی ہے۔

فارسی شاعری کا مرتبہ

ایشیائی شاعری میں اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر عربی کی شاعری کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ لیکن ظہور اسلام کے بعد کچھ دنوں کے لئے اسکی ترقی رک گئی تھی۔ اور وکید کے عہد سے پہلے دوبارہ اسکی تجدید نہ ہو سکی۔ ایران میں شعر و شاعری کا جو دفتر تیار ہوا وہ کسی طرح عربی شاعری سے کم نہیں۔ بلکہ بعض اصناف ایشیائی شاعری میں ایسی بھی ہیں جن کا وجود عربی میں نہیں ہے۔ اسکی مفصل بحث آگے آئے گی۔ ایرانی شاعری نے براہ راست ہندوستان کی شاعری پر اثر ڈالا۔ اور اسی کے زیر سایہ اردو شعر و شاعری پروان چڑھی۔ اسلئے بنیادی طور پر جو چیزیں فارسی شاعری میں تھیں وہ اردو میں بھی قائم اور برقرار رہیں۔ شبلی کے زمانے میں اگرچہ انگریزی تعلیم کے رواج نے اور بالخصوص مسلمانوں کی سلطنت کے خاتمہ نے فارسی

www.urduchannel.in

کو بڑا صدمہ پہنچایا ۔ تاہم مسلمانوں کی علمی سوسائٹی میں فارسی شعر کا ذوق ابھی باقی تھا ۔ انھیں دونوں ضرورتوں نے شعر العجم لکھنے پر مولانا کو آمادہ کیا ۔

یہ امر نہایت حیرت انگیز ہے کہ اُردو سے قطع نظر اِس زمانے تک خود فارسی میں شعر العجم کے طرز کی فارسی شاعری کی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی تھی ۔ چنانچہ پروفیسر براؤن نے جب تاریخ ادبیات عجم مرتب کی تو خود ایرانیوں نے اسے نہایت نادر سمجھا ۔ اور اسکو انگریزی سے فارسی میں منتقل کیا ۔ اسکے مترجم رشید یاسمین ہیں جو ایران کے جدید شعرا و ادبا میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں ۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ فارسی میں ایرانی شعرا کے حالات بالکل نہیں لکھے گئے ۔ بلکہ یہ مقصد ہے کہ اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں ان کی حیثیت بیاضوں یا تذکروں سے زیادہ نہیں ۔ جن میں شعرا کے مختصر حالات اور انکے کلام کا انتخاب یا نمونہ دیدیا ہے ۔ اور ان پر تنقید محض برائے نام ہے ۔ بلکہ عموماً شعرا کے حالات بھی نہایت مختصر ہیں جنمیں نام کے علاوہ تاریخ ولادت اور وفات تک کا پتہ نہیں چلتا ۔ اُن سے یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ فارسی شاعری کی خصوصیات کیا ہیں ۔ ہر دور کی سوسائٹی اور حالات نے شاعری پر کیا اثر ڈالا ۔ اس میں عہد بہ عہد کیا تغیرات ہوئے ۔ ایرانی شعراء نے کہاں تک اپنے زمانے کے ماحول اور حالات کی ترجمانی کی ہے ۔ کن اسباب کی بنا پر اس میں تغیرات ہوئے اور اس قسم کے دوسرے سوالات کا جواب ہم کو ان تذکروں سے نہیں ملتا ۔ تنقید بھی محض برائے نام ہے ۔ جس میں بالعموم تذکرہ نگاروں نے اپنی ذاتی رائے اور پسند و ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے ۔ اور یہ تنقیدیں بھی زیادہ تر لفظی ہیں اور اشعار کو شعر و شاعری کے چند مقررہ اصولوں اور فنی پہلوؤں کی روشنی میں پرکھا گیا ہے ۔ خود شاعری کی تنقید کے اصول ان تذکروں میں نہیں ملتے ۔ جس سے تنقید نگاروں کے اجتہاد کا کوئی اندازہ ہوسکتا ۔ اس قسم کی بیاضیں جن کو تذکرہ کا نام دیا گیا ہے بہت ہیں جو ہندوستان اور ایران میں لکھے گئے ۔ لیکن کسی یوروپین زبان کی شاعری کی تاریخ کے مقابلے میں ان تذکروں کو لانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ حالانکہ فارسی شاعری اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر یورپ کی کسی زبان کی شاعری سے کسی طرح کم پایہ نہیں رکھتی ۔ یہی وجہ ہے کہ جب فارسی کا کوئی شاعر کسی مغربی ناقد کو پسند آیا تو اُسنے اُسے گوشۂ گمنامی سے نکال کر دنیا سے روشناس کرادیا ۔ اس سلسلے میں عمر خیام اور اسکے ناقد فٹز الڈ (Fitzgerald) کا نام لینا کافی ہے ۔

تاریخ تصنیف

شبلی، شعر العجم کی تصنیف سے کم از کم بارہ سال پہلے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کرنے لگے تھے ۔ ۱۸۹۲ء میں انھیں علی گڑھ کے پروفیسر آرنلڈ سے معلوم ہوا کہ

www.urduchannel.in

جرمنی کے پروفیسر جیمس دارمسٹیٹر نے فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں کیومرث سے لیکر اسلام کے عہد تک

اورنگ زیب قاسمی

چار دور قائم کئے ہیں۔ اور ہر دور کی زبان کی صرف ونحو، لغات، الفاظ، تغیرات پر مفصل ریویو لکھا ہے۔ لیکن یہ دراصل زبان کی تاریخ تھی جس میں ژند، پہلوی وغیرہ پر محققانہ بحث کی گئی تھی[1] شاعری کا ذکر نہیں تھا۔ چند سال تک مولانا خود اس کام کو پورا نہ کرسکے اور علم کلام کی طرف متوجہ رہے لیکن یہ خیال برابر اُن کے ذہن میں رہا۔ جولائی ۱۸۹۹ء کے ایک خط میں نواب صدر یار جنگ کو لکھتے ہیں :۔

"آپ کو اگر مرغوب ہو تو فارسی شاعری کی تاریخ اور عہد بہ عہد کی خصوصیتیں اور ترقیاں لیجئے۔ ان تمام مضامین میں آپ کی اسسٹنٹی کا کام دے سکتا ہوں۔ مواد تحریر، عنوانات مضامین وغیرہ وغیرہ، سب مہیا کر دوں گا۔"[2]

اسی مہینہ اور اسی سنہ کے ایک دوسرے خط میں ان کے لئے اس کا خاکہ قائم کیا گیا ہے :۔

(۱) اسکے ادوار کی تقسیم (مجمع الفصحاء میں چار دور قائم کئے ہیں)

(۲) ہر دور کی خصوصیات شاعری اور متروکات الفاظ و محاورات۔

(۳) بڑے بڑے شعراء کے کلام پر ریویو۔

(۴) شاعری سے ملکی، اخلاقی، معاشرتی، اثر کیا پیدا ہوا۔"[3]

اس وسیع پیمانے پر فارسی شاعری کی تاریخ مولانا شروانی کے پیش نظر نہ تھی۔ تاہم محدود پیمانے پر فارسی غزل گوئی کی تاریخ پر ایک عمدہ مضمون لکھنا شروع کیا اور مولانا نے اس پر ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ چنانچہ ۲۲ جنوری ۱۹۰۳ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"غزل کے آپ نے جو دور قائم کئے ہیں اس کا ٹھاٹھ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ عہدہ برآئی کہاں تک ہوتی ہے۔ ورنہ عنوان جس قدر مقرر کیا گیا ہے اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے۔"[4]

الکلام کے سلسلے سے فارغ ہوتے ہی ۶ مارچ ۱۹۰۶ء کو اس کام کا آغاز کیا اور ۶ دسمبر ۱۹۰۷ء[5] کو پہلی جلد ختم ہوگئی۔ ممکن تھا کہ اس سے پہلے کتاب ختم ہوجاتی لیکن بیچ میں مولانا کا پیر بندوق لگ جانے کے حادثہ میں کاٹا گیا اسلئے اس میں کچھ دیر ہوئی۔

---

[1] بحوالۂ شعر العجم : جلد اول : ص ۳ : مطبوعہ معارف پریس : ۱۹۱۹ء

[2] مکاتیب شبلی : " : ص ۱۱۶

[3] " : " : ص ۱۱۸

[4] " : " : ص ۱۳۶

[5] شعر العجم : " : ص ۵

www.urduchannel.in

اسی زمانے میں پروفیسر براؤن نے اپنی تصنیف "ادبیات ایران" شروع کی۔ پہلے مولانا اسکی

اورنگ زیب قاسمی

اشاعت کا حال سنکر کچھ گھبرائے لیکن پھر یہ معلوم کرکے کہ یہ کتاب کے پہلے حصہ میں براؤن نے شبلی کے میدان کو بالکل ہاتھ نہیں لگایا وہ مطمئن ہوگئے۔ ہندوستان میں آزاد نے "سخندان فارس" اور نگارستان فارس لکھی لیکن ان دونوں کتابوں سے بھی مولانا کی کتاب الگ رہی۔ اور حق یہ ہے کہ اسکے بعد بھی اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں نہ صرف اولیت بلکہ افضلیت کا بھی حق شعر العجم ہی کو پہونچتا ہے۔

کتاب کی ترتیب و تقسیم کتاب ۵ جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد ۲۶۲ صفحات پر محیط ہے۔ تمہید، سبب تصنیف، اور ماخذات کے علاوہ پہلے باب میں شعر کی حقیقت، اور ایران میں فارسی شاعری کی ابتداء کے اسباب اور اثرات سے بحث کی ہے۔ اسکے بعد رودکی۔ عنصری۔ فرخی، فردوسی، اسدی، منوچہری، سنائی، خیام، انوری اور نظامی گنجوی کا حال ہے۔ دوسری جلد میں جو ۲۰۳ صفحات پر مشتمل ہے خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ اور ابن یمین تک کے شعراء کا تذکرہ ہے۔ ان میں علاوہ ان تین ناموں کے کمال اسمٰعیل، شیخ سعدی، امیر خسرو اور سلمان ساؤجی کا بھی حال لکھا ہے۔ تیسری جلد میں ۲۳۰ صفحات ہیں جس میں فارسی شاعری کے دور آخر یعنی فغانی سے ابوطالب کلیم تک کی بحث ہے۔ اس میں اس دور کی خصوصیات بتانے کے علاوہ فغانی شیرازی، فیضی، عرفی، نظیری، طالب آملی مرزا صائب اور ابوطالب کلیم شامل ہیں۔ چوتھی جلد جو ۲۳۹ صفحات کی ہے اور جس میں نہایت اہم مضامین سے بحث کی ہے۔ اس میں تین باب ہیں۔ پہلے میں شاعری کی حقیقت، شاعری کے اصلی عناصر مثلاً محاکات، تخیل، تشبیہ و استعارہ، جدت و لطف ادا، حسن الفاظ سادگی ادا، شاعری کے استعمال اور اسکی اہمیت پر ایک مجموعی بحث ہے۔ دوسرے باب میں لکھا ہے کہ ایران میں شاعری کیونکر پیدا ہوئی اور کسطرح اسنے عہد بہ عہد ترقی کی یا مائل بہ تنزل ہوئی۔ اس میں عربی شاعری کے اثرات، فارسی شاعری کا اثر ادب پر، نظام حکومت، نظام حکومت کا اثر، شاعری پر، آب و ہوا اور مناظر قدرت کا ذکر اور اس کا اثر شاعری پر تفصیل سے لکھا ہے۔ تیسرے باب میں فارسی شاعری پر اجمالی ریویو کرکے مختلف اصناف پر تنقید کی ہے۔ پہلی تنقید مثنوی کی صنف پر ریویو ہے۔ اس میں شاہنامہ پر جو شبلی کے نزدیک فارسی مثنویوں میں بڑا پایہ رکھتا ہے، تفصیلی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اور اس پر یہ جلد ختم ہوگئی ہے۔ پانچواں حصہ دراصل جلد چہارم کا تکملہ ہے۔ اس میں قصیدہ، عشقیہ شاعری، صوفیانہ شاعری، اخلاقی شاعری، اور فلسفیانہ شاعری۔ اسکے نمائندے اور نمونوں سے بحث کی ہے۔ یہ آخری جلد ۲۲۷ صفحات میں ختم ہوئی ہے اس طرح

www.urduchannel.in

شعر العجم کی کل ضخامت ۱۴۶۰ صفحات ہوتی ہے۔ اتنا مفصل لٹریچر فارسی شاعری پر اُردو میں اور کہیں نہیں ملتا۔

اورنگ زیب قاسمی

تنقید شعر العجم اور اسکے بعض نکات پر بحث و جرح

شعر العجم پر پروفیسر محمود شیرانی نے نہایت مفصل تنقید لکھی ہے۔ اس میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ شعراء کے واقعات اور حالات کے بارے میں مختلف تذکرہ نگاروں کے درمیان جزوی اختلاف ہو سکتا ہے۔ دوسرے کلام پر جو رائے دی گئی ہے اس میں اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ آخر الذکر صورت شبلی کی شعر العجم سے مخصوص نہیں۔ شعر و شاعری میں اس قسم کے اختلافات ہمیشہ ہوئے ہیں۔ اور ان میں اگر متانت اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے تو اس سے علم و ادب کی ترقی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے اختلافات سے جو نسبتاً کم ہیں کتاب کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پہلی چیز البتہ لائق توجہ ہے، لیکن اس میں بھی زیادہ تر نام، سنہ ولادت، وفات اور وطن وغیرہ کے جزوی اختلافات ہیں جو دراصل اصل مآخذوں کے ہیں۔ اگر شعر العجم کے بیانات سب تذکروں کے خلاف ہوتے تو البتہ یہ کتاب کی خامی ہوتی لیکن یہ اختلافات اصلی مآخذوں کے ہیں اسلئے ناقد کی یہ تنقید دراصل شعر العجم پر کی تنقید نہیں بلکہ اصل فارسی تذکروں کی تنقید ہے۔ پھر بہت سے قدیم اور نایاب تذکرے شعر العجم کی اشاعت کے بعد شائع ہوئے۔ اگر یہ شبلی کے پیش نظر ہوتے تو شیرانی صاحب کو اتنی خوردہ گیری کا بھی موقع نہ ملتا۔ علامہ شبلی نے محدود مآخذوں سے جتنا مواد فراہم کر دیا ہے وہ دوسرے کی بس کی بات نہ تھی۔ شعر العجم پر جتنے اعتراضات کئے گئے ہیں وہ بیشتر اسی قبیل کے ہیں۔ اسلئے ان کی چنداں اہمیت نہیں ہے۔ خود یہ تنقید بھی اس قسم کی فروگزاشتوں سے خالی نہیں ہے۔ حکیم سنائی کے سلسلے میں شبلی لکھتے ہیں:۔

حکیم سنائی

"مجدود نام۔ ابوالمجد کنیت، سنائی تخلص، غزنین وطن تھا۔"[1]

پروفیسر شیرانی نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔ حالانکہ براؤن سے اس پر یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ باپ کا نام آدم تھا اور وطن کے بارے میں قطعی طور پر غزنہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ بعض لوگوں نے بلخ بھی لکھا ہے۔ آگے چل کر شیرانی صاحب لکھتے ہیں:۔

"دوانہ لائے خوار کے قطعے کے ذکر کے بعد جسکو بسبب کثرت شہرت قلم انداز کیا جاتا ہے علامہ شبلی فرماتے ہیں"۔[2]

حالانکہ براؤن نے صاف لکھا ہے کہ درباری زندگی سے متصوفانہ رنگ میں آنے کے واقعات جو دولت شاہ نے اپنے

---

[1] شعر العجم: جلد اول: صفحہ ۲۱۶ [2] رسالہ اردو: اکتوبر ۱۹۲۳ء: صفحہ ۶۹۸

www.urduchannel.in

تذکرے میں لکھے ہیں زیادہ قابل لحاظ نہیں ۔ چنانچہ شبلی اگرچہ اس سلسلے میں کسی قطعی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکے تھے

اورنگ زیب قاسمی

لیکن فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں :-

" نفحات الانس میں بہرام شاہ کے بجائے سلطان محمود کا نام لکھا ہے ۔ اسی بنا پر تاریخ فرشتہ نے اس واقعہ سے انکار کیا ہے ۔" [1]

شبلی نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ بہرام شاہ نے اپنی بہن کو ان کے عقد میں دینا چاہا ۔ لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا ۔ اسپر شیرانی صاحب لکھتے ہیں کہ جس کتاب میں یہ اشعار آئے ہیں جنمیں اس واقعہ کا ذکر ہے وہ آخر عمر کی تصنیف ہے ۔ اسلئے اس زمانے میں شادی کے لئے سلسلہ جنبانی ہونا قرین قیاس نہیں ۔ اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان اشعار میں بہرام شاہ کو مخاطب کیا گیا ہے ۔ لیکن شیرانی صاحب قیاس کے علاوہ اپنی تائید میں کوئی تاریخی شہادت پیش نہیں کرسکے ۔ سنائی کے کلام پر شبلی نے جو رائے دی ہے اس سے شیرانی صاحب کو بھی اتفاق ہے ۔ البتہ انہوں نے سنائی کی غزل کی زیادہ تعریف کی ہے ۔ اس مسئلہ میں بھی انکا خیال غالباً براؤن سے ماخوذ ہے جو سنائی کے دیوان غزلیات کو ان کی مشہور مثنوی "حدیقہ" پر ترجیح دیتا ہے ۔ شبلی براؤن کی کتاب دیکھ چکے تھے جس کا ذکر انہوں نے دیباچہ میں بھی کیا ہے ۔ انہوں نے اس خیال کے معلوم ہونے کے بعد جو کچھ لکھا ہے وہ غالباً خود ان کا اپنا ہے

خیام

خیام پر شیرانی صاحب نے خود تنقید نہیں کی ہے بلکہ ڈاکٹر محمد اقبال پروفیسر اورنٹیل کالج سے اس پر تبصرہ لکھایا ہے ۔ اور کئی ایسے ماخذات کا ذکر کیا ہے جن سے خیام کے حالات میں مزید ترمیم و اضافہ ممکن ہے ۔ خیام کے حالات زندگی نہایت مشکوک ہیں ۔ اس پر جو بحثیں ہوئی ہیں ان کا بڑا حصہ "خیام" مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی میں موجود ہے ۔ شبلی نے حسن بن صباح، نظام الملک اور خیام کے ہم سبق ہونے کی حکایت تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی سے لی ہے ۔ جو اس تذکرہ کے علاوہ تاریخ گزیدہ، حبیب السیر، وغیرہ میں بھی ہے ۔ سب سے پہلے وصایائے نظام الملک اور جامع التواریخ فضل اللہ رشید میں مذکور ہے ۔ اس قصے کو یورپ کے محققین نے بعض وجوہ کی بنا پر تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے ۔ شبلی نے اس بحث میں زیادہ کاوش نہیں کی ہے اور اگر کرتے تو صرف خیام پر سید سلیمان ندوی کی طرح ۵۰۰ صفحے کی ضخامت کی کتاب تیار ہوجاتی ۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخوں اور سنوں میں شبلی نے

[1] شعرالعجم : جلد اول : صفحہ ۲۱۷ : فٹ نوٹ

www.urduchannel.in

یورپ کی تحقیقات سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ اسکی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ انگریزی سے براہ راست واقف نہیں تھے۔ دوسرے اُن کا اصل مقصد ایرانی شاعری کی تنقید تھی۔ گو انہوں نے حتی الامکان شعراء کے حالات بھی تحقیق سے لکھے ہیں، لیکن وہ اصل مقصود نہیں جیسا کہ خود شعر العجم کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکے پانچوں حصوں میں سب سے اہم اس کا چوتھا حصہ ہے جس میں فارسی شاعری پر عام ریویو ہے۔ اور یہی حصہ گویا اس کتاب کی جان اور اسکی روح رواں ہے۔ ناقدین اس نکتہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ پھر بھی ڈاکٹر محمد اقبال خیام کے حالات میں شبلی کی تحقیق پر کچھ اضافہ نہ کر سکے۔ اور ان کو اعتراف کرنا پڑا کہ :-

اورنگ زیب قاسمی

"جو مطالب اس مضمون میں بیان کئے گئے ان کے متعلق یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ان میں کوئی نئی بات بیان نہیں کی گئی ہے۔ فارسی کے جاننے والے جو بہ واسطہ انگریزی تاریخ ایران کا مطالعہ کرتے ہیں ان باتوں سے بالعموم واقف ہیں۔" [1]

انوری

شبلی لکھتے ہیں :-

"محمد نام، اوحدالدین لقب، انوری تخلص، ابی ورد کے علاقہ میں بدنہ ایک گاؤں ہے جو منہ کے مقابل واقع ہے۔ انوری یہیں پیدا ہوا۔ یہ دولت شاہ کا بیان ہے، لیکن عرفی کہتا ہے ع 'انوری گر بود از منہ نہم از شیراز'۔ اس علاقہ کو خاوران بھی کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے انوری نے اپنا تخلص خاوری رکھا تھا۔ پھر اپنے استاد عمارہ کی فرمائش سے بدل کر انوری کر دیا۔" [2]

شیرانی صاحب نام سے اختلاف کرتے ہیں۔ اور ثبوت میں قصائد انوری کے ایک شارح کا ذکر کرتے ہیں جنھے دسویں صدی ہجری میں قصائد کی شرح لکھی، یہ شخص "محمد" انوری کے باپ کا نام بتاتا ہے۔ شیرانی صاحب کا ماخذ مشکوک ہے۔ کیونکہ انوری کی وفات پروفیسر ویلنٹن ذوکوسکی (Valantin Zhukovsky) کے قول کے مطابق ۵۸۱ھ میں ہوئی اور محمد بن داؤد بن محمد علوی شادی آبادی جو قصائد کا شارح ہے ۹۰۵ھ و ۹۱۶ھ کے درمیان تھا۔ یعنی انوری کی وفات کی تقریباً چار سو سال بعد، اور وہ بھی ہندوستان میں اسکے مقابلہ میں دولت شاہ اور دوسرے ایرانی تذکرہ

---

[1] تنقید شعر العجم : صفحہ ۱۸۸ ؛ مطبوعہ انجمن ترقی اردو
[2] شعر العجم : جلد اول : صفحہ ۲۶۶

www.urduchannel.in

نویسوں کی جو انوری سے قرب زمانی رکھتے ہیں اور اسی کے ہم وطن ہیں رائے سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ

نہیں ملتی۔ وطن کے سلسلے میں شیرانی صاحب لکھتے ہیں :-

"وطن کے متعلق اگرچہ مورخین میں اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ خاوران ہے"۔ [1]

شبلی کی رائے اوپر نقل ہوئی۔ وہ بھی یہی لکھتے ہیں شیرانی صاحب کو نہ معلوم صراحت کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ خود پروفیسر براؤن جنکی تصنیف کو شیرانی صاحب نہایت اعلیٰ درجہ کی بتاتے ہیں، اس سلسلے میں لکھا ہے :-

"دولت شاہ کے قول کے مطابق اسکی ولادت، ابی وردمیں ہوئی جو دشت خاوران کے نزدیک جہاں میں واقع ہے۔ اور اسی نسبت سے اُسنے اپنا تخلص خاوری اختیار کیا تھا"۔ [2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن نے بھی شبلی کی معلومات پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔ آگے چل کر شبلی نے انوری کی تحصیل علوم وفنون اور شاعری کی ابتداء کا حال جس طرح لکھا ہے براؤن نے بھی بعینہٖ وہی باتیں لکھی ہیں اور اس میں کوئی اضافہ نہ کرسکا۔ البتہ ایک دوسرے قصیدے کے متعلق جسکا مطلع ہے کہ

جز آستانِ توام در جہاں پناہے نیست
سرِ مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست

شیرانی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ خواجہ حافظ کی غزل کا مطلع ہے۔ آگے چل کر جہاں شبلی نے خزانۂ عامرہ کے حوالے سے سنجر کا انوری کے مکان پر آنے کا حال لکھا ہے، لکھتے ہیں :-

"دس سال کی امیدواری کے باوجود جیسا کہ گزشتہ اشعار سے واضح ہوتا ہے انوری سنجر کے دربار میں بطرف، مقیم آستاں بننے کا رتبہ بھی حاصل نہ کرسکا۔ اگر اسی رفتار سے اسنے ترقی کی ہے تو سنجر کو اسکے گھر آنے کے لئے عمرِ نوح درکار ہے"۔ [3]

قطع نظر اسکے کہ عبارت میں استہزاء کا انداز پیدا ہوگیا ہے، جو علمی تنقید کے شایان شان نہیں۔ یہ استدلال بذات خود بھی منطقیانہ نہیں ہے۔ ایک قصیدے، قطعہ یا رباعی سے یہ نتیجہ نکالنا کہ سنجر نہیں کوئی وزیر انوری کے مکان پر آیا تھا، صحیح نہیں۔ کیونکہ جسطرح ان اشعار میں سنجر کی صراحت نہیں، اسی طرح کسی وزیر کی بھی صراحت نہیں۔ شبلی نے لکھا ہے :-

---

[1] تنقید شعر العجم : ص ۱۹۰
[2] بحوالہ براؤن : جلد اول : تذکرہ انوری
[3] تنقید شعر العجم : ص ۱۹۳

www.urduchannel.in

"........ اتفاق سے سبع سیارہ برج میزان میں جمع ہوئے۔ انوری نے اس بنا پر اورنگ زیب قاسمی پیشین گوئی کی کہ فلاں دن اس زور کا طوفان آئیگا کہ تمام مکانات برباد ہو جائیں گے۔ لوگوں نے ڈر کر تہ خانے اور سرداب تیار کرائے اور تاریخ مقررہ پر اُن میں چھپ کر بیٹھے۔ اتفاق سے اس دن اتنی بھی ہوا نہ چلی کہ چراغ گل ہوتا..... "[1]

پروفیسر براؤن اس سے اتفاق کرتا ہے لیکن وہ اسکی تاریخ ۵۸۱ھ قرار دیتا ہے جو ولینٹن ژوکوسکی کی تحقیقات پر مبنی ہے (Valintin Zhukooskii)۔ شبلی ۵۲۳ھ بتاتے ہیں۔ اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ طوفان کے متعلق اور بھی شاعروں اور تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے:۔ شبلی نے لکھا ہے کہ "پیشین گوئی غلط ثابت ہونے پر انوری نے سنجر کے دربار سے قطع تعلق کر لیا"۔ شیرانی صاحب لکھتے ہیں کہ "یہ خیال درست نہیں معلوم ہوتا ہے" لیکن براؤن نے اسے تسلیم کر لیا ہے۔

اس تنقید میں بھی زیادہ تر حالات و واقعات سے اختلاف اور اس پر بحث ہے۔ تنقید کلام سے بہت کم اختلاف کیا گیا ہے۔

شعر العجم کی اہمیت شیرانی صاحب کی تنقید دوسری جلد میں کمال تک پہونچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ شعر العجم کے باقی حصے بھی کم اہم نہیں ہیں۔ بلکہ اساتذہ میں سے اکثر و بیشتر کے حالات دوسری جلد کے باقی حصے اور تیسری جلد میں ہیں۔ شیرانی صاحب کا یہ کہنا نہایت مضحکہ خیز ہے کہ چونکہ پنجاب یونیورسٹی نے شعر العجم کو ایم۔ اے کے نصاب سے خارج کر دیا اسلئے اُن کا دل اس کام کی طرف سے اچاٹ ہو گیا۔ گویا ان کی تنقید کا مقصد شعر العجم کو نصاب سے خارج کرانا تھا۔ علمی تحقیق نہ تھی جو ایک صاحب علم کی شان سے بہت دور تر تھا۔ اگر شعر العجم کی تنقید و تصحیح مقصود تھی تو دوسری جلد پر اُن کے قلم کی روانی رُک جانے کے کیا معنی؟ جبکہ شعر العجم کے بقیہ حصے بھی کم اہمیت نہیں رکھتے۔ تیسرے حصّہ سے براؤن تک نے استفادہ کیا ہے۔ غرض شیرانی صاحب کی تنقیدوں کو پڑھ کر ایرانی شاعری کے متعلق کوئی نیا یا لطیف نکتہ ہاتھ نہیں آتا۔

شبلی اور مغربی مصنفین کا فرق اس سلسلے میں ایک اُصولی بات بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ یورپ اور

---

[1] شعر العجم: جلد اول: ص ۲۶۸-۲۶۹

www.urduchannel.in

ایشیا کے علمی مذاق میں بڑا فرق ہے۔ مغربی مصنفین بالعموم تاریخوں اور سنوں کی تحقیق، مختلف نسخوں کے لفظی
اورنگ زیب قاسمی
اختلافات کے مقابلے، تصحیح اور اس قسم کے دوسرے امور کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے اس ذوق کا اندازہ دراصل اس ضمیمہ سے کیا جاتا ہے جو (Bibliography) یا فہرست مآخذات کہلاتا ہے۔ حالانکہ شعر و شاعری میں ان مسائل سے زیادہ اہم خود شاعر کا کلام اور اسکے محاسن و معائب کی بحث ہوتی ہے۔ اصولی طور پر مغرب کے مصنفین، مشرقی شاعری سے اپنی روح کو ہم آہنگ نہیں کر سکتے۔ مثلاً جس شخص نے ایک ایسے ملک و ماحول میں آنکھ کھولی جسکی خصوصیت صاف گوئی اور بے تکلفی ہو، وہ اس ملک کی شاعری کے لطائف کو کیسے محسوس کر سکتا ہے جسکے خمیر میں تکلف اور تصنع داخل ہو۔ اسلئے ایک یوروپین کسی ایرانی یا فارسی کا صحیح مذاق رکھنے والے مشرقی کے مقابلہ میں فارسی شاعری پر صحیح تنقید کر ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ براؤن کی کتاب کا اعلیٰ تحقیق کے باوجود تنقیدی حیثیت سے کوئی درجہ نہیں۔ اسکی بدذوقی کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ اُسنے فردوسی پر صرف دو تین صفحے لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں مولوی شبلی مہدی افادی کو لکھتے ہیں:۔

> "بلا مبالغہ اور بلا تصنع کہتا ہوں کہ براؤن کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا۔ نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہے۔ برادر اسحاق سے پڑھوا کر بھی سنا، خود بھی الٹ پلٹ کر دیکھا۔ فردوسی کی نسبت صرف دو تین صفحے لکھے ہیں۔ جس میں اسکے اقتباسات بھی شامل ہیں۔ مذاق اتنا صحیح صحیح ہے کہ آپ فردوسی کا درجہ سبعہ معلقہ کے برابر بھی نہیں مانتے۔ اور فرماتے ہیں کہ کسی حیثیت سے یہ کتاب اور شعرائے فارسی کے کلام کے برابر نہیں۔ میں مع سود اور ہرجہ کے اسکے دام واپس لونگا۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔" [1]

اس قسم کی تصانیف کا ایک اور پہلو قابل غور ہے۔ تاریخی تحقیقات کی بنیاد قدیم مآخذوں پر ہوتی ہے۔ اور جتنا زمانہ گذرتا جاتا ہے اتنے ہی نئے نئے آخذات منظر عام پر آتے جاتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک ہی زمانے میں کسی مصنف کو سارے مآخذ مل جائیں۔ خصوصاً اس زمانے میں ہر موضوع کے متعلق آئے دن قدیم کتابوں کا پتہ چلتا رہتا ہے اور جن کتابوں کا نام تک کسی کو معلوم نہ تھا وہ بازاروں میں آتی رہتی ہیں۔ اسلئے ہر نئی تصنیف میں ترمیم و اضافہ کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ خود براؤن کی تصنیف کے

---

[1] مکاتیب شبلی : جلد دوم : ص ۲۱۱-۲۱۲

www.urduchannel.in

بعد نئے معلومات حاصل ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں شعر العجم کے متعلق یہ کیوں توقع کی جائے کہ وہ ہر قسم کے

اورنگ زیب قاسمی

ترمیم و اضافہ کی ضرورت سے بالکل پاک ہے۔

شعر العجم کی تصنیف کیلئے شبلی کی موزونیت

البتہ اگر اسکے تنقیدی پہلو میں نقائص اور خامیاں ہوتیں تو بلا شبہہ اس میں گفتگو کی گنجائش نکل سکتی تھی۔ لیکن اس پہلو سے شعر العجم اتنی مکمل ہے کہ اسکے مخالفین بھی اس پر کوئی حرف نہ رکھ سکے۔ شبلی خود شاعر تھے، گو ناقد کے لئے شاعر ہونا ضروری نہیں۔ لیکن جس خوبی سے خود آشنائے فن تنقید کر سکتا ہے وہ کسی ناواقف سے ممکن نہیں۔ شعر و شاعری کے تمام اچھے ناقد بالعموم اچھے شاعر بھی تھے۔ چنانچہ میر، میر حسن، مصحفی، شیفتہ حالی، آزاد، اردو ناقدین کی صف میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اور شاعری میں بھی ان کا درجہ مسلّم ہے جیسا کہ پہلے اوپر لکھا ہے شعر العجم کا مقصد فارسی شاعری کی تاریخ سے زیادہ اسکی تنقید تھی۔ چنانچہ شبلی خود شعر العجم حصہ چہارم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

> "شعر العجم کا یہ چوتھا یعنی اخیر حصہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگلے تینوں حصے اس حصے کے دیباچے اور تمہید تھے۔ اس حصہ میں ایران کی عام شاعری کی تنقید ہے"۔[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ شبلی کا مقصد "تاریخ شعر" سے زیادہ "تنقید شعر" تھا۔ اس لئے ہم نے بھی شعر العجم کو تاریخ کے عنوان میں رکھنے کے بجائے تنقید میں شامل کیا ہے۔

شاعری پر بحث

شاعری کی جامع اور مانع تعریف آج تک ایسی نہ ہو سکی جس پر سب کا اتفاق ہو۔ شبلی نے شاعری کی حقیقت، تاریخ اور شعر کا فرق، شاعری اور واقعہ نگاری کا فرق، خطابت اور شاعری کا فرق، مصوری اور شاعری کا فرق، نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ ان تفصیلات میں شبلی نے مغربی مصنفین کے خیالات کو بھی، جنھیں شیرانی صاحب سند سمجھتے ہیں، پیش نظر رکھا ہے۔ چنانچہ تمہید کا بڑا حصہ مل (Mill) کے مضمون سے ماخوذ ہے جس کا اعتراف شبلی نے ایک نوٹ میں کیا ہے۔ اسکے بعد ارسطو، ہنری لوئس وغیرہ کے بیانات کا ذکر ہے۔ آگے چل کر شاعری کے اصلی عناصر سے بحث کی ہے اور محاکات و تخیل دو کو شعر کی اساس بتایا ہے۔ اگرچہ شبلی کے زمانے میں پابند شاعری کا رواج تھا۔ اس سے وہ وزن کو شعر کا ضروری جزو تو سمجھتے تھے لیکن اس کو شاعری کا اصل عنصر قرار نہیں دیا ہے۔ اسی طرح خیال بندی، سادگی، الفاظ، بندش کی چستی، جدت ادا اگرچہ شبلی کے زمانے تک لوازمات شعر میں داخل

---

[1] شعر العجم: جلد چہارم : صا

www.urduchannel.in

تھے لیکن شبلی لکھتے ہیں: ۔

اورنگ زیب قاسمی

" کیا انہیں سے ہر ایک چیز ایسی ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو شعر شعر نہ ہوتا ۔ اگر ایسا نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے تو ان تمام اوصاف میں خاص ان چیزوں کو متعین کر دینا چاہیئے جنکے بغیر شعر شعر نہیں بنتا " [1]

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: ۔

" حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے ۔ محاکات اور تخیل ۔ انہیں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا ۔ باقی اور اوصاف بھی یعنی سلاست صفائی حسن بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزائے اصل نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں " [2]

اسکے بعد محاکات اور تخیل پر مفصل بحث کی ہے ۔ تشبیہہ اور استعارہ، جدت اور لطف ادا، حسن الفاظ، سادگی ادا، واقعیت اور اصلیت، شعر کی تاثیر کے اسباب اور شاعری کے استعمال پر نہایت تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے ۔ شعر العجم کے علاوہ اردو میں یہ خیالات صرف حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" میں ملتے ہیں ۔ لیکن حالی اور شبلی میں بڑا فرق ہے ۔ مغرب کے مصنفین سے استفادہ دونوں نے کیا ہے لیکن حالی ان سے مرعوب تھے اور جگہ جگہ وہ انگریزی شاعری کے نمونے پیش کرتے ہیں اور اردو کی کوئی صنف بہ استثنائے مرثیہ انکے اعتراض سے نہ بچ سکی ۔ مرثئے میں بھی وہ کوئی ایسی بات نہیں پاتے جسکی بنا پر اس صنفِ شاعری کو مغربی شاعری کی کسی صنف کے مقابلے میں لایا جاسکے، اسکے برخلاف شبلی کی تنقید ہمدردانہ ہے ۔ چنانچہ شعر کی وہ خوبیاں جو مغربی مصنفین کے نزدیک بھی مسلم ہیں انہیں فارسی شعراء کے یہاں مل جاتی ہیں ۔ مثلاً محاکات کی مثال میں قاآنی کی بہاریہ کا یہ اقتباس ہے

نرمک نرمک نسیم زیر گلاں مے خیزد　　غبغب این می کلند عارض آں می فرد

سنبل این می کشد، گردن آں می گزد　　گہ بہ چمن می چمد، گہ بہ سمن می وزد

گاہ بہ شاخ درخت، گہ بہ لب جوئبار

اسیطرح مختلف موقعوں پر فارسی سے نہایت عمدہ مثالیں دی ہیں ۔

ناقد کے فرائض

شعراء کے کلام پر تنقید کا انداز لگانے کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ شبلی نے اساتذۂ ایران کے کلام پر جو تنقید کی ہے اس میں سے کسی ایک کا جائزہ لیا جائے ۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں شاعری کے اصول تنقید کے متعلق بھی کچھ کہنا ضروری ہے ۔ سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ شاعر کے کلام کو اپنے معیار پر

---

[1] شعر العجم جلد چہارم : ص۳

[2] " " " : ص۸-۹

www.urduchannel.in

پرکھنے کے بجائے، اسکے عہد کے مروجہ معیار پر جانچا چاہئے۔ لیکن بعض لوگ جدت پسندی کی تلاش میں پرانے شعرا کے یہاں وہ چیزیں ڈھونڈھنا چاہتے ہیں جن سے وہ واقف بھی نہیں تھے۔ چنانچہ شیرانی صاحب کی تسکین کے لئے بعض یوروپین ناقدین کی رائے یہاں لکھی جاتی ہے :-

> یہ بڑی حماقت ہے اگر ارسطو اور اسپنسر کو ان تصورات سے پرکھا جائے جن سے وہ آشنا بھی نہ تھے۔ ہمارے زمانے میں شعر وادب کے مسلمہ اصول ہیں۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں کوشش کرتے ہیں کہ ہماری تصانیف ان اصولوں پر پوری اتریں ...... ارسطو اور اسپنسر دونوں کا حال یہ ہے کہ ان کے عہد میں کوئی چیز کسی معیار کے پیش نظر نہیں تجویز ہوتی تھی۔ ان کی شاعری تو صرف انکے "گرم تخیل اور تیز احساس" کا آزاد اظہار ہے۔ اگر ان کی شاعری میں اصلیت (Exactness) ڈھونڈھی جائے تو اسکی مثال اس عجیب وغریب کارنس کی سی ہوگی جو کسی مصور نے (Caleb) کے (Grotto) میں داخل کر دیا۔ حالانکہ اس کا اس عہد میں رواج بھی نہ تھا۔ جب کوئی فن تعمیر کا ماہر Gothic تعمیرات کو Gracian اصول تعمیر پر جانچتا ہے تو اُسے سوائے بے ڈھنگے پن کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن گاتھی فن تعمیر کے اپنے اصول ہیں جن پر اگر اسکی تعمیرات کو پرکھا جائے تو اسمیں اسیطرح خوبیاں نظر آئیں گی جسطرح یونانی تعمیر کے نمونوں میں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ ان دونوں میں کس میں سادگی یا مذاق صحیح کا اظہار زیادہ ہے۔ بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر دونوں کو علیحدہ علیحدہ ان اصولوں سے جانچا جائے جنپر اُن کی بنیاد ہے تو دونوں میں حسن وخوبی ملے گی یا نہیں۔ یہی حال شاعری کے ان دونوں نمونوں کا ہے اگر Faery Queen کو قدمائے Classics کے نمونوں پر جانچا جائے تو اسکا انتشار پریشان کن نظر آتا ہے۔ لیکن اسی کو اسکے گاتھی اصول ہونے کی حیثیت سے دیکھیں تو بجائے انتشار کے اسمیں ضبط اور نظم نظر آتا ہے"۔ [1]

دوسرا قابل لحاظ نکتہ یہ ہے کہ پرانے ناقدین کے یہاں تنقید کی چند بندھی ٹکی اصطلاحیں ہیں، انھیں کو وہ مختلف شعراء کے کلام کی تنقید میں اُلٹ پھیر کر استعمال کرتے ہیں۔ اور عموماً ان کی تنقید انکے ذاتی مذاق اور رجحان کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ ایک مثال سے اچھی طرح ہوسکتا ہے۔ جرأت کے یہاں

---

[1] A. Hurd Letter on Chevalry 1762

www.urduchannel.in

مجازی عشق کی واردات بڑی خوبی سے نظم ہوئی ہے ۔ چونکہ ان کے اشعار میں فحش مضامین ملتے ہیں اسلئے بقول

اورنگ زیب قاسمی

حسرت موہانی بعض مُلّایانہ طبائع پر یہ اشعار گراں گزرتے ہیں ۔ حالانکہ جن جذبات کی وہ عکاسی کرتے ہیں ان کی سچی تصویریں ہیں ۔ اور چونکہ صداقت و حسن لازم و ملزوم ہیں اسلئے ان اشعار کی خوبی مسلّم ہے ۔ لیکن اگر شیفتہ کی رائے کو دیکھا جائے تو وہ لکھتے ہیں کہ جرأت کے اشعار "پسند طبائع اوباش و الوط" اور " طریقۂ راسخہ شعرا" سے ہٹے ہوئے ہیں ۔ اس قسم کی مثالیں پرانے ناقدین کے یہاں بکثرت ملتی ہیں ۔ اسلئے ان کی تنقیدیں مختصر ہوتی ہیں اور انمیں بھی جابجا تکرار نظر آتی ہے ۔ حالانکہ ہر بڑا شاعر کچھ نہ کچھ انفرادی رنگ ضرور رکھتا ہے ۔ اور ناقد کا فرض ہے کہ وہ اس رنگ کو اُجاگر کردے ۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ شاعر خواہ کتنا ہی شاعری کا فطری مذاق رکھتا ہو لیکن وہ اپنے دور کی شاعری سے ضرور متاثر ہوتا ہے اور شاعری کو متاثر کرکے اٹھتا ہے ۔ اچھے تنقید نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ دونوں اثرات کو واضح اور نمایاں کردے !

شاعری کی کوئی صنف بھی ہو، اس میں زندگی کی عکاسی ہوتی ہے ۔ اسلئے شاعر کے کلام میں اسکے زمانہ کی تہذیب و معاشرت، معتقدات و رجحانات کی جھلک ضرور ہوتی ہے ۔ شاعر کے تنقید نگار کا فرض ہے کہ وہ اسکی شاعری کی روشنی میں اس عہد کی زندگی کا ایک مرقع تیار کردے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ شاعر نے کہاں تک اپنے ماحول کی سچی اور صحیح ترجمانی کی ہے ۔

مغربی مصنفین اور ناقدین کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ اسکا پتہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ شاعر نے کیا طرز ورثہ میں پایا تھا اور اسمیں کیا نیا اضافہ کیا ۔ اور اسکے کیا اسباب تھے ۔ یہ مغربی ناقدین کے اثر سے اب مشرقی تصانیف میں بھی پیدا ہوا ہے ۔

شاعری الفاظ کا کھیل ہے ۔ اسلئے زبان اور شعر کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ۔ شعر کی شاعرانہ خوبیوں سے قطع نظر یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ زبان و ادب کی تاریخ میں اسکی کیا حیثیت ہے ۔ ہر بڑا شاعر اپنی ایجادات اور تصرفات سے اپنے زمانے کی زبان میں کچھ نہ کچھ اضافہ یا تغیر ضرور کرتا ہے ۔ اسلئے تنقید شعری میں اصلاح زبان کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے ۔

یہ بھی تنقید نگار کے فرائض میں ہے کہ وہ جس شاعر کو پیش کر رہا ہے اور اسکے جو محاسن و معائب یا خصوصیات بیان کرنا چاہتا ہے اسکی تائید میں اسکے کلام کا معقول حصہ پیش کرے تاکہ پڑھنے والا اسکے متعلق صحیح

www.urduchannel.in

رائے قائم کرسکے۔ پرانے تذکرہ نگار اس کا بھی لحاظ نہیں کرتے اور دو چار مثالوں سے زیادہ نہیں دیتے جس سے اسکا اندازہ نہیں ہوتا کہ ناقد نے شاعر کے متعلق جو رائے دی ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

ناقد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شاعر کیساتھ ہمدردانہ انداز اختیار کرے۔ اس کا کام شعر یا شاعر کی تنقیص نہیں۔ ایسا کوئی انسان نہیں مل سکتا جو غلطیوں سے پاک ہو۔ چنانچہ J. Dryden جو مغربی ناقدین میں ممتاز درجہ رکھتا ہے لکھتا ہے:-

"وہ لوگ صحیح تنقید کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں ہیں جنکا خیال ہے کہ تنقید کا کام محض نقص تلاش کرنا ہے۔ تنقید جس رنگ میں اسے ارسطو نے پہلے پہل اُسے رائج کیا صحت کیساتھ پرکھنے کا ایک معیار تھی۔ جس کا خاص مقصد ان خوبیوں کی تلاش تھی جو ایک معقول پڑھنے والے کو خوش کرسکیں۔ یہ سراسر بدذاتی اور نامردی ہے کہ قلم کی معمولی لغزشوں پر ناک بھوں چڑھائی جائے۔ کیونکہ انسے تو خود ورجل بھی محفوظ نہیں ہے۔ اور لانگینس نے جو بلاشبہ ارسطو کے بعد یونانیوں میں سب سے بڑا ناقد گزرا ہے اس مرد کامل کو جو کبھی کبھی غلطی بھی کر جائے اس شخص پر ٹھیک ترجیح دی ہے جو اگرچہ کم غلطیاں کرتا ہے لیکن کبھی کسی کمال کو نہیں پہونچتا۔"[1]

ان امور کی روشنی میں ہمیں دیکھنا ہے کہ شبلی نے کہاں تک تنقید نگاری کے فرائض انجام دئے ہیں۔

اصول تنقید کی روشنی میں شعر العجم

اگر دنیا کی مختلف زبانوں کے صرف ایک ایک شاعر کی ایک ایک تصنیف منتخب کرنا ہو تو فارسی میں غالبًا فردوسی کے "شاہنامے" کو ہی یہ عزت نصیب ہوگی۔ اسکی مقبولیت کا اندازہ اس سے بڑھکر اور کیا ہوسکتا ہے کہ ایرانیوں نے ہزار برس گزر جانے کے بعد بھی فردوسی کو نہیں بھلایا۔ اور یہ فخر سوا اسکے اور کسی ایرانی شاعر کو حاصل نہیں ہوا کہ اسکی ہزار سالہ برسی منائی جائے۔ پروفیسر براؤن البتہ اسکی اہمیت سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:-

"اس عظیم الشان نظم کی ادبی وقعت و قابلیت کا نہایت اعلیٰ پیمانہ پر اندازہ کرنے میں مشرقی اور مغربی محققین قریب قریب متفق ہیں اسلئے میں بڑے تذبذب اور تردد کا احساس کرکے معترف ہوں کہ میں اس جوش و ہیجان میں شریک ہونے کے ناقابل ہوں، میری رائے میں شاہنامہ، سبعہ معلقہ کی مساوات پر بھی نہیں آسکتا۔ اگرچہ یہ مثنوی ممالک اسلام میں تمام رزمیہ نظموں کے لئے ایک نمونہ اور مثال بن گئی ہے۔ میرے خیال میں خوبی بیان، نزاکت جذبات

---

[1] J. Dryden : Author's apology for heroic poetry.

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

اور حسن ادا میں فارسی زبان کی بہترین، اخلاقی، افسانوی اور عشقیہ نظموں کی ہم ردیف نہیں بن سکتی۔ بے شک ذوق اور وجدان کے معاملہ میں بحث و مباحثہ کرنا خصوصاً ادبیات کے شعبے میں تقریباً بے سود ہے۔ شاہنامے کی قدر شناسی کے بارے میں غالباً میرا قصور کسی قدر اس قدرتی عجز کی بنا پر بھی ہے جسکی وجہ سے میں بالعموم رزمیہ اشعار کو پسند کرنے سے قاصر ہوں۔ ان خامیوں سے ہم سب واقف ہیں، خاص کر موسیقی میں جہاں واگنر کا ایک سرود بعض کو بالکل محو اور وارفتہ بنا دیتا ہے اور بعض کو بالکل بے تعلق چھوڑ دیتا ہے۔" [1]

تنقید کا ایک نمونہ

فردوسی کے سلسلے میں مولانا شبلی لکھتے ہیں:-

"فردوسی کا حال تمام تذکروں میں بہ تفصیل مذکور ہے۔ لیکن سب میں باہم سخت اختلاف ہے۔ انیں سب سے زیادہ قابل اعتبار چہار مقالہ ہے جسکا مصنف خود نامور شاعر اور فردوسی سے قریب العہد ہے۔ تاہم اسمیں بھی سخت غلطیاں ہیں۔ تیمور کے پوتے بائی سنقر نے فضلاء سے شاہنامے پر جو دیباچہ لکھوایا تھا اسمیں فردوسی کی مفصل سوانحعمری ہے۔ لیکن بعض واقعات ایسے لغو ہیں کہ اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی نے بھی کسی قدر تفصیل سے حالات لکھے ہیں اور وہ بھی غلطیوں سے خالی نہیں۔ عربی مصنفین میں سے صرف قزوینی نے آثار البلاد میں اس کا حال لکھا ہے۔ میں نے ان سب میں سے واقعات لئے ہیں لیکن جابجا ان کی غلطیوں کی تصریح کر دی ہے۔" [2]

اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ فردوسی کے حالات و واقعات میں شبلی کوئی قطعی رائے نہیں دیتے ہیں۔ اسکے باوجود شیرانی صاحب نے مختلف سنوں اور واقعات کی تنقید میں تقریباً ۶۳ صفحے صرف کئے ہیں۔ حالانکہ مآخذوں کے متعلق انھوں نے خود لکھا ہے کہ فردوسی کے حالات کے تین مآخذ ہیں (۱) شاہنامہ (۲) دیباچہ قدیم شاہنامہ (۳) چہار مقالہ۔ شیرانی صاحب کی ساری برہمی اس پر ہے کہ شبلی نے براؤن کی استادی کو کیوں تسلیم نہیں کیا۔ اور جن مآخذوں کو انسے ناقابل اعتبار سمجھا ہے انھوں نے اُن کو کیوں اختیار کیا۔ شیرانی صاحب کے استدلال زیادہ تر قیاسیات پر مبنی ہیں۔ یا ایک مآخذ کے بجائے دوسرے مآخذ کا ذکر ہے۔ جسمیں اور شبلی کے مآخذ کے بعض بیانوں میں اختلاف ہے لیکن یہ خود ایک قابل بحث امر ہے کہ ان میں سے کس بیان کو صحیح ما

---

[1] بحوالہ تنقید شعر العجم: ص ۸۳-۸۴ [2] فٹ نوٹ شعر العجم: جلد اول: طبع چہارم: سنہ ۱۹۲۰ء: ص ۹۱

www.urduchannel.in

جائے۔ اور پھر یہ اختلاف صرف تاریخوں کے بارے میں ہے۔ باقی شاہنامے کی شاعرانہ خوبیوں کے متعلق خود شیرانی صاحب

اورنگ زیب قاسمی

نے بھی شبلی کیطرح براؤن کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ اس سلسلے میں شیرانی صاحب کو بھی مجبوراً شاہنامہ پر براؤن سے اختلاف اور شبلی سے اتفاق کرنا پڑا۔ شبلی کی تنقید کا خاکہ یہ ہے :۔

فردوسی کا نام، وطن، ولادت اور اسکی تخمینی تاریخ، شاہنامے کی ابتدا، اور دربار میں رسائی۔ بعض عام روایات کی شاہنامے سے تردید۔ شاہنامے کے دیباچہ نویسوں کی بعض غلطیاں، عنصری، فرخی، عسجدی اور فردوسی کا شاعرانہ معرکہ، دیباچہ شاہنامہ کے حوالے سے بعض دوسری روایات، دربار میں پہونچنے کی تقریب، بدیہہ گوئی کا امتحان، شاہنامے کی تصنیف، دولت شاہ کا بیان۔ اثنائے تصنیف میں بیٹے کا انتقال، فردوسی کی ناکامی اور اس کا سبب، دیباچہ شاہنامہ کا ایک نیا نکتہ۔ فردوسی کی ناکامی کی اصل وجہ، سلطان محمود کی ہجو، فردوسی کا غزنیں سے نکل کر آوارہ پھرنا، چہار مقالے سے سلطان محمود کی شکایت کے اشعار، دیباچہ اور دولت شاہ کے بیان میں اختلاف، سلطان محمود کی تلافی اور اسکے متعلق چہار مقالہ کا بیان، فردوسی کی وفات اور اولاد، شاہنامے پر تنقید، سنہ تصنیف وسبب تصنیف، شاہنامے کی شہادت اور اس سے شاہنامے کے آغاز و اختتام کی تاریخ کا تعین، اس خیال کی تردید کہ شاہنامہ محمود کی فرمائش سے لکھا گیا خود شاہنامے کے اشعار سے۔ شاہنامے کے قدردان، شاہنامہ کا مآخذ، سرجان میلکم کی رائے، ایران کی قدیم تاریخیں جو عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں، شاہنامے کے مآخذات کے متعلق خود فردوسی کا بیان، شاہنامے کے مآخذ کے بابت ایک روایت اور اسکی غلطی، شاہنامے کی تاریخی وقعت، محققین یورپ کی رائے، براؤن کا اعتراف، پروفیسر نولدکی کے مقالے کے اقتباسات، تاریخ و قدامت، پرانے قصے جو شاہنامے میں موجود ہیں۔ فردوسی کی وسعت شاعری کی حیثیت سے، انوری اور نظامی کے اقوال، علامہ ابن الاثیر کا خیال، شاہنامے کی خصوصیات :۔

(۱) شاہنامے سے اُس زمانے کی تہذیب و معاشرت کا پورا پتہ چلتا ہے۔

(۲) باوجود عربی الفاظ کے فارسی میں دخل کے فردوسی خالص فارسی لکھتا ہے۔

(۳) حسن و عشق کے بیان میں اعتدال و متانت۔

(۴) رزم کیساتھ بزم۔

(۵) واقعہ نگاری اور جذبات انسانی کا اظہار۔

www.urduchannel.in

(۶) جذبات نگاری۔

اورنگ زیب قاسمی

(۷) اختصار اور زور بیان۔

(۸) صنائع و بدائع۔

رزمیہ شاعری اور اسکے شرائط، شاہنامہ بحیثیت ایک رزمیہ نظم کے، شاہنامے کے اثرات، شاہنامے کی زبان اور اسکی خصوصیت۔

اصول تنقید کے سلسلے میں ہم نے جس قدر اہم نکتے گنائے تھے، شبلی نے ان سب کی پوری پابندی کی ہے۔ اسلئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ تنقید کے نقطۂ نظر سے ان کا یہ کارنامہ نہایت اہم ہے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے یہ بتادینا نہایت ضروری ہے کہ علمی تحقیقات کا جو ذخیرہ اب پیدا ہوگیا ہے وہ شبلی کے عہد میں موجود نہ تھا۔ اب اہل ہند یورپ کی علمی اور سائنٹفک تحقیقات سے پوری طرح باخبر رہتے ہیں۔ اس زمانہ میں یورپ کی مطبوعات کو ہندوستان آتے آتے مدت لگتی تھی۔ اسکے باوجود شبلی نے جس کثرت سے ان جدید تصانیف سے استفادہ کیا ہے اسکی مثال انکے معاصرین میں سے کسی کے یہاں نہیں ملتی۔ اسکی اہمیت اسلئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ شبلی کسی یوروپین زبان سے صحیح معنوں میں واقف نہ تھے لیکن یورپ کی جن مطبوعہ کتابوں اور مضامین کا وہ حوالہ دیتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کو یورپ کی تحقیقات علمیہ سے باخبر رکھتے تھے۔ یہ خصوصیت اردو مصنفین میں انہیں میں ملتی ہے کہ وہ یورپ کی ہر چیز کو آمنا وصدقنا کہکر قبول نہیں کر لیتے تھے بلکہ اسکے متعلق اپنی تحقیقی رائے رکھتے تھے، براؤن کی تحقیق کے اعتراف کے باوجود اسکی خامیوں کیطرف انکی رائے اوپر گزر چکی ہے۔

عمومی تبصرہ

اب ہمیں شعر العجم پر ایک عمومی تبصرہ کرنا باقی رہ گیا ہے۔ کتاب کے سب سے اہم حصے چہارم و پنجم ہیں۔ جن کا اعتراف خود شبلی کے الفاظ میں مذکور ہوا۔ ان حصوں میں فارسی شاعری پر ایک اجمالی ریویو کے بعد ہر صنف پر تفصیلی ریویو ہے۔ سب سے پہلے مثنوی اور اسکی اہمیت پر بحث کی ہے اور مثنوی کے لوازم تفصیل سے بیان کرکے بتایا ہے کہ فارسی شاعری کی یہ صنف عربی کی شاعری میں بھی نہیں پائی جاتی۔ اور فردوسی کے شاہنامے کو فارسی کی بہترین مثنوی قرار دیکر اس پر کم و بیش اسی صفحے کی تنقید لکھی ہے۔ اسیطرح قصیدہ گوئی، عشقیہ شاعری، صوفیانہ شاعری، اخلاقی شاعری اور فلسفیانہ شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس سے حسب ذیل نتائج نکالے جاسکتے ہیں:۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

(۱) شبلی کو فارسی شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا۔ جو شاعری میں عشق کی حد تک پہونچ گیا تھا۔ اس کا اثر ان کی تمام تحریروں میں رنگین الفاظ، خوشنما ترکیبوں اور خود ان کی فارسی شاعری سے ظاہر ہے۔

(۲) فارسی ادب کا انہوں نے نہایت وسیع مطالعہ کیا تھا۔ ناقدین میں کم تر ایسے لوگ نکلیں گے۔ جنہوں نے اتنے وسیع مطالعہ کے بعد قلم اٹھایا ہو۔ شعراء کے کلام پر جسطرح تنقید کی ہے اور جو جو نکات بیان کئے ہیں ان سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ہر شاعر کا مطالعہ بجائے خود نہایت تفصیلی ہے۔

(۳) تنقید کا معیار محض اپنی پسند یا ناپسندیدگی کو نہیں قرار دیا ہے بلکہ پہلے ہر صنف شاعری کے لوازم و اصول و شرائط گنائے ہیں پھر ان اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے شعرا کا حال لکھکر ان اصول و شرائط پر انھیں پرکھا ہے۔

(۴) کسی چیز کی خوبی یا نقص کا پورا اندازہ موازنہ اور مقابلہ سے ہو سکتا ہے، اسلئے مختلف اصناف کے اساتذہ کا جابجا مقابلہ اور موازنہ کیا ہے جس سے شاعر کی صحیح عظمت اور اس کا درجہ متعین ہو جاتا ہے۔

(۵) انھوں نے ایران کے مورخ ہونے کا دعویٰ کہیں نہیں کیا ہے۔ اسلئے شعر العجم کو محض واقعات کی کھتونی نہیں بنایا ہے بلکہ صرف وہ حالات اور واقعات لئے ہیں جن کا اثر شاعری پر پڑا ہے۔ شروع سے آخر تک تاریخ سے زیادہ تنقید پر زور ہے۔

(۶) شعر العجم کا پورا مجموعہ ایسا ہے کہ اسکے پڑھنے سے بڑی حد تک فارسی شعر و ادب کی روح تک رسائی ہو جاتی ہے۔ اس زمانے میں جب فارسی کا رواج تقریباً اُٹھ چکا ہے اور لوگ اساتذہ فارسی کو بھولتے جا رہے ہیں شبلی کا یہ کارنامہ نہایت اہم ہے۔ موجودہ اُردو داں طبقہ براہ راست فارسی شعر و ادب کے مطالعہ کے مواقع نہیں رکھتا لیکن یہ مسلمہ ہے کہ اردو شاعری کی ہر صنف کسی نہ کسی حیثیت سے کم از کم اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک فارسی سے بہت متاثر رہی ہے اور اب بھی ہے۔ اردو شعر و شاعری کی تنقید میں بھی اس کتاب کے مطالعہ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمي

(۷) شعر العجم پر جو تنقیدیں لکھی گئی ہیں اور جن میں تاریخ و واقعات کی زیادہ چھان بین کی گئی ہے اسکی تحریک بھی خود شعر العجم کی مرہون منت ہے۔ شعر العجم نقش اوّل ہے۔ مولانا کو اس پر نظر ثانی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ بالخصوص پانچواں حصّہ جو مولانا مکمل بھی نہ کرنے پائے تھے اور ان کے منتشر مسودات سے مرتب کیا گیا ہے۔ کسی موضوع پر قلم اٹھانا زیادہ دشوار ہے لیکن کتاب مرتب ہو جائے تو اسے پرکھنا اور غلطیاں نکالنا نہایت آسان۔ اسلئے تنقیدوں کے دفتر کے دفتر سیاہ ہو جانے پر بھی شعر العجم کے مرتبے میں فرق نہیں آتا۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

سیرۃ النبی صلعم

اگر شبلی کی تمام تصانیف میں صرف ایک کتاب کا انتخاب کرنا ہو تو غالباً سیرۃ النبی کو یہ امتیاز حاصل ہوگا - نہ صرف اس بنا پر کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مقدس سوانح عمری ہے - جنکی سیرت اور اسوۂ حسنہ مسلمانوں کے لئے دنیا و آخرت کا دستور العمل ہے - اور نہ اسلئے کہ سیرت، شبلی کی آخری یادگار، انکے تجربات، وسیع مطالعہ، مذاق تحقیق، پختہ اسلوب اور خاص انداز کا مکمل اور آخری نمونہ ہے - اور اُردو کیا کسی زبان حتی کہ عربی میں بھی ایسی جامع و مکمل سیرۃ نبوی نہیں ہے، بلکہ "سیرۃ النبی" ان تمام اوصاف کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ جس جوش، جس خلوص، جس عقیدت اور شیفتگی کا اظہار کرتی ہے اسکی مثالیں اس قسم کی تصانیف میں کم ملتی ہیں۔[1]

سیرۃ النبی کا پہلا خیال

مولانا نے "ناموران اسلام" کا سلسلہ لکھنا شروع کیا تو قدرتی طور پر اُن کے ذہن میں خود بانیٔ اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سب سے پہلے آیا ہوگا - لیکن رسول اکرمؐ کی سوانح عمری کو جس بلند معیار پر لکھنے کی ضرورت تھی اسکا موقع انھیں اسوقت حاصل نہ تھا - تاہم "الفاروق" اور "الغزالی" سے فارغ ہوتے ہی انھوں نے اسطرف توجہ کی اور ۱۹۰۳ء میں جب وہ حیدرآباد میں مقیم تھے انھوں نے اس مبارک کام کا آغاز کیا - اور ۳ھ تک کے واقعات قلمبند کردئے - یہ مسودہ ابتک دار المصنفین کے کتب خانے میں موجود ہے - لیکن معلوم نہیں مولانا نے کیوں اسکی اشاعت پسند نہ کی - غالباً یہ انکے معیار پر پوری نہیں اتری تھی - مسودہ کے علاوہ اس کا پتہ ایک خط سے بھی چلتا ہے جو انھوں نے ۲۷ مئی ۱۹۰۳ء کو مولوی حسین عطاء اللہ کو لکھا تھا:-

"میں نے سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری لکھنا شروع کی ہے جو سعادتِ دارین کا ذریعہ ہے - اسلئے اس قسم کی کتابوں کی ضرورت ہے - میرا کتب خانہ تمام وطن میں ہے - زرقانی

---

[1] حیات شبلی : ص۴۰۰

www.urduchannel.in

کا شکریہ، اور کتابوں کی بھی تکلیف دونگا۔"[۱]

اورنگ زیب قاسمی

اور سیرت کی تیاری کے سلسلے میں اُن کے کتب خانے سے استفادہ کا خیال ظاہر کیا تھا۔ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۶ء تک مولانا اور کاموں میں مصروف رہے۔ ۱۹۰۶ء میں پروفیسر مارگولیوتھ کی کتاب 'لائف آف محمدؐ' شائع ہوئی۔ جس میں اُسنے بڑی عیاری سے خود اسلامی کتابوں کے حوالوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت غلط تصویر پیش کی تھی۔ کتاب چونکہ انگریزی زبان میں تھی اور اسکا انداز اور استدلال نہایت پرفریب تھا۔ اور اندیشہ تھا کہ نوجوانوں کا وہ طبقہ جو عربی سے ناواقف ہے اور سیرۃ کے اصلی مآخذوں تک رسائی نہیں رکھتا۔ اسے صحیح تصور کرکے گمراہ ہو جائے۔ سید سلیمان ندوی کا بیان ہے[۲] کہ اس کتاب کا ذکر شبلی کے سامنے سب سے پہلے مولانا محمد علی مرحوم نے کیا تھا۔ اور کچھ اسطرح گفتگو کی کہ مولانا نے اس کا بڑا اثر قبول کیا۔ اس زمانے تک عام طور پر یورپین مصنفین اسلامی تعلیمات اور بانیٔ اسلام علیہ السلام کے متعلق پرفریب طریقہ سے ایسی غلط معلومات پیش کرتے تھے کہ ناواقف کیا، اچھے اچھے تعلیم یافتہ دھوکے میں آجاتے تھے۔ اس سے ایک ایسی بلند، محققانہ سیرۃ النبی کی اردو میں ضرورت تھی جو روایت پرستی سے پاک اور موجودہ مذاق کے مطابق ہونے کے ساتھ اُس میں متعصب یورپین مصنفین کے اعتراضات، جواب اور ان کی غلط بیانیوں کی پوری پردہ دری بھی ہو۔

سیرۃ النبی کا اعلان

اسکے علاوہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۲ء تک بعض اور نازک واقعات پیش آئے۔ ارتداد کا ہنگامہ، انگریزی تعلیم کے بڑھتے ہوئے مضر اثرات، اسلامی تہذیب ومعاشرت کے زوال واختلاط، مسلمانوں کی مذہب سے بیگانگی اور برگشتگی، ان تمام اسباب نے ۱۹۱۲ء میں شبلی کو آخر کار اس عظیم الشان کارنامے کے آغاز پر آمادہ کر دیا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۱۲ء کے "الندوہ" میں انھوں نے سیرۃ النبی کی تصنیف کا اعلان کر دیا۔ سیرۃ کی ضرورت کو اسطرح بیان کیا ہے:۔

(۱) اردو جیسی عالمگیر زبان میں حضرت رسول اللہ صلعم کی کوئی سوانح عمری نہیں۔ اور اگر ہے تو اسے سوانح عمری کہنا رسول اللہ کو آزردہ کرنا ہے۔

(۲) جدید تعلیم یافتہ مسلمان اگر سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو انگریزی کتابوں کیطرف رجوع ہوتے ہیں جن میں تصنیف کی رنگ آمیزی اور سخت تاریخی غلطیاں ہیں۔

(۳) اب سے پہلے سیرۃ کی ضرورت صرف تاریخی حیثیت سے تھی لیکن اب چونکہ معترضین یورپ

---

۱ مکاتیب شبلی : جلد اول : ص ۳۴۳ - ۳۴۴

۲ حیات شبلی : ص ۲۰۲

www.urduchannel.in

نے رسول اللہ صلعم پر بانی اسلام کی حیثیت سے اعتراضات شروع کر دیے ہیں اور اسطرح

اورنگ زیب قاسمی

ان کے نزدیک یہ اعتراضات اسلام پر ہیں اسلئے سیرت کی تصنیف "عقائد کی ضرورت"

بھی بن گئی ہے ۔

(۴) اردو سے قطع نظر خود عربی میں کوئی ایسی تصنیف سیرۃ النبی صلعم پر نہیں جس میں صرف صحیح

روایتوں کا التزام رکھا گیا ہو۔

(۵) علم کلام کی حیثیت سے بھی سیرت کی ضرورت ہے

(۶) علمی حیثیت سے اسکی ضرورت یوں بھی ہے کہ اردو میں کوئی ایسی سوانحعمری نہیں تھی جسے علمی

دنیا میں کوئی مرتبہ دیا جاسکے ۔

انہیں سے ایک نکتہ آگے چل کر نہایت اہم بن گیا ۔ اور اسنے کچھ عرصہ کے لئے خود سیرت کی تصنیف واشاعت کو معرض

التوا میں ڈالدیا ۔ شبلی نے لکھا تھا کہ :۔

" آگے چل کر ہم تفصیل سے بیان کرینگے کہ خاص سیرۃ پر آجتک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی

جسمیں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا ۔ حافظ زین الدین عراقی جو حافظ ابن حجر کے

استاد تھے سیرۃ نبوی میں لکھتے ہیں :۔

وَلْيَعْلَمِ الطَّالِبُ اِنَّ السِّيَرَا يَجْمَعُ مَا صَحَّ وَمَا قَدْ اُنْكِرَا

(یعنی طالب فن کو جاننا چاہئے کہ سیرۃ میں ہر قسم کی روایتیں نقل کی جاتی ہیں ۔ صحیح بھی اور قابل انکار بھی ۔)"

یہی سبب ہے کہ مستند اور مسلم الثبوت تصنیفات میں بھی بہت سی ضعیف روایتیں شامل ہو گئیں " [1]

اس پر بڑی دار و گیر ہوئی اور مولانا کو مجبوراً اسکی جواب دہی کرنا پڑی ۔ چنانچہ سیرت کے مقدمہ کے ایک طویل

حاشیہ میں بھی اسکا جواب دیا ہے ۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ سیرت فن حدیث سے بالکل علیحدہ ایک چیز ہے اور

حدیث سیرت کے منجملہ اور ماخذوں میں سے ایک ماخذ ہے ۔

سیرۃ کی تصنیف اور اشاعت

شبلی کے اس اعلان کے بعد بہت سے مسلمانوں نے اس صدا پر لبیک کہا ۔ اور

مولانا کو سیرت کی تالیف کے سلسلے میں ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ پیش آئی ۔

مولوی امین زبیری مہتمم تاریخ بھوپال کی تحریک پر سرکار عالیہ والیہ بھوپال نے شبلی کی مطلوبہ رقم یعنی ڈھائی

---

[1] حیات شبلی : ص ۱۲۱

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

سو روپیے ماہوار کا انتظام کر دیا۔ اسکے بعد سیرۃ النبی کا ایک دفتر قائم ہوا۔ جس میں ایک عربی کا مددگار اور دو انگریزی کے مترجم مقرر ہوئے۔ عربی کا کام سید سلیمان ندوی کے سپرد ہوا۔ اور انگریزی کتب کے تراجم کے لئے دو اور حضرات مقرر ہوئے جنکے نام معلوم نہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ بعد میں شبلی کی تحریک پر مولوی عبدالماجد صاحب نے اس کام کو لکھنؤ میں بیٹھ کر انجام دیا[1]۔ شبلی نے جون ۱۹۱۲ء میں یہی کام شروع کیا۔ جو ۱۹۱۴ء تک جاری رہا۔ درمیان میں مختلف قومی اور ذاتی ضروریات سے سفر کرنا پڑے۔ متعدد مصائب و حوادث بھی پیش آئے لیکن یہ کام نہیں رکا مگر افسوس کہ دو جلدیں لکھی تھیں کہ وقت آخر ہو گیا۔ اور باقی کام اپنے لائق اور عزیز شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کے سپرد کر گئے۔ پہلی جلد مکمل اور دوسری جا بجا سے ناقص تھی۔ سید صاحب موصوف نے اُسے پورا کیا اور باقی جلدیں تمام و کمال انہی کی تصنیف ہیں۔

سیرۃ النبیؐ کے مباحث

پہلی جلد میں حسب ذیل مباحث ہیں:-

(۱) دیباچہ و فن روایت (۲) فن سیرۃ پر تبصرہ (۳) مقدمۂ تاریخ عرب قبل اسلام (۴) سلسلۂ نسب، ظہور قدسی اور نبوت سے پہلے کے حالات۔ (۵) رسالت سے ہجرت تک (۶) ۱ھ سے ۱۱ھ تک کے واقعات علٰحدہ علٰحدہ سنہ کے تحت میں۔ (۷) غزوات نبوی پر عمومی تبصرہ اور مسئلۂ جہاد۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ پوری جلد سوائے چند حواشی کے تمام کی تمام خود شبلی کی لکھی ہوئی ہے۔ دوسری جلد کا بڑا حصہ مولانا شبلی کا ہے اور جا بجا مولانا سید سلیمان ندوی کے اضافے ہیں۔ اس میں حسب ذیل مباحث ہیں:-

(۱) قیام امن (۲) اشاعت اسلام (۳) تاسیس حکومت الٰہی، (۴) مذہبی انتظامات (۵) تاسیس و تکمیل شریعت (۶) عقائد اور اسلام کے اصول اولیں (۷) معاملات، حرام و حلال (۸) سال آخر، حجۃ الوداع، اختتام فرض نبوت (۹) وفات (۱۰) متروکات۔ (۱۱) شمائل (۱۲) معمولات (۱۳) مجالس النبی (۱۴) خطابت نبوی (۱۵) عبادات نبوی (۱۶) اخلاق نبوی (۱۷) ازواج مطہرات (۱۸) اولاد (۱۹) ازواج مطہرات کے ساتھ معاشرت۔

---

[1]

www.urduchannel.in

مآخذ واصول

اس سلسلے میں مولانا شبلی خود فرماتے ہیں :-

اورنگ زیب قاسمی

"ہمنے اس کتاب میں جو اصول اختیار کئے ہیں اب انکے بتانے کا وقت آگیا ہے۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے اُن کو سب پر مقدم رکھا ہے۔ یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جنسے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ لیکن لوگوں نے آیات قرآن پر اچھی طرح نظر نہیں ڈالی۔ اسلئے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے۔

(۲) قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے۔ احادیث صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں انکے مقابلے میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ارباب سیر کو ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ واقعات کو کتب حدیث میں ان موقعوں پر ڈھونڈھتے ہیں جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے اسکو درج ہونا چاہئے۔ اور جب ان کو ان موقعوں پر وہ روایت نہیں ملتی تو وہ کم درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں۔ لیکن کتب حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آجاتے ہیں۔ اسلئے اگر عام استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں خود "صحاح ستہ" کی روایتیں ملجاتی ہیں۔ ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈھکر مہیا کئے جو اہل سیر کی نظر سے اوجھل رہ گئے تھے۔

(۳) روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی ہیں۔ لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں اُن کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا جاتا ہے اور تا امکان کد و کاوش کی ہے۔ اس خاص ضرورت کے لئے ہمنے پہلا کام یہ کیا کہ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ انتخاب کر لئے جنکی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے ان کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا تاکہ جس سلسلۂ روایت کی تحقیق مقصود ہو آسانی ہو جائے۔

(۴) جن فروگذاشتوں کی تفصیل اوپر ہو چکی ہے جہانتک ممکن تھا ان کی اصلاح اور تلافی کی ہے۔"[1]

---

[1] سیرۃ النبی : ص ۷۲-۷۳ : مطبوعہ نامی پریس کانپور : ۱۹۱۴ء

www.urduchannel.in

سیرۃ النبی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم نے اسکی تالیف کے لئے کتنا وسیع مطالعہ کیا تھا۔

اورنگ زیب قاسمی

حدیث، تفسیر، رجال، تاریخ، طبقات، سیرت کی سینکڑوں کتابوں سے انھوں نے مواد فراہم کیا۔ تاریخ اسلام اور سیرت نبوی سے متعلق یورپین مصنفین کی اہم تصانیف بھی انکے پیش نظر تھیں۔ اس کا اندازہ اس فہرست سے ہو جائے گا:-

(۱) استیعاب ابن عبدالبر (۲) فتوح البلدان بلاذری (۳) طبقات ابن سعد (۴) ابوداؤد (۵) جامع بیان العلم ابن عبدالبر (۶) صحیح بخاری (۷) سنن ابن ماجہ (۸) تذکرۃ الحفاظ ذہبی (۹) موضوعات ملا علی قاری (۱۰) فہرست ابن ندیم (۱۱) میزان الاعتدال ابن حجر (۱۲) تہذیب التہذیب ابن حجر (۱۳) کشف الظنون (۱۴) صحیح ترمذی (۱۵) فتح المغیث (۱۶) کتاب التوسل علامہ ابن تیمیہ (۱۷) ~~مواہب~~ لدنیہ قسطلانی ~~اور اسکی~~ شرح بخاری (۱۸) صحیح مسلم (۱۹) فتح الباری (۲۰) نووی شرح مسلم (۲۱) زاد المعاد ابن قیم (۲۲) محمد اور محمد ازم (از باسورتھ اسمتھ) (۲۳) انسائیکلوپیڈیا۔ جی۔ ڈبلو۔ تھاپر (۲۴) لٹریری ہسٹری آف دی عرب رنالڈ نکلسن (۲۵) ترجمہ کتاب ہنری دی کاستری (۲۶) مارگولیس، محمد (۲۷) سیرۃ محمد ڈاکٹر اسپرنگر (۲۸) گولڈ مائنس آف مڈین (۲۹) تاریخی جغرافیہ عرب از ریونڈ فارسٹر (۳۰) تمدن عرب لی بان (۳۱) ملل ونحل عبدالکریم شہرستانی (۳۲) طبقات الامم لابن صاعد اندلسی ~~لابن سعد الاندلسی~~ (۳۳) معجم البلدان یاقوت (۳۴) معارف ابن قتیبہ (۳۵) سیرۃ ابن ہشام (۳۶) لائف آف محمد میور (۳۷) توراۃ (۳۸) موطائے امام مالک (۳۹) امالی ابوعلی قالی (۴۰) اصابہ فی احوال الصحابہ ابن حجر ~~(۴۱) نبراس فی شرح عیون الاثر لابن سید الناس~~ (۴۱) مواہب لدنیہ زرقانی، (۴۲) نور النبراس فی شرح ابن سید الناس (۴۳) مسند امام احمد بن حنبل (۴۴) ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ کارلائل (۴۵) ریاض النضرۃ محب الطبری (۴۶) عقد الفرید ابن عبدربہ (۴۷) روض الانف سہیلی (۴۸) انساب الاشراف بلاذری (۴۹) ابن الاثیر (۵۰) ابوالحجاج کا دفری ہیگنس (۵۱) ~~مواہب لدنیہ~~ (۵۲) وفاء الوفا سمہودی (۵۳) یعقوبی (۵۴) لباب فی اسباب النزول للسیوطی (۵۵) تاریخ الخمیس (۵۶) طبری ابن جریر (۵۷) تفسیر بیضاوی، (۵۷) تفسیر ابن جریر (۵۸) ادب المفرد امام بخاری (۵۹) مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی (۶۰) سیرۃ ~~ابن ہشام~~ وغیرہ۔

اس فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سیرت کا کام کس قدر مشکل تھا۔ اور اسکے لئے کس قدر وسیع مطالعہ کی ضرورت تھی، سینکڑوں عربی، انگریزی، فرانسیسی کتابوں کا مطالعہ، ان میں سے واقعات

www.urduchannel.in

کا نکالنا، صحیح اور غلط واقعات کو الگ کرنا، ان کو ترتیب دینا اور نتائج نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔

اورنگ زیب قاسمی

سیرۃ النبی کی خصوصیات

آگے چل کر تمام تر کتاب کی بنیاد چونکہ انھیں اصولوں پر رکھنا تھی، اسلئے اسے نہایت تفصیل و شرح کیساتھ لکھا ہے۔ پوری بحث بڑی تقطیع کے ۵۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ سیرت نگاری کے لئے صحیح واقعات کا فراہم ہونا نہایت ضروری ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات اور واقعات کے روایت کرنے والوں میں سے " تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلمبند کئے گئے ہیں"۔ حالانکہ راویوں کی تعداد بعض مصنفین کے نزدیک چار پانچ لاکھ تک پہونچ جاتی ہے۔ احادیث میں جو حلال و حرام کے متعلق ہیں ان میں محدثین نے نہایت تحقیق و احتیاط سے کام لیا ہے۔ لیکن سیرت کے سلسلے میں عام طور پر ایسی سخت احتیاط نہیں برتی گئی ہے۔ چنانچہ شبلیؔ حافظ زین الدین عراقی، استاد حافظ ابن حجر کا یہ قول نقل کرتے ہیں:۔

> " طالب فن کو جاننا چاہئے کہ سیرت میں ہر قسم کی روایتیں نقل کیجاتی ہیں۔ صحیح بھی اور قابل انکار بھی"۔ [۲]

اسلئے سیرت کی تصنیف کے وقت اس تمام تحریری سرمایہ کو پیش نظر رکھنا تھا۔ جو اس عہد سے ابتک بہم پہنچا ہے۔ چنانچہ پہلے فن سیرت کی ابتداء اور تحریری سرمایہ کا حال لکھا ہے۔ اس سلسلے میں عربی خط کی ایجاد کا مسئلہ بھی آگیا۔ لیکن اسکے متعلق شبلی کی معلومات نہایت سرسری ہیں۔ عربی زبان کے سلسلے میں مقالات میں جو تنقید کی گئی ہے وہ اس موقع پر پیش نظر رکھنا چاہئے۔ شبلی خود ان الفاظ میں اس کا اعتراف کرتے ہیں:۔

> " اس خط کی تاریخ اور اسکی ابتداء کے متعلق جو قدیم روایتیں کتابوں میں مذکور ہیں اکثر افسانہ ہیں"۔ [۳]

اسکے بعد عرب میں احادیث نبوی کی تحریر و ترتیب اور تاریخی کتب کی تصنیف کا مختصر حال لکھا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کونسے محدث اور کونسے مورخ زیادہ قابل اعتبار ہیں اور کیوں۔ آگے چل کر چونکہ انہی اصولوں پر سیرت نبوی لکھی گئی ہے اسلئے یہ حصہ جو بظاہر سیرت نبوی سے غیر متعلق نظر آتا ہے کتاب کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ان تصانیف کا ایک نقشہ دیا ہے جو علمائے سیر کی تصنیف ہیں۔ ایسے مصنفوں کی تعداد تیس ہے۔ یہ صرف متقدمین کی فہرست ہے۔ متاخرین نے جو کچھ لکھا ہے انہیں کی تحریروں سے

---

۱ سیرۃ النبی : ص ۔۔
۲ " : ص ۔۔
۳ " : ص ۔۔

www.urduchannel.in

سے ماخوذ ہے اور اسی لئے ان کی تفصیل کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی ۔ لیکن شبلی نے متاخرین کی خاص تصانیف اور تالیفات

اورنگ زیب قاسمی

کا بھی ذکر کیا ہے ۔

اسکے بعد اسماء الرجال کی تدوین کی تاریخ لکھی ہے اور ان متقدمین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے شروع دور میں اس کا سرمایہ فراہم کیا ۔

ابتک جو بحث تھی وہ روایات سے متعلق تھی ۔ چونکہ واقعات کی صحت یا عدم صحت کا اندازہ درایت یعنی عقلی شہادت سے بھی کیا جاتا ہے ۔ اسلئے دیباچہ کا دوسرا موضوع درایت ہے ۔ اسکے شبلی نے حسب ذیل دس اصول گنائے ہیں جو ابن جوزی کی تحریروں سے ماخوذ ہیں ۔ شبلی نے اسکی صراحت کر دی ہے کہ یہ اصول جوزی نے قائم نہیں کئے ہیں بلکہ محدثین کے اقوال سے ماخوذ ہیں :-

"(۱) جو روایت عقل کے مخالف ہو ۔

(۲) جو روایت اصول مسلّمہ کے خلاف ہو ۔

(۳) محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو ۔

(۴) قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور اسمیں تاویل کی کچھ گنجائش نہ ہو ۔

(۵) جس حدیث پر معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو ۔

(۶) معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو ۔

(۷) وہ روایت رکیک المعنی ہو مثلاً کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ ۔

(۸) جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ اور کسی نے نہیں کی ۔ اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو ۔

(۹) جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقفیت ہونے کی ضرورت ہو ۔ باینہمہ راوی کے سوا کسی اور نے اسکی روایت نہ کی ہو ۔

(۱۰) جس روایت میں ایسا قابل اعتناء واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں آدمی اسکی روایت کرتے باوجود اسکے کہ صرف ایک ہی آدمی نے اسکی روایت کی ہو ۔" [۱]

دیباچہ کے مطالعہ کے بعد غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جسطرح علامہ ابن خلدون کا مقدمہ تاریخ ایک مستقل تصنیف ہے کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتا ہے ۔ اسیطرح شبلی کا یہ دیباچہ اُردو میں مقدمہ نگاری کی ایک نئی

---

[۱] سیرۃ النبی : ص ۶۳

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمي

مثال ہے ۔ مولانا آزاد کا "مقدمۂ آبحیات" اور حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" عام طور پر مشہور ہیں ۔ اسکی وجہ غالباً ملک کا مذاق ہے ۔ لیکن شبلی کے اس مقدمہ کو اگر سیرۃ سے علیحدہ کرلیں تو بھی اسکی مستقل حیثیت قائم رہتی ہے ۔ منطقیانہ استدلال، ترتیب، وسعت نظر، اصابت رائے، نقد و نظر کا جیسا نمونہ اس مقدمہ میں ملتا ہے اردو کے کسی اور مقدمے یا دیباچے میں نہیں ملتا ۔

سیرۃ کے مضامین پر تبصرہ کرنا ہمارا موضوع سے خارج ہے ۔ یہ ادب سے زیادہ دینیات کے طالب علم کا فرض ہے ۔ اس سلسلے میں ہم پر جو اثرات ہوئے ہیں صرف ان کا بیان کرنا کافی ہوگا :۔

(۱) یوروپین مورخین کے اعتراضات کا جو اسلام یا مسلمانوں پر کرتے ہیں جواب انکی تصانیف اور زندگی کا مشن اور مقصد تھا جو انکی تصانیف بالخصوص مقالات سے ظاہر ہے ۔ سیرۃ کے لکھنے کی تحریک بھی علاوہ اور اسباب کے ایک متعصب یوروپین مورخ کی تصنیف سے پیدا ہوئی ۔ چنانچہ اس سلسلے میں بھی شبلی نے ہر قسم کے مخالفانہ لٹریچر کی فراہمی میں بڑی کوشش کی ۔ اسکا اندازہ اس فہرست سے ہوتا ہے جسمیں انہوں نے یوروپین مصنفین کی تمام تصانیف کا ذکر کیا ہے جو رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور اصول اسلام کے متعلق ہیں ۔ اور اس سلسلے میں ایک پورا باب لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں کس طرح اسلامی تاریخ اور عقائد کے متعلق تصنیفات کا آغاز ہوا اور شروع ہی سے یہ مصنفین کسقدر تعصب، جہالت اور ہٹ دھرمی میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ اس سلسلے میں یہ بات نہایت قابل تعریف ہے کہ باوجود اس عشق کے جو شبلی کو حضرت رسول اللہ صلعم کی ذات قدسی صفات سے تھا انہوں نے جہاں کہیں ایسے مورخین کے اتہامات نقل کئے ہیں جنکو سنکر مسلمانوں کو غیظ و غضب آجائے، شبلی نے اس موقع پر بڑے ضبط سے کام لیا ہے اور تاریخی حیثیت و نیز اصول روایت سے بھی اسکی تردید کی ہے ۔ اور کسی موقع پر انکا لہجہ متانت و سنجیدگی سے الگ نہیں ہوا ہے ۔

(۲) تاریخ شبلی کا خاص موضوع تھا، ان کی مختلف تصنیفات اور مقالات میں بار بار اسکی مثالیں ملتی ہیں ۔ سیرۃ کی فہرست مآخذات سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے لیکن سیرۃ کے سلسلے میں انھوں نے جسقدر مطالعہ کیا اور جیسی احتیاط ملحوظ رکھا اسکی مثال اور کسی تصنیف میں نہیں ملتی ۔

(۳) شبلی کے متعلق کسی اور موقع پر ہم کہہ چکے ہیں کہ انھوں نے اردو میں سب سے پہلے تاریخ پر

www.urduchannel.in

فلسفہ کا رنگ چڑھایا اسکی سب سے اچھی مثال سیرت ہے۔ دیباچہ کا ہم مفصل جائزہ لے چکے۔ پوری
اورنگ زیب قاسمی
کتاب اسکی شاہد ہے۔ شبلی کے بعد اردو میں تصانیف کی بڑی کثرت ہوگئی لیکن کوئی تاریخ کی کتاب ایسی نہیں نکلی جو اس درجہ فلسفہ تاریخ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہو۔ اسلئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ایسی تحقیق و تلاش، صحت اور احتیاط سے سیرت نبوی پر کوئی اور تصنیف اردو کے علاوہ دنیا کی کسی اور زبان میں بھی نہیں نکلے گی۔ چنانچہ فارسی اور ترکی میں اسکے ترجمے ہونے سے ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے۔

سیرۃ میں مولانا شبلی کی انشا پردازی

سیرت، شبلی کی زندگی کے آخری دو سال کی محنت کا ثمرہ ہے۔ جس شخص نے اس سے پہلے تقریباً بیس سال تک ہزاروں صفحے لکھے ہوں اسکے اسلوب میں جو پختگی پیدا ہو چکی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ اگرچہ ان کی اور تصانیف میں بھی انشاء کا کوئی عیب نظر نہیں آتا لیکن سیرت کی یہ خصوصیت ہے کہ اسے انکی انشاء پردازی کا بہترین نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلی خصوصیت "زور بیان" ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جی لگا کر سیرت لکھی گئی ہے۔ ویسے کوئی اور کتاب اور مضمون نہیں لکھا۔ زور بیان کے متعدد نمونے سیرۃ کے ہر ہر صفحے پر ملتے ہیں۔ یہاں صرف چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(۱) "ایک طرف نود سالہ پیر ضعیف ہے جسکو دعاہائے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا ہے جسکو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا ہے۔ ایسی محبوب کے قتل کے لئے اسکی آستین چڑھ چکی ہے اور ہاتھ میں چھری ہے۔ دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے جسنے بچپن سے آجتک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے اور اب باپ ہی کا دہر بردار ہاتھ اس کا قاتل نظر آتا ہے۔ ملائکہ قدسی فضائے آسمانی، عالم کائنات، یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اور انگشت بدنداں ہیں۔ کہ دفعتاً عالم قدس سے آواز آتی ہے:۔

"یا ابراھیم قد صدقت الرؤیا انا کذالک نجزی المحسنین"

(ابراہیم تونے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم نیک بندوں کو اسطرح بدلا دیا کرتے ہیں)

طغیان ناز بین کہ جگر گوشۂ خلیل
در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کند[1]

(۲) یہ حالت صرف عرب کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ تمام دنیا میں یہی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ (اسکی تفصیل کتاب کے

---

[1] سیرۃ النبی : ص ۱۱۵

www.urduchannel.in

دوسرے حصّے میں آگئی) کیا اس عالم ظلمت، اس عالمگیر تاریکی اور اس وسیع اور ہمہ گیر تیرگی میں

اورنگ زیب قاسمی

ایک آفتاب عالم تاب کی حاجت نہ تھی" [۱]

(۳) "یہ فطرت سلیم اور نیک سرشتی کا اقتضا تھا، لیکن ایک شریعت کبریٰ کی تاسیس ایک مذہب کامل کی تشیید اور رہنمائی کونین کے منصب اعظم کیلئے کچھ اور درکار تھا۔" [۲]

(۴) "یہی طریقے ہیں جو ابتدا سے آجتک تمام دنیا میں جاری ہیں۔ اور اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل اور سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں۔ نہ جبر و زور سے کام لیا جائے، بلکہ فضائل کا اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آجائے۔ جو خود ہمہ تن آئینہ عمل ہو جسکی ہر جنبش لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جسکا ایک اشارہ اوامر سلطانی بن جائے۔ دنیا آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہی نقوش قدسیہ کا پرتو ہے۔ دیگر اور اسباب صرف ایوان تمدن کے نقش و نگار ہیں۔ لیکن اسوقت تک دنیا کی جس قدر تاریخ معلوم ہے انسے اس قسم کے نفوس قدسیہ جو پیش کئے ہیں وہ فضائل اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے۔ مثلاً جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے مکتبہ درس میں صرف حلم و تحمل، صلح و عفو، قناعت و تواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت و فرمانروائی کے لئے جو فضائل و اخلاق درکار ہیں مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے۔ حضرت موسیٰ اور نوح علیہم السّلام کے اوراق تعلیم میں عفو عام کے صفحے خالی ہیں۔ اس بنا پر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی اور اسلئے عالم انسانی اپنی تکمیل کے لئے ہمیشہ ایسے جامع کامل کا محتاج رہا جو صاحب شمشیر و نگیں بھی ہو اور گوشہ نشین بھی، بادشاہ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو اور سبحہ گرداں بھی، مفلس قانع بھی ہو اور غنی دریا دل بھی، یہ برزخ کامل، یہ ہستی جامع، یہ صحیفۂ یزدانی۔ عالم کون کی آخری معراج ہے۔

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ" [۳]

لیکن زور بیان نے کہیں علمی اور منطقیانہ وقار کو صدمہ نہیں پہونچایا ہے۔ شبلی جانتے تھے کہ وہ سیرت لکھ رہے ہیں جسمیں ذراسی لغزش بھی انکے نزدیک گناہ کبیرہ کے مترادف تھی، اسلئے انھوں نے حقیقت نگاری کو ہر موقع پر ملحوظ

۱۔ سیرۃ النبی : ص۹۳

۲۔ سیرۃ النبی : ص۱۲۶

۳۔ سیرۃ النبی : ص۱-۲

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

رکھاہے ۔ انکے اس وصف کی طرف ہم انکے اسلوب انشاء پر تبصرہ کرتے وقت اظہار خیال کر چکے ہیں ۔ سیرت میں جوش عقیدت کی بنا پر کہنے کا بہت کچھ موقع مل سکتا تھا لیکن شبلی نے اسے فراموش نہیں کیا کہ وہ مورخ پہلے ہیں اور انشاء پرداز بعد میں ۔ باایں ہمہ سیرت کی عبارت اکثر موقعوں پر نہایت رنگین ہے ۔ فقرے اور ترکیبیں رقصاں نظر آتی ہیں ۔ بالخصوص جہاں جذبات کی شدت ہوتی ہے ۔ زور بیان میں اسکی مثالیں اوپر نقل ہوئیں ۔ یہ رنگینی بالعموم اسطرح آئی ہے کہ طرح طرح سے کئی فقروں میں ایک ہی مطلب کو دلنشین پیرائے میں بیان کیا ہے ۔ شبلی کے یہاں عبارت کا یہ نمونہ سوائے سیرت کے اور تصنیف میں مشکل سے ملے گا ۔ اس اعتبار سے شبلی کا تصنیفی شاہکار اگر کوئی کتاب کہی جاسکتی ہے تو وہ یہی سیرۃ النبی ہے ۔ سیرۃ النبی کے مقابلے میں شبلی اپنی اور اہم تصانیف کو جس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ اس قطعہ سے ہو سکتا ہے ؎

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

معلوم ہوتا ہے کہ آخری مصرعہ ہاتف غیب نے ہی انکے کان میں کہا تھا ۔ سیرت کی دوسری جلد ختم نہ ہونے پائی کہ خود انکا خاتمہ بالخیر ہو گیا اور ان کی تصنیفی زندگی پر سیرت کی پاک مہر لگ گئی ۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

مقالاتِ شبلی (حصّہ اول)

(مذہبی)

مضمون نگاری کا آغاز اور اُسکا اجمالی خاکہ

اُردو نثر کی مختصر تاریخ کا ذکر پہلے ہوا۔ اس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اُردو کے پُرانے سرمایہ میں مذہبی تصانیف، رسالے، قصہ کہانیوں کی کتابیں اور خال خال علمی اور ادبی تصانیف لکھنے کا رواج ہو گیا تھا۔ انیسویں صدی کے نصف اول تک اُردو کے انشاء پردازوں نے مقالہ نگاری یا مضمون نویسی کی طرف توجہ نہ کی۔ یہاں تک کہ مغربی ادب کے اثر سے نئے دور کا آغاز ہوا۔ اسکے نمونے سرسید کے مضامین، آزاد کے نیرنگ خیال، حالی کے مقالات اور شبلی کے مضامین میں ملتے ہیں۔ سرسید اس جماعت کے سرخیل ہیں۔ سب سے زیادہ مضامین انہی کے قلم سے نکلے ہیں۔ انھوں نے انگریزی کے مشہور انشاء پرداز اسٹیل اور اسٹونس کے انداز پر جو "اسپیکٹیٹر" اور "ٹیٹلر" میں مضامین لکھا کرتے تھے اردو میں مضمون کا آغاز کیا۔ "تہذیب الاخلاق" میں ان دونوں مصنفین کے مضامین اکثر ترجمہ ہو کر شائع ہوئے۔ اور اس سے عام طور پر لوگ اسطرف متوجہ ہوئے۔ اس قسم کا پہلا مقالہ "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" علی گڑھ میں آکر ہی لکھا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مقالہ نگاری میں شبلی کب اور کس سے متاثر ہوئے۔

مضمون نگاری یا مقالہ نویسی کی چند ضروری شرطیں

مقالہ کے لئے ضروری ہے کہ اسکے عنوان کو واضح اور متعین کر لیا جائے تاکہ اختصار کے ساتھ ایک موضوع یا موضوع کے ایک پہلو پر سیر حاصل بحث کی جا سکے۔ یہ بحث بجائے خود بالکل مکمل ہو۔ اور اسکے لئے ضروری ہے کہ اس موضوع کے متعلق جتنا لکھا جا چکا ہے وہ سب مضمون نگار کے پیش نظر ہو۔ تاکہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ تحقیقی مضامین میں ماخذوں کا ذکر ضروری ہے۔ اس سے ایکطرف مضمون کا معیار ظاہر ہوگا، دوسری طرف اس موضوع پر آئندہ لکھنے والوں کے لئے مواد کی فراہمی میں رہنمائی ہوگی۔ اس اعتبار سے شبلی کے مضامین اور مقالات ان کی تصانیف میں نہایت اہم درجہ رکھتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے مقالات آٹھ جلدوں میں تقسیم ہیں۔ ان میں پہلی جلد

www.urduchannel.in

مذہبی مقالات کی ہے۔ ان پر ترتیب وار اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

مقالات شبلی جلد اول کے مباحث

پہلی جلد میں ۱۶ مذہبی مقالے ہیں۔ انکے عنوانات حسب ذیل ہیں :-

(۱) تاریخ ترتیب قرآن　(۲) علوم القرآن

(۳) اعجاز القرآن　(۴) قرآن مجید میں خدا نے کیوں قسمیں کھائی ہیں

(۵) قضا و قدر اور قرآن مجید　(۶) یورپ اور قرآن کے عدیم الصحت ہونے کا دعویٰ

(۷) مسائل فقہیہ پر زمانے کی ضرورتوں کا اثر　(۸) وقف اولاد

(۹) پردہ اور اسلام　(۱۰) الاسلام

(۱۱) مسلمانوں کو غیر مذہب کا محکوم ہو کر کیونکر رہنا چاہئے　(۱۲) غیر قوموں کی مشابہت

(۱۳) خلافت　(۱۴) حقوق ذمیین

(۱۵) الجزیہ　(۱۶) اختلاف اور مسامحت

مقاصد

یہ مقالات ایک ہی مقصد کے ماتحت تحریر کئے گئے ہیں" یعنی اسلام اور مسلمانوں کی عظمت" یہ عملاً تین صورتوں سے ممکن تھا۔ ایک تو یہ کہ خود مسلمانوں کو اسلام کے عقائد میں جو شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں ان کی اصلاح کیجائے۔ دوسرے یہ کہ مخالفین اسلام کے جو اعتراضات تھے ان کا جواب دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ ان دونوں پہلوؤں سے قطع نظر اسلام اور مسلمانوں کے محاسن دکھائے جائیں۔ یہی امور شبلی کی تمام مستقل تصانیف کا موضوع ہیں۔ اور یہی ان کا اصلی مقصد تھا لیکن یہ مقصد ان مقالات سے پوری طرح حل نہیں ہوتا۔

تبصرہ

فہرست مندرجہ بالا میں سے چھ مقالے قرآن حکیم کے متعلق مختلف مسائل سے متعلق ہیں۔ مسلمانوں کے ایمان و عقائد کا سنگ بنیاد قرآن مجید ہے۔ اسلئے اگر کسی مسلمان کو کلام مجید ہی کی کسی حیثیت کے متعلق کوئی شک و شبہ ہو تو اسکا مذہب ہی ختم ہو جائیگا۔ اور چونکہ مذہب کے ساتھ مسلمانوں کی معاشرت کے اصول بھی قرآن مجید کی روشنی میں مدون اور مرتب کئے گئے ہیں اسلئے کلام مجید پر شک و شبہہ سے نہ صرف مذہبی بلکہ عام امور معاشرت میں بڑا رخنہ پڑنے کا اندیشہ ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں میں شروع سے بہت سے فرقے پیدا ہو گئے۔ ان میں سے بعض نے یہ مان لیا کہ قرآن حکیم میں رسول اکرم کے بعد تحریف ہوئی اور اسکے مختلف

www.urduchannel.in

نسخوں کا جن میں باہم اختلاف ہے پتہ چلتا ہے اور جو اب تک موجود ہیں ۔ اسلئے یورپ کے معترضین کو یہ کہنے کا موقع مل گیا
اورنگ زیب قاسمی
کہ مسلمان توریت اور انجیل پر جو اعتراض کرتے ہیں اس سے قرآن مجید بھی بری نہیں ۔ شبلی نے اس خطرہ کو بروقت محسوس کیا اور نہایت تحقیق و تلاش سے یہ ثابت کیا کہ قرآن مجید رسول اللہ صلعم کے زمانے میں پورا مرتب و مدون ہو چکا تھا اور بعد میں جیسی احتیاط قرآن حکیم کی حفاظت میں برتی گئی اسکی مثال دنیا کی کسی اور کتاب میں نہیں ملتی ۔ اثنا عشری فرقہ کا خیال ہے کہ جامع القرآن حضرت ابوبکرؓ، اور حضرت عمرؓ ہیں ۔ اور حضرت عثمانؓ نے اس کو بزور حکومت شائع کیا تھا اور یہ تینوں انکے نزدیک غیر ثقہ اور اہل بیت نبوی کے دشمن تھے ۔ اسلئے انھوں نے وہ آیات جو اہل بیت کی مدح میں تھیں اور ان کے مقصد کے منافی تھیں کلام مجید سے خارج کر دیں ۔ اسلئے ان کا مرتب کردہ قرآن قابل اعتماد نہیں ۔ صحیح اور قابل اعتماد نسخہ صرف حضرت علیؓ کا مرتب کردہ تھا ۔ حضرت علیؓ کے صحیفہ کے وجود کو شبلی نے بھی تسلیم کیا ہے ۔ ابن الندیم نے فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کم از کم چوتھی صدی ہجری تک ضرور موجود ہوگا ۔ لیکن عام شیعی عقائد کے خلاف شبلی کو علامہ طبرسی کا جو مشہور اور مستند شیعی مفسر ہیں یہ بیان مل گیا ہے :۔

> "........ یہ امر کہ قرآن مجید میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے سب کے نزدیک باطل ہے ۔ باقی نقصان
> تو ہمارے فرقہ میں سے ایک گروہ نے اور سنیوں میں حشویہ نے روایت کی ہے کہ قرآن مجید میں
> تغیر اور نقصان ہو گیا ہے ۔ لیکن ہمارے فرقہ کا صحیح مذہب اسکے خلاف ہے ۔ اور سید مرتضیٰ نے
> اسکی تائید کی ہے ......" [1]

دوسرا مقالہ "علوم القرآن" پر ہے اسمیں کلام مجید سے متعلق علمائے اسلام کی علمی خدمات اور اسکے مختلف پہلوؤں پر جو علمی سرمایہ مہیا کیا گیا ہے اسکی تفصیل ہے ۔ مثلاً :۔

(۱) تفسیر (۲) مسائل فقہ (۳) اسکے عربی الفاظ

(۴) امثال قرآنی (۵) نکات آیات مکررہ

مختلف موضوعات پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حسب ذیل چھ قسموں کی تحت میں بیان کیا ہے :۔

(۱) فقہی (۲) ادبی (۳) تاریخی

(۴) نحوی (۵) لغوی (۶) کلامی

---

[1] بحوالہ مقالات شبلی : جلد اول : ص ۱۳

www.urduchannel.in

انیں سے ہر موضوع کی اہم تصانیف کا مختصر حال بیان کیا گیا ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

کلام مجید کے مختلف پہلوؤں پر مسلمانوں نے جس قدر کتابیں لکھیں انکا استقصاء بہت دشوار ہے اسلئے علامہ شبلی نے صرف خاص خاص اہم کتابوں اور مضمونوں کا ذکر کرنے پر اکتفا کی ہے۔ اگلا مقالہ "اعجاز القرآن" پر ہے۔ یہ مضمون نہایت مختصر ہے اور صرف ۱۰ صفحوں میں تمام ہو گیا ہے۔ اسمیں یہ دکھایا گیا ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز کس وصف کے لحاظ سے ہے اور کلام پاک کی آیات سے ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن کا حقیقی اعجاز اسکے، ناصح، رہنما، بشیر، نذیر، نور، حکیم ہونے کے اعتبار سے ہے گو عام طور سے لوگ اسکی فصاحت و بلاغت کو بھی اعجاز سمجھتے ہیں لیکن یہ انکی کم فہمی ہے کہ وہ صرف اسی حیثیت سے کلام مجید کو معجز سمجھتے ہیں۔ خود قرآن پاک کا دعویٰ ہے کہ وہ "ہدایت" کے لحاظ سے معجز ہے۔

چوتھے مقالہ میں مخالفین اسلام کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائی ہیں۔ لیکن یہ کوئی ایسا مہتم بالشان مسئلہ نہیں ہے۔ اور نہ اسکو اصول دین سے کوئی قریبی تعلق ہے۔ اسلئے اسے بھی مختصر طور پر چھ صفحوں میں ختم کر دیا ہے۔ اگر موجودہ زمانے کے حالات اور واقعات بالخصوص سرسید احمد خاں صاحب کی تحریک کو سامنے رکھکر مقالات کی پہلی جلد کا مطالعہ کیا جائے تو غالباً یہ دو مضمون زیادہ اہم اور مفید نظر آئیں گے:۔

(۱) مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیونکر رہنا چاہئے۔

(۲) غیر قوموں کی مشابہت

گزشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں۔ منجملہ انکے ایک یہ خیال تھا کہ اس ہنگامہ کی تمام تر ذمہ داری صرف مسلمانوں پر ہے کیونکہ ان پر از روئے مذہب عیسائیوں سے جہاد کرنا فرض ہے۔ یہ صرف عوام کا خیال نہیں تھا بلکہ پڑھے لکھے انگریز بھی کہتے تھے، اور ہنٹر[1] نے ایک مستقل کتاب اسپر لکھی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کو مسلمانوں کی جانب سے بڑی بدگمانی پیدا ہو گئی اور ان کا سارا زلزلہ انہی پر گرنے لگا۔ سرسید احمد خاں نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی اور اسکی تردید میں ایک رسالہ لکھا جسمیں دکھایا کہ گو مسلمان اس ہنگامہ میں شریک تھے لیکن اسکی ذمہ داری تنہا انپر عائد نہیں ہو سکتی، اور نہ انہوں نے مذہبی جذبے کے تحت جہاد کیا تھا بلکہ اس کا سبب خود انگریزوں کی

---

[1] سر ولیم ہنٹر بنگال کے آئی، سی، ایس تھے، کتاب کا نام 'انڈین مسلمس' ہے۔ اب اردو میں اس کا ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔

www.urduchannel.in

بعض غلطیاں تھیں - اس رسالہ کو انھوں نے پارلیمنٹ کے ممبروں میں تقسیم کرایا - اس سے نازک صورت پیدا ہو گئی
اورنگ زیب قاسمی
تھی اور خود سر سید پر انگریزوں کو شبہہ ہونے لگا تھا - لیکن بہت جلد ان کی غلط فہمی رفع ہو گئی -

سر سید اچھی طرح جانتے تھے کہ نئی حکومت تقاضائے مبرم ہے جس سے گلو خلاصی کی کوئی صورت نہیں - اسلئے انھوں نے وہی کیا جو ایک عاقبت اندیش مدبر کو کرنا چاہئے - انھوں نے انگریزوں اور مسلمانوں کی باہمی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی - دونوں کے تعاون پر زور دیا - اور کوشش کی کہ مغربی علوم و فنون اور تہذیب و معاشرت میں سے "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے اصول پر جو اچھی چیزیں اخذ کرنے کے قابل ہوں وہ اخذ کر لی جائیں - اس کا صلہ ان کو یہ ملا کہ مسلمانوں کی طرف سے ابن الوقت، ماتم سرور کے علاوہ نعال اور نیچری کے خطابات ملے - اور عام طور سے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ سر سید کرسٹان ہو گئے - بالخصوص کوٹ، پتلون پہننے، چھری کانٹے سے کھانے کو لوگ صریح کفر سمجھنے لگے - ان کا استدلال یہ تھا کہ جو کافروں کی مشابہت پیدا کریگا اس کا حشر کافروں کے ساتھ ہوگا - اگر سر سید مخالفت کے اس طوفان سے گھبرا کر اپنا ارادہ بدل دیتے تو ہندوستانی مسلمان معلوم نہیں کس نوبت کو پہونچ چکے ہوتے - سر سید نے اپنے مضامین میں انہی خیالات کا اعادہ کیا ہے - مسلمانوں کی مغربی تعلیم کے بارے میں شبلی بھی سر سید کے ہمنوا تھے -

مسلمانوں کو محکوم بن کر رہنے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا - اسلئے وہ نئی حکومت کی ہر چیز سے بھڑکتے تھے اور عام طور سے یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کے مذہب اور ان کی تاریخ میں غیر قوموں کے ماتحت اور ان سے مل جل کر رہنے کی کوئی ہدایت نہیں ہے - شبلی نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی اور یہ دکھایا کہ خود رسول اکرم کے زمانے میں جب نجاشی کی سلطنت پر کسی دوسرے بادشاہ نے حملہ کیا تو مسلمان مہاجرین پنج وقتہ نماز میں اسکی فتح کی دعائیں مانگتے تھے - اور ایک قاصد متعین تھا جو ہر گھڑی خبریں پہونچاتا تھا - تاکہ ضرورت ہو تو خود جاکر نجاشی کی مدد کریں -

ایک دوسرا مسئلہ دار الاسلام اور دار الحرب تھا - ایک گروہ کا خیال تھا کہ عیسائیوں کی حکومت کیوجہ سے ہندوستان دار الحرب ہو گیا اور غالب قوم سے قتال واجب ہے حالانکہ اسی قسم کی صورت عراق و ایران پر تاتاریوں کے قبضہ کے زمانے میں پیش آ چکی تھی - لیکن اس زمانے کے علماء نے اس کو دار الحرب قرار نہیں دیا تھا - شبلی اُس کی تائید میں دلائل پیش کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں کہ :-

" واقعات مذکورہ بالا سے تم کو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلعم کے عہد زریں سے لیکر آجتک

www.urduchannel.in

مسلمانوں کا یہ شعار رہا کہ وہ جس حکومت کے زیر اثر رہتے اسکے وفادار اور اطاعت شعار رہتے،
اورنگ زیب قاسمی
یہ صرف اُن کا طرز عمل نہ تھا بلکہ اُن کے مذہب کی تعلیم تھی، جو قرآن مجید، حدیث، فقہ سب میں کنایتاً اور صراحتاً مذکور ہے۔" [1]

غیر قوموں کی مشابہت والا مضمون بھی کم اہم نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اس زمانے میں جس قدر موضوع بحث تھا آج بھی ہے۔ گو اب اس میں پہلی سی شدت باقی نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قومیت کی تشکیل اور قومی زندگی کی تعمیر میں اپنی مذہبی و قومی روایات و خصوصیات کا بڑا حصّہ ہوتا ہے لیکن یہ کہنا کہ محض اہل مغرب کی وضع اختیار کرنے سے ایمان میں خلل آجاتا ہے صحیح نہیں ہے۔ علامہ شبلی نے شاہ ولی اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:-

"انبیاء اور پیغمبروں کا یہ طریقہ تھا کہ کھانے پینے، لباس، تعمیرات، آرائش، خرید و فروخت وغیرہ کے متعلق وہ معمولات پر نظر ڈالتے تھے جو اُن کی قوم میں پہلے سے جاری تھے، اگر وہ معقول ہوتے تھے تو بحال خود رہنے دیتے تھے اور خاص باتوں میں کسی قسم کی برائی ہوتی تھی تو اسکی اصلاح کرتے تھے۔" [2]

تاریخی حوالوں سے شبلی نے اس کا ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ ملکی انتظامات میں حضرت رسول اکرمؐ نے بہت سے چیزیں مثلاً دیت، خمس، قسامہ وغیرہ کے وہی قاعدے جاری رکھے جو ایام جہالت میں تھے۔ حضرت عمرؓ نے قانون خراج اور "جزیہ" کے معاملے میں نوشیرواں کے قاعدوں کی تقلید کی۔ مقالے کے آخر میں اُن باتوں کو تفصیل سے دکھایا ہے جو قرنِ اول میں غیر قوموں سے لی گئیں۔ مثلاً غزوۂ احزاب میں ایرانیوں کے طرز پر مسلمانوں نے پہلی مرتبہ خندق کھودی۔ اور اسی دن سے یہ لفظ عربی زبان میں رائج ہوگیا اسیطرح رسول اللہ صلعم نے کوئی خاص لباس اختیار نہیں فرمایا۔ بلکہ جاہلیت میں جو لباس تھا وہی مستعمل رہا۔ اکثر چیزیں بعد میں (مثلاً پائجامہ) عجمیوں سے لی گئیں۔ برنس ایک لمبی ٹوپی عیسائیوں سے لی گئی اور اسے خود حضرت عمرؓ نے استعمال فرمایا۔ عربوں میں تابوت کی رسم نہیں ملتی۔ خود حضرت زینبؓ کے انتقال پر حبشیوں کی تقلید میں پہلی مرتبہ تابوت آیا۔ ملکی نظم و نسق، اور طریق جنگ بالکل فارسی اور یونانی اصول پر قائم ہوا۔ مسلمانوں کی طب ساری کی ساری یونانی ہے۔

---

[1] مقالاتِ شبلی : جلد اول : صہ ۱۷۲ : مطبوعہ معارف پریس : ۱۹۳۰ء

[2] " " " : صہ ۱۷۵-۱۷۶ : " " : "

www.urduchannel.in

اس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ شبلی کے خیالات میں کتنا انقلاب ہو گیا تھا۔ "اسکات المعتدی" کا متعصب مصنف اب روشن خیال اور آزادی پسند مسلمان کے زمرہ میں نظر آتا ہے۔ اور کفر کے فتووں سے بے پرواہ ہو کر سرسید کا ساتھ دیتا ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

اس حصہ کے دو مضامین "الجزیہ" اور "حقوق ذمیین" تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

آرمینیا کے جھگڑے میں ترکوں پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے اپنی عیسائی رعایا پر اس بنا پر سختیاں کیں کہ انکے مذہب میں ایسا کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ اسی زمانہ میں (۱۸۹۵ء) ایک پادری نے ایک آرٹیکل لکھا جس میں یہ ثابت کرنا چاہا کہ مذہب اسلام عیسائیوں کے حق میں نہایت ظالمانہ ہے۔ دلی کی مشنریوں نے اس کا ترجمہ شائع کیا۔ اور اپنی دانست میں مسلمانوں پر ایک بڑے الزام کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا۔ مولانا شبلی نے اسکی تردید میں ۴۰ صفحوں کا ایک مضمون لکھا۔ "حقوق ذمیین" کے سلسلہ میں پہلے جزیہ پر بحث تھی اسکی تفصیل آئندہ آئے گی۔ اس مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ جیسے ہلکے ٹیکس کے معاوضہ میں مسلمانوں کی ذمی رعایا کو کتنے حقوق اور مراعات حاصل ہو جاتی تھیں۔ عدل و انصاف میں انکے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہ کیا جاتا تھا۔ اگر ذمی حق پر ہوتا اور مسلمان ناحق پر تو مسلمان کو سزا ملتی تھی۔ کیونکہ بقول حضرت علیؓ جو لوگ ذمی ہو چکے ان کا خون ہمارا خون ہے اور انکا خون بہا ہمارا خون بہا، مال اور جائداد کے حقوق میں ذمی اور مسلمان برابر کا درجہ رکھتے تھے، خلافت راشدہ سے لیکر عباسیوں کے زمانے تک کے تاریخی واقعات اسکے شاہد ہیں کہ اس اصول پر عملاً کاربند رہنا مسلمان اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ذمیوں کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ان کے مذہب سے کوئی تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔ انکے گرجوں کو برباد نہیں کیا جاتا تھا، مذہبی رسوم ادا کرنے کی ان کو اجازت تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں حیرہ پر فتح حاصل ہوئی تو یہ معاہدہ ہوا:—

> "ان لوگوں کے گرجے برباد نہیں کئے جائیں گے، نہ ان کو سنکھ بجانے سے منع کیا جائیگا۔ نہ عید کے دن صلیب کے نکالنے سے روکا جائیگا۔"

یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے عہد میں خاص اسلامی شہروں میں بکثرت گرجے تعمیر ہوئے۔ آخر میں مولانا نے اور اسلامی حکومتوں کے علاوہ خود ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں اورنگ زیب جیسے بدنام متعصب فرمانروا کے زمانۂ حکومت میں غیر مسلم (ہندو) افسروں کا کیا غلبہ تھا اور ملک کی حکومت میں انکا کیا ہاتھ تھا۔ مقالہ

www.urduchannel.in

کی زبان اور بیان زور دار اور استدلال فلسفیانہ ہے۔ ایک ایک دعوے کی تائید میں متعدد تاریخی شہادتیں پیش
اورنگ زیب قاسمی
کی ہیں اور کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ اختصار کے باوجود اس مقالہ میں اتنا مواد موجود ہے جو ایک مستقل تصنیف کے لئے کافی ہوتا۔ "جزیہ" کے مسئلہ پر بھی ضمناً اس مضمون میں روشنی ڈالی ہے۔ لیکن مفصل بحث ایک مستقل مضمون میں کی ہے۔

"جزیہ" کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ مثلاً عام خیال ہے کہ جزیہ مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ اور انہوں نے اپنی غیر مسلم رعایا پر خاص ٹیکس لگایا تھا۔ یا جزیہ کی رقم اور اسکی وصولیابی میں اتنی سختی کی جاتی تھی کہ اس کے خوف سے ذمی مسلمان ہوجانا پسند کرتے تھے۔ شبلی نے پورے مقالہ کو تین بحثوں میں ختم کیا ہے:۔

(۱) جزیہ اصل میں کس زبان کا لفظ ہے اور کس معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۲) ایران اور عرب میں جزیہ کی بنیاد کب سے پڑی

(۳) اسلام نے اس کو کس مقصد سے اختیار کیا۔

پہلی بحث میں ثابت کیا ہے کہ جزیہ دراصل فارسی لفظ "گزیت" کا معرب ہے جو نوشیرواں کے عہد میں جب نوشیرواں کے عامل یمن اور اسکے قرب وجوار میں تھے۔ ایران سے عرب آیا۔ دوسری بحث میں یہ بیان کیا ہے کہ نوشیرواں نے اس کو فوجی ضرورتوں کی بنا پر لگایا تھا۔ اور جو لوگ فوجی خدمت ادا کرتے تھے وہ اس سے بری کر دئے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی ذمیوں کو فوجی خدمت سے بری کر دیا تھا۔ اسلئے قدرتی طور پر ان کی حفاظت ذمی کی حیثیت سے مسلمانوں پر عائد ہوتی تھی۔ مسلمان فوجیں لڑائیوں میں شریک ہوتیں اور سرحدوں کی حفاظت کرتیں۔ اسلئے ذمیوں کو اسکے بدلے میں بہت ہلکا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ اگر کوئی ذمی مسلمان کے ساتھ لڑائی میں شریک ہوتا یا مسلمان کی کسی اور طرح مدد کرتا تو وہ جزیہ سے بری کر دیا جاتا تھا۔ خلفائے راشدین اور اسکے بعد مسلمان فرمانرواؤں کے متعدد تاریخی عہد ناموں سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔

شبلی نے ان سب کو تفصیل سے لکھا ہے۔ جزیہ کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس ۲۰ سالانہ تھی
عام شرح چھ ۶ روپیہ سے تین روپیے تھی۔ بیس ۲۰ سال سے کم عمر اور پچاس سال سے زیادہ عمر کے لوگ اس سے مستثنیٰ تھے۔ عورتیں، مفلوج، معطل العضو، نابینا، مجنون، مفلس جزیہ سے بری تھے۔ مضمون مختصر ہے اور دس صفحوں پر محیط۔

www.urduchannel.in

نتائج

شبلی کے مذہبی مقالات کے جائزہ سے حسب ذیل نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں :۔

اورنگ زیب قاسمی

(۱) قرآن، حدیث، فقہ، اور تاریخ اسلام میں ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ ان کے ماخذ ان کتابوں کے علاوہ جو عام طور پر رائج تھیں، وہ نادر و نایاب تصانیف بھی تھیں جن کا علم بہت کم لوگوں کو تھا۔ اور جنکے نسخے صرف خاص خاص کتب خانوں میں پائے جاتے تھے، عربی و فارسی کتابوں کے علاوہ یورپین اہل قلم کی تصانیف بھی انکے پیش نظر رہتی تھیں۔

(۲) مذہب میں ان کے تین خاص موضوع تھے۔

(الف) جدید مذاق کے مطابق اسلامی تعلیمات کی تشریح۔

(ب) مذہب میں معترضین اسلام کے اعتراضات کے جوابات۔

(ج) اسلامی تاریخ سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ۔

(۳) خالص مذہبی مسائل کے علاوہ، ان معاشرتی مسائل پر بھی شبلی نظر رکھتے تھے جو مذہب سے قریبی علاقہ رکھتے ہیں۔

(۴) دعووں کی بنیاد تاریخی شہادتوں پر ہے۔ یہ شہادتیں مسلم اور غیر مسلم دونوں سے لی گئی ہیں۔

(۵) مضامین مختصر اور طرز استدلال منطقیانہ ہے۔

(۶) روایت پرستی کے خلاف ہیں۔ اور سر سید کی روشن خیالی کی تحریک میں اکثر اُن کے ہم نوا ہیں۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

مقالاتِ شبلی (جلد دوم)

ادبی

تبصرہ

شبلی کے مجموعۂ مقالات میں یہ دوسرا مجموعہ ہے جس میں دس مقالات ہیں۔ چار مضمون عربی زبان، فن بلاغت، نظم القرآن وجمہرۃ البلاغۃ، شعر العرب ہیں۔ ایک عربی، فارسی شاعری کے موازنہ پر۔ سرسید مرحوم اور اُردو لٹریچر، املا اور صحت الفاظ، اُردو ہندی، اردو ادب سے متعلق ہیں۔ بھاشا اور مسلمان، تحفۃ الہند (ہندی صنائع وبدائع) ہندی بھاشا پر ہیں۔

پہلا مضمون عربی زبان پر ہے۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عربی، سامی اور دنیا کی تمام زبانوں میں سب سے قدیم ہے۔ مضمون نہایت اہم ہے۔ خواجہ کمال الدین مرحوم نے اس موضوع پر ایک مستقل تصنیف "ام الالسنہ" لکھی ہے لیکن شبلی کا یہ مضمون یا تو نا تمام ہے یا نہایت نامکمل اور تشنہ، پوری بحث اور نتائج صرف ڈھائی صفحوں میں ختم ہو گئے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:-

"دنیا میں یوں تو سینکڑوں ہزاروں زبانیں مروج اور مستعمل ہیں لیکن سب کی اصل الاصول صرف تین زبانیں ہیں۔ ایک سامی جو سام بن نوح کی طرف منسوب ہے۔" [1]

دو اور زبانوں کا ذکر انھوں نے نہیں کیا ہے۔ اس سے قطع نظر یہ کہنا بھی درست نہیں کہ دنیا کی تمام زبانیں صرف تین زبانوں کی فروعات ہیں۔ لسانیات کے ماہرین نے دنیا کی زبانوں کو تین زبانوں نہیں تین خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور یہ تقسیم بہ اعتبار ساخت کے ہے۔ محققین نے اس مسئلہ میں جو موشگافیاں کی ہیں اُن کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ لیکن ذیل کے خاکے سے ان تینوں خاندانوں اور ان کی مختصر خصوصیات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

(حاشیہ: معلومات بہم پہنچائی اُصل)

۱؎ مقالاتِ شبلی: جلد دوم: ص ۱

www.urduchannel.in

یہ تقسیم اصوات و الفاظ کی نوعیت ترکیب پر مبنی ہے۔ مختلف خاندانوں میں زبان کی تقسیم تاریخی بنیاد پر ہے۔

زبان

اورنگ زیب قاسمی

۱۔ محلی — Positional

۲۔ تخلیطی — Agglutinative — Amalgamative

۳۔ ترکیبی — Inflectional — Amalgamative

پہلی قسم میں اشتقاق بالکل نہیں ہوتا۔ دوسری میں اشتقاق تو ہوتا ہے لیکن مادہ کی اصلی صورت پھر بھی باقی رہتی ہے۔ تیسری صورت میں اشتقاق ہو کر خود مادہ کی صورت تک بدل جاتی ہے۔ سامی اور آریائی دو بڑے خاندان اسی آخر الذکر کی زبانوں میں ہیں۔

شبلی کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ سامی کوئی خاص زبان ہے۔ دراصل یہ بھی زبانوں کے خاندانوں کا نام ہے۔ جس میں جیسا کہ خود شبلی نے لکھا ہے، عربی، سریانی اور عبرانی شامل ہیں۔ اسی طرح سامی زبانوں کی جو خصوصیات شبلی نے بتائی ہیں وہ دوسری زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً جرمنی زبان میں جو خالص آریائی زبان ہے مذکر اور مؤنث کے لئے ضمیریں جدا جدا نہیں یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ صرف سامی زبانوں میں ہی ضمیر اسم، فعل، حرف، تینوں کے ساتھ لاحق ہوتی ہے۔ کیونکہ حرف اور فعل کے ساتھ ضمیر، اردو کے قدیم اور پنجابی میں آج تک موجود ہیں۔

یہ میرا نہیں جانتا مقابلہ تقابلی ... زبان

عربی زبان کے قدیم ہونے کی پہلی دلیل شبلی نے یہ دی ہے کہ الفاظ کے جس قدر مادے سریانی اور عبرانی میں ہیں وہ عربی میں موجود ہیں اور عربی کے بعض مادے سریانی اور عبرانی میں نہیں۔ شبلی کے اپنے الفاظ یہ ہیں:-

> "اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی زبان اصل تھی۔ اسلئے تمام مادے اسمیں موجود تھے، عبرانی اور سریانی زبانیں چونکہ زمانۂ مابعد کی زبانیں تھیں اسلئے بہت سے مادے متروک ہو گئے۔" [۱]

ہو سکتا ہے کہ یہ مادے جو عربی میں ہیں بعد کا اضافہ ہوں۔ آج جرمنی زبان میں سنسکرت سے زیادہ مادے موجود ہیں لیکن جرمنی سنسکرت سے بہت بعد کی پیداوار ہے۔ انکے علاوہ تین اور دلیلیں ہیں جنہیں ایک

---

[۱] مقالات شبلی: جلد دوم: صد ۱-۲

www.urduchannel.in

حروف کے تبادلہ کے متعلق ہے ۔ لسانیات کے اصول کے مطابق بعض الفاظ ایک زبان سے دوسری زبان میں

اورنگ زیب قاسمی

جا کر آپس میں بدل جاتے ہیں ۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالا نہیں جا سکتا کہ کونسی زبان قدیم ہے ۔ شبلی نے (۶ ؟)

آخر میں خود تسلیم کر لیا ہے کہ عربی زبان تصنیف کی حیثیت سے سریانی اور عبرانی سے بہت نیچے ہے ۔

اگر یہ صحیح ہے کہ عربی زبان سریانی سے بہت پہلے پیدا ہوئی تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اسکی قدیم سے قدیم تصنیف صرف زمانۂ اسلام سے کچھ ہی پہلے ملتی ہے ۔

دوسرا مضمون فن بلاغت سے متعلق ہے ۔ اس میں دو بحثیں ہیں ۔ پہلی یہ کہ عربی کا فن بلاغت یونانیوں سے متأثر ہے یا نہیں ۔ دوسری یہ کہ اصول بلاغت کیا ہیں ۔ شبلی نے پہلا دعویٰ ان الفاظ میں کیا ہے " مسلمانوں کا فن بلاغت ارسطو کی کتاب سے چھو بھی نہیں گیا ہے " ۔ لیکن دعویٰ اور دلیل کو شامل کر کے پوری بحث صرف ، سطروں میں ختم کر دی گئی ہے ۔ اسکے بعد وہ حصہ فصاحت و بلاغت کی بحث میں ہے جو " موازنۂ انیس و دبیر " میں شامل ہے ۔ لیکن اس مضمون میں وہ بھی نامکمل ہے اس کا اندازہ ان مباحث سے ہو سکتا ہے ۔

فصاحت و بلاغت کی تعریف ، فصاحت کے مدارج ، معانی و الفاظ کی مناسبت ، کلام کی فصاحت ، ائتلاف الوزن مع المعنی ۔

ظاہر ہے کہ بلاغت کے موضوع پر عربی اور فارسی میں جو ذخیرہ تھا وہ یقیناً شبلی کی نظر سے گزرا ہوگا ۔ اسکے باوجود یہ مضمون بھی پہلے کی طرح تشنہ اور نامکمل ہے اور بعض مصنفین مثلاً عبدالقاہر الجرجانی کا نام لیا ہے لیکن عربوں کے اصول اور انکے آئین بلاغت کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے ۔

تیسرے مضمون میں مولانا حمید الدین کی کتاب 'نظم القرآن و جمہرۃ البلاغۃ' پر ایک مختصر نوٹ اور اسکا خلاصہ ہے ۔ چوتھے مضمون میں ابن رشیق کی کتاب العمدہ پر ریویو ہے ۔ جس میں اسکے مضامین کا خلاصہ بیان کیا ہے ۔ عربی میں یہ تینوں مضمون اس زور اور طنطنہ سے خالی ہیں جو انکے مذہبی یا تاریخی مقالات میں پایا جاتا ہے ۔

فارسی اور عربی شاعری کا موازنہ اچھا مضمون ہے ۔ عربی شاعری کی حسب ذیل خصوصیات بیان کی ہیں :—

(۱) رزمیہ شاعری میں پلّہ بھاری ہے (۲) آزادانہ خیالات کا اظہار ہے ۔

www.urduchannel.in

(۳) مفاخرت کا اظہار ہے   (۴) مناظر قدرت کا بیان ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

(۵) جذبات انسانی کی ترجمانی ہے۔   (۶) تشبیہات میں جدت ہے

فارسی کی ترجیحی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مثنوی موجود ہے جس سے عربی محروم ہے   (۲) فلسفہ ہے جو عربی میں کالعدم ہے

(۳) اخلاقی شاعری کی کثرت ہے   (۴) تصوف ہے۔

(۵) غزل کو خاص ترقی ہوئی۔   (۶) خیالات میں تنوع ہے

(۷) تشبیہات میں جدت ہے۔

مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر کی ماہیت پر شبلی کو پورا عبور تھا۔ اور شعر فہمی کا نہایت ستھرا مذاق رکھتے تھے۔

اردو ادب کے سلسلے میں پہلا مضمون سر سید مرحوم اور اردو لٹریچر ہے۔ سر سید نے اردو لٹریچر پر جو احسانات کئے ہیں اُن کی تفصیل ایک مضمون کیا، کئی ضخیم جلدوں میں بھی نہیں سما سکتی۔ شبلی نے سر سید کی وفات پر فوری مضمون لکھا ہے۔ اسلئے مختصر ہے لیکن سر سید کے تمام کمالات کے ساتھ ساتھ ان کے اس خاص احسان کا یہ کھلم کھلا اعتراف ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خود شبلی کی نظر میں جدید اردو ادب کے بانی سر سید احمد ہی تھے۔

"..... ۱۲۸۷ھ میں جس کو آج کم و بیش ستائیس ۲۷ برس ہوئے۔ سر سید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لئے تہذیب الاخلاق کا پرچہ نکالا۔ اور اردو انشاء پردازی کو اس رتبہ پر پہونچا دیا جس سے آگے اب ایک قدم بھی بڑھنا ممکن نہیں ....."[1]

اُردو ہندی کا قضیہ

اُردو ہندی کی کشمکش انیسویں صدی ہی میں شروع ہو گئی تھی، اس سلسلے میں پہلے یہ تجویز ہوئی کہ عدالتوں میں بجائے اُردو کے ہندی زبان اور بجائے فارسی کے ناگری رسم الخط اختیار کیا جائے۔ اس پر بڑی ہنگامہ آرائی ہوئی اور آخر کار اس تجویز کو کچھ دنوں کے لئے ملتوی کرنا پڑا۔ اسکے بعد یہ تحریک ہوئی کہ اردو اور ہندی کو اسطرح ایک دوسرے کے قریب لایا جائے کہ دونوں میں صرف رسم الخط کا فرق رہ جائے۔ ۱۹۱۲ء میں گورنمنٹ نے ایک ورناکیولر اسکیم کمیٹی بنائی جو اس مقصد کے حصول کے لئے ذرائع اور تدابیر پر غور کرے۔ مسٹر برن چیف سیکریٹری نے ایک اسکیم مرتب کی

۱؎ مقالات شبلی: جلد دوم : ص ۶۰

www.urduchannel.in

مولانا بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے خیالات قلمبند کئے جو انکے ادبی مقالات میں شامل ہیں۔
اورنگ زیب قاسمی

مخالفین کا دعویٰ یہ تھا کہ ہندی اور اُردو دونوں کی گرامر ایک ہے۔ اسلئے ان میں سوا رسم الخط کے فرق کے اور کوئی فرق نہیں۔ شبلی نے صحیح لکھا ہے کہ یہ خیال عام بول چال کی زبان کے لئے تو ٹھیک ہے لیکن ادبی ہندی میں سنسکرت سے اور ادبی اُردو میں عربی فارسی سے مدد لینا ناگزیر ہے۔ اور یہاں پہونچ کر اردو اور ہندی دونوں ایک دوسرے سے بہت دور جا پڑتی ہیں۔ اسلئے مناسب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں زبانوں کو علحدٰہ علحدٰہ ترقی کرنے کا موقع دیا جائے۔ مولانا کی یہ تحریر اگرچہ مختصر ہے لیکن ان کے ادبی مقالات کے مجموعے میں غالباً سب سے بہتر یہی ہے۔ یہ اپنی بحث میں مکمل ہے اور کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا ہے۔

ایک اور مضمون "بھاشا زبان اور مسلمان" میں اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ مسلمانوں نے ہندی زبان کی طرف بوجہ تعصب توجہ نہیں کی۔ شبلی نے مسعود سعد سلمان، خسرو سے لے کر مغلوں کے آخری دور تک کے اُن مسلمان شعراء کا ذکر کیا ہے جن کا ہندی کلام موجود ہے۔ اس مقالہ میں مولانا شبلی سے ایک سہو ہوا ہے۔ انھوں نے ہندی اور بھاشا کو مترادف سمجھا ہے۔ چنانچہ عواجی، لونی وغیرہ کا کلام ہندی کہلاتا ہے وہ دراصل اُردو ہے۔ کیونکہ ہندی اردو ہی کا ایک قدیم نام ہے۔ جسطرح ہندوی، ریختہ، زبان اردوئے معلّے، دکنی اور اُردو اسکے نام ہیں۔ بھاشا جسے اب ہم ہندی کہنے لگے ہیں بہت بعد کی پیداوار ہے۔ اور اس زمانے میں اس نام سے نہیں پکاری جاتی تھی۔

اس دعوے کی تکمیل شبلی نے "تحفۃ الہند" والے مضمون سے کی ہے، جس میں مرزا خان بن فخر الدین محمد کی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ جس کا موضوع ہندوؤں کا فن بلاغت اور عروض و قافیہ ہے۔ اس میں سے شبلی نے صنائع و بدائع کے حصہ کا خلاصہ بھی اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔ شبلی کے ادبی مضامین کے مطالعہ سے حسب ذیل نتائج مرتب ہوتے ہیں:۔

نتائج

(۱) ادبی مقالات کی تعداد بہت کم ہے۔

(۲) مقالات بالعموم ادھورے، نامکمل اور تشنہ ہیں۔

(۳) ان میں زور اور طنطنہ نہیں جو ان کے دوسرے مقالات میں ملتا ہے۔

(۴) شعر و شاعری میں عربی، فارسی، اردو اور بھاشا کی شاعری کے اچھے نمونے اور اسکے اُصول مولانا کی نظر میں تھے۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

(۵) ان مقالات کے تشنہ ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مولانا کے پیش نظر مستقل تصانیف تھیں، مثلاً فن بلاغت کا حصہ 'موازنہ' میں زیادہ تفصیل اور تشریح سے بعد میں لکھا گیا۔ شعر العرب ناتمام رہا لیکن شعر العجم مکمل ہو گئی۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

مقالاتِ شبلی (جلد سوم)

تعلیمی مقالات

شبلی نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز علی گڑھ میں کیا۔ علی گڑھ ایک تعلیمی تجربہ گاہ تھا۔ جہاں سرسید اپنے تصورات کی تشکیل کر رہے تھے۔ قدیم تعلیم کا دور گویا علی گڑھ کے قیام کے ساتھ ختم ہو گیا۔ کیونکہ زندگی کے نئے مطالبات کو پورا کرنے کی صلاحیت ان میں باقی نہ تھی۔ سرسید کے سامنے ابتدائی تعلیم سے لیکر یونیورسٹی کی تعلیم تک کے مسائل تھے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ مذہبی تعلیم کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ البتہ قدیم علوم میں سے بیشتر کو وہ موجودہ زمانے کے لئے بالکل بیکار سمجھتے تھے۔

اسی علی گڑھ کی فضا میں بعض اور لوگوں نے بھی تعلیمی مسائل پر غور و فکر کیا۔ شبلی بھی انہیں میں ہیں۔ اور جس طرح سرسید کے تصورات آج مسلم یونیورسٹی کی صورت میں موجود ہیں، شبلی کا نظریۂ تعلیم ندوہ اور دارالمصنفین کی صورت میں جلوہ گر ہے۔

شبلی کی تعلیم خود قدیم طرز کی تھی، علی گڑھ آنے سے پہلے وہ کٹر مذہبی آدمی تھے۔ یہاں آکر ان میں وسعتِ نظر پیدا ہوئی، لیکن تعلیم کے باب میں وہ سمجھتے تھے کہ علوم قدیمہ اور خصوصاً عربی زبان کا احیاء حیاتِ ملی کے لئے ضروری ہے۔ وہ جانتے تھے کہ علی گڑھ سب کچھ پیدا کر سکتا ہے لیکن علماء پیدا نہیں کر سکتا۔ اور بڑی حد تک انکے اندیشے صحیح ثابت ہوئے۔ اسلئے وہ ایسے علماء کی ایک جماعت پیدا کرنا چاہتے تھے جو ضروریات زمانہ سے باخبر اور مذہبی تعلیم سے پوری طرح واقف ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے عملی قدم اٹھانے سے پہلے مضمون اور مقالے لکھے۔ یہ مقالات مجموعہ میں جلد سوم میں ہیں۔

تبصرہ مقالات تعداد میں گیارہ ہیں۔ پہلے تین مضمون ایک طور پر پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ سب سے پہلے "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" والا مضمون ہے جو دراصل شبلی کی پہلی تصنیف ہے اور جسپر

www.urduchannel.in

شروع میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ تعلیمی موضوع پر یہ پہلا مضمون ہے جو شبلی کے قلم سے نکلا۔ لیکن اسکے مطالعہ سے صاف
اورنگ زیب قاسمی
معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ان کے سامنے خود کوئی واضح نصب العین نہیں تھا۔ یہ وہ البتہ جانتے تھے کہ تعلیمی ترقی کیلئے غیر زبانوں کی کتب کے تراجم کا جو سلسلہ سرسید اور ان کی سوسائٹی نے شروع کیا ہے اسکا کامیاب ہونا مشکل ہے۔

دوسرا مضمون تاریخی ہے اسکا عنوان "مدرسے اور دارالعلوم" ہے۔ اس میں ان تمام مدرسوں اور کالجوں کا ذکر ہے جو مسلمانوں نے قائم کئے۔ اگرچہ شبلی اوّلیت کا تعین نہیں کر سکے ہیں لیکن انھوں نے سب سے قدیم اس مدرسہ کا ذکر کیا ہے جو ۳۹۵ھ میں حاکم بامر اللہ فاطمی نے مصر میں قائم کیا تھا۔ اور بہت سی کتابیں اسکے لئے وقف کی تھیں اور فقہاء اور محدثین مقرر کئے تھے۔ اسکے بعد سلطان محمود غزنوی کے قائم کردہ مدرسوں کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علم پرور سلطان کے عہد میں غزنین علمی یادگاروں سے معمور ہو گیا۔ نیشاپور میں بڑے بڑے مدرسے اور کالج تھے۔ اسکے بعد دولت سلجوقیہ کے وزیر اعظم نظام الملک طوسی نے بغداد میں وہ عظیم الشان دارالعلوم قائم کیا۔ جو اسکی نسبت سے نظامیہ کہلاتا ہے۔ اگرچہ بغداد میں اس سے پہلے بھی مدارس تھے لیکن نظامیہ کی شہرت نے ان سب کو ماند کر دیا۔ نظامیہ کی تعمیر اور اس کا وسیع نظام مسلمانوں کا بڑا کارنامہ ہے اسلئے مولانا شبلی نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اسکے حالات لکھے ہیں اور حاشیہ میں ان کتابوں کی فہرست ہے جن سے نظامیہ کے مفصل حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔

نظامیہ کی تفصیل کے بعد بغداد کے بعض کالجوں کا ایک نقشہ ہے جس میں مدرسے اور بانی کے نام کے علاوہ ان کی مختصر کیفیت بھی درج ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومتوں میں علم کا کتنا چرچا تھا۔ اور سلاطین کے علاوہ امراء اور اہل دول بھی اس کار خیر میں حصہ لینے پر فخر کرتے تھے۔

دولت عباسیہ، دولت صلاحیہ، خاندان نوریہ، چرا کسہ، اسکندریہ اور قاہرہ کے مدرسے اور سب سے آخر میں ترکوں کے مدارس کا مفصل حال لکھا ہے۔ اس مضمون سے مسلمانوں کے عہد بہ عہد کی تعلیمی ترقی اور انکے تعلیمی نظام کا بہت صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے سلسلے میں مولانا نے بالکل صحیح اعتراف کیا ہے:۔

"ہندوستان کے تذکرے میں ہم کو بے خطر کہنا چاہئے کہ اس سرزمین پر شاید ایک بھی علمی عمارت قائم نہیں ہوئی۔"[1]

آگے چل کر مولانا نے جب ندوہ کی اسکیم تیار کی تو انھیں اس مواد اور تاریخی پس منظر سے

www.urduchannel.in

بڑی مدد ملی۔

اورنگ زیب قاسمی

قدیم تعلیم

مسلمانوں کے بنا کردہ مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد ان کے نصاب اور طریقۂ تعلیم پر بھی نظر ڈالنا ضروری تھا چنانچہ اس مقالہ کا موضوع یہی ہے۔

چونکہ دین کی تعلیم ہر مسلمان پر فرض ہے اسلئے تعلیم کا آغاز عہد رسالت ہی سے ہو گیا تھا۔ اور گو یہ تعلیم ابتداء میں مذہبی علوم اور اسکے متعلقات محدود رہی لیکن آگے چل کر جب یونانی، فارسی اور ہندوستانی علوم کے تراجم عربی میں ہوئے تو مسلمانوں کی تعلیم کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور انھوں نے نہ صرف دوسری قوموں کے علوم کو حاصل کیا اور اسکے ترجمے کئے بلکہ ان کو بڑی ترقی دی۔ اور بعض نئے علوم خود پیدا کئے۔ اور ہر علم و فن پر ہزاروں کتابیں لکھیں۔ جن کا اندازہ ابن ندیم کی فہرست کشف الظنون اور دوسری کتابوں سے ہو سکتا ہے۔

قدیم طرز تعلیم لیکچر کے طرز پر تھی جس کا رواج عربی مدارس میں اب بھی نہیں ہے۔ استاد تقریر کرتا جاتا تھا اور طلبہ اس کو قلم بند کرتے جاتے تھے۔ یا ضروری نوٹ لیتے جاتے تھے۔ یہ طریقہ یونانی ہے ممکن ہے مسلمانوں نے انہیں سے لیا ہو گو اس کا ثبوت نہیں ہے بلکہ شواہد اسکے خلاف ہیں۔ اسلئے کہ یہ طریقہ جسے عربی میں املا کہتے ہیں بنی امیہ کے زمانے بلکہ اس سے بھی پہلے سے جاری تھا۔ اور یونانی علوم و تعلیم وغیرہ سے مسلمان بنی عباس کے زمانہ سے واقف ہوئے۔ مسلمانوں میں حصول تعلیم کا جتنا ذوق تھا اسکی مثال دوسری قوموں میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ اکابر علماء و ائمہ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جسنے حصول تعلیم کے لئے ہزاروں میل کا سفر نہ کیا ہو۔ اور اس راہ میں زحمتیں نہ اٹھائی ہوں جسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اس زمانہ میں گو موجودہ دور کی طرح تعلیم و سفر کی سہولتیں میسر نہ تھیں اسکے باوجود تعلیم کا ذوق ایسا تھا کہ ہر فن میں بے شمار علماء و ائمہ پیدا ہوئے۔

مضمون کے بڑے حصہ میں تعلیم کی وسعت کے اسباب بیان کئے گئے ہیں مثلاً تعلیم، مذہب کا ضروری جزو بن گئی تھی۔ اسلئے وہ علوم جو قرآن و حدیث سے متعلق تھے اور عربی میں تھے ان کی تحصیل ہر عالم کے لئے ضروری تھی۔ تعلیم صرف مسجدوں کے حلقۂ درس اور علماء کی درسگاہوں میں مقید نہ تھی۔ بلکہ وزراء، حکام، [illegible] فوجی افسر اور اہل منصب کا گروہ تعلیم یافتہ اور بایہ شناس تھا۔ یہ تعلیم کا دوسرا دور تھا۔

اسکے بعد مدرسے قائم ہوئے اور رفتہ رفتہ تعلیم میں آزادی جاتی رہی۔ املا کا طریقہ اٹھ گیا

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

اور اکثر مدارس کسی نہ کسی ایک مذہب سے وابستہ ہو گئے، جس سے تقلید مذہبی کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں - اور ایسے علماء جو اجتہاد کی صلاحیتیں رکھتے ہوں پیدا ہونا بند ہو گئے - تعلیم کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ بعض علوم مثلاً منطق وغیرہ میں جو مقصود بالذات نہ تھے ایسی موشگافیاں ہونے لگیں کہ طلباء کی تمام عمر انہی میں صرف ہوتی تھی - پولیٹیکل تعلیم بالکل نہ تھی - نصاب تعلیم میں تاریخ کی کتابیں بھی صرف انشاء کے اعتبار سے پڑھائی جاتی تھیں -

مدرسوں کے حالات اگرچہ مولانا نے تفصیل سے لکھے ہیں لیکن نظام تعلیم کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کا ذکر تشنۂ تکمیل معلوم ہوتا ہے -

دو مضمون ملا نظام الدین سہالوی بانی درس نظامیہ (فرنگی محل لکھنؤ) اور درس نظامیہ پر ہیں - درس نظامیہ کی مسلمہ خوبی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ اسے عرصے تک ہندوستان کے باہر بھی عربی کی تکمیل کا نصاب قرار دیا جاتا رہا - یہ دونوں مضمون تاریخی ہیں - آخری مضمون میں کچھ تنقیدی رنگ بھی شامل ہے ایک اور مضمون جو اسی سلسلے کی کڑی ہے فن نحو کی مروجہ کتابوں سے متعلق ہے - اس میں کتابوں سے نہیں مسائل نحو سے بحث کی ہے - اور اسکی مروجہ کتابوں کے نقائص دکھائے ہیں - ندوہ کا پہلا تخیل "تعلیم قدیم وجدید" والے مضمون میں ملتا ہے - مولانا نے اسمیں پہلے پانچ سوال قائم کئے ہیں پھر انکا جواب دیا ہے -

(۱) جدید تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟ (۲) قدیم تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

(۳) دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے کہ نہیں! (۴) اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟

(۵) علی گڑھ اور دیوبند کے کیا حدود ہیں؟

پہلے دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں دیا ہے لیکن یہ دکھایا ہے کہ جدید تعلیم کے ساتھ مذہب بھی ضروری ہے جو بقول مولانا شبلی بغیر قدیم تعلیم کے ممکن نہیں - اصلاح کی دونوں میں ضرورت ہے - اس کا نتیجہ نکالتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں :-

"دونوں گروہ اب قوم کے ضروری اعضاء ہیں اسلئے دونوں کو آپس میں دست و بازو ہو کر کام کرنا چاہئے"

آخر میں ندوہ کا ذکر ہے کہ یہاں ایسے علماء پیدا کرنا مقصود ہیں جو جدید ضرورتوں کا احساس رکھتے ہوں اور اسکے موافق عربی تعلیم میں اصلاح و اضافہ کرنے کے لئے تیار ہوں -

نواں مقالہ مشرقی کانفرنس سے متعلق ہے جس میں دراصل ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو ندوہ کی تاسیس اور قیام پر کئے جاتے تھے -

www.urduchannel.in

آخری مضمون علوم عربیہ کے احیاء سے متعلق ہے ۔ اس مضمون کا محرک یہ ہے کہ کسی صاحب نے

اورنگ زیب قاسمی

ریڈیکل کے نام سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں عربی زبان اور ادب کے سرمایہ کو محض غیر ضروری قرار دیا تھا شبلی نے نہایت مختصر طور پر اس اعتراض کا جواب دیا ہے اور عربی زبان وادب کے احیاء کی ضرورت پیش کی ہے ۔

مقالات کا یہ مجموعہ نہایت اہم ہے اس سے شبلی کی تعلیمی دلچسپی اور قومی ضروریات کے احساس کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض مقلد نہ تھے بلکہ قومی مسائل کے متعلق اپنی مستقل ذاتی رائے رکھتے تھے اور وہ علی گڑھ میں رہ کر جو جدید تعلیم کا مرکز اور محور تھا بالکل مرعوب نہ ہوئے ۔ اور قدیم تعلیم کی اہمیت اور اسکی ضرورت نہ صرف خود محسوس کرتے رہے بلکہ دوسروں سے اسکو منوالیا ۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

مقالات شبلی (جلد چہارم)

تنقیدی

فن تنقید میں شبلی کا کارنامہ "شعر العجم" اور "موازنہ" ہیں لیکن یہ دونوں شعر و شاعری سے متعلق ہیں۔ صرف ان سے یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ اور فنون پر اصول تنقید سے وہ کہاں تک واقف تھے، مقالات نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ (؟)

تبصرہ

یہ مضامین جنکی تعداد ۱۷ ہے دو سو صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک کے سوا باقی کل عربی و فارسی کی ان قدیم اور نادر کتابوں پر ہیں جنھیں یورپ کے علماء نے تلاش کرکے بڑی تحقیق و محنت کے ساتھ تصحیح و تحشیہ کرکے شائع کیا ہے۔ انمیں زیادہ تعداد تاریخی کتابوں کی ہے جو غالباً شبلی کے ذاتی ذوق کا نتیجہ ہے۔

پہلی کتاب طبقات ابن سعد ہے جو بارہ ضخیم جلدوں میں ہے۔ یہ کتاب تیسری صدی کے ایک بڑے محدث ابن سعد کی تالیف ہے۔ گو طبقات میں اور بہت سی مستند کتابیں ہیں لیکن قدامت، استناد، اور جامعیت کے اعتبار سے کوئی کتاب ابن سعد کے درجہ کی نہیں ہے۔ وہ بعد کی تمام کتابوں کا ماخذ ہے۔ ابتداء میں اس کا مکمل نسخہ نایاب تھا۔ شبلی نے بھی قسطنطنیہ اور مصر کے کتب خانوں میں اسکے نامکمل نسخے دیکھے تھے۔ جرمنی کے پروفیسر ساخو[†] نے جرمن حکومت کی اعانت سے مصر اور یورپ کے تمام کتب خانوں کو چھان کر اسکے نسخے فراہم کئے۔ اور بڑی محنت اور تصحیح اور مقابلہ کے بعد ایک جلد شائع کی۔ اس جلد میں ان صحابہؓ کے حالات ہیں جو جنگ بدر میں شریک تھے۔ شبلی کے زمانے میں غالباً صرف یہی جلد شائع ہوئی تھی۔ لیکن اب سب جلدیں شائع ہو گئی ہیں۔

(سخاؤ) ۲

دوسری تنقید ابن جوزی کی "مناقب عمر بن عبد العزیز" پر ہے۔ شبلی نے اس کا نسخہ کتب خانہ خدیو مصر میں دیکھا تھا۔ لیکن اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکے تھے۔ ہندوستان میں اس کا کوئی نسخہ موجود نہ تھا۔

† اس نام کو مولانا شبلی نے "زخاؤ" بھی لکھا ہے (مقالاتؒ ج ۶، ص ۱۰۵) تلفظ کے لحاظ سے "زخاؤ" درست ہے لیکن کتابت "سخاؤ" (Sachau) ہے۔ جرمانی زبان میں ~~[illegible]~~ ابتدائے کلمہ میں S کا تلفظ بجائے س کے ز کیا جاتا ہے

www.urduchannel.in

کتاب دراصل سیرۃ عمرین کے نام سے ہے۔ جس میں حضرت عمر فاروق رضؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ دونوں کے حالات

اورنگ زیب قاسمی

ہیں۔ پہلے حصہ سے شبلی نے "الفاروق" میں استفادہ کیا ہے۔ دوسرے حصہ کو سلطان صلاح الدین کے عہد کے ایک عرب سپہ سالار اسامہ بن منقذ نے ابن جوزی کی کتاب کے دوسرے حصے کو علیحدہ کتاب کی صورت میں مرتب کیا۔ اسی کو ہنری بیکر نے ۱۹۰۰ء میں چھاپ کر شائع کیا۔ گو یہ کتاب موجودہ فن سوانح نگاری کے اعتبار سے ناقص ہے لیکن حضرت عمرؓ اور عمر بن عبدالعزیز سے متعلق اس میں نہایت مفید معلومات ہیں۔ شبلی نے اپنے مضمون میں بعض مضامین کا ذکر کیا ہے جس سے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سیرۃ کا دھندلا سا تصور نگاہ کے سامنے آجاتا ہے۔ شبلی نے اس کی بھی صراحت کر دی ہے کہ کتاب میں صحیح اور مستند واقعات کے ساتھ ساتھ بعض لغو اور دوراز کار قصے بھی نقل کر دئے ہیں۔ اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اخلاق وعادات اور عدل وانصاف سے متعلق واقعات کا ذکر ہے۔

تیسری تنقید یا تبصرہ ایک قدیم اور نایاب کتاب بلاغات النساء: احمد بن ابی طاہر بغدادی پر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں مسلمان خواتین کتنی تعلیم یافتہ تھیں اور بڑے بڑے موقعوں میں ان کی پرجوش تقریریں کیا کام کرتی تھیں۔ اسکے مندرجہ خطبات میں سے بعض کے متعلق شبلی کا خیال ہے کہ وہ فرضی ہیں۔ تبصرہ مختصر ہے

اسکے علاوہ عمر خیام کے جبر و مقابلہ، ابن مسکویہ کی تجارب الامم اور لغت الفرس، کتاب الملل والنحل ابن حزم، تفسیر کبیر امام رازی، کتاب الکافی فی النحو، ہمایوں نامہ، مآثر رحیمی، النظر فی اسفر الی الموتمر، تلقیح الاخبار اور ہومر کے ایلیڈ کے عربی ترجمے پر مختصر تبصرے ہیں۔

پوری جلد میں سب سے اہم مقالہ جرجی زیدان کے تمدن اسلام پر تنقید ہے۔ یہ کتاب مصنف نے بظاہر مسلمانوں کے علمی وتمدنی کارناموں کی تعریف میں لکھی ہے لیکن درپردہ جابجا زہر بھی چھڑکا گیا ہے۔ جس سے مسلمانوں کے متعلق مجموعی اثر اچھا نہیں پڑتا۔ مصنف کا مقصد مسلمانوں اور خاصکر عربوں کی تحقیر تھی۔ اسکے لئے اسنے جابجا بنی امیہ کی جانب جنکی حکومت خالص عربی تھی ایسے غلط واقعات منسوب کر دئے ہیں یا واقعات کو مسخ کر دیا ہے جس سے عربوں کے متعلق بہت بری رائے قائم ہوتی ہے اور اس تعصب کو چھپانے کے لئے بنی عباس کی تعریف کی ہے اسلئے کہ گو وہ بھی عرب تھے لیکن انکا تمدن اور انکی سیاست بالکل عجمی تھی اور اسکے کارپرداز سب عجمی تھے۔ علامہ شبلی نے جرجی زیدان کے اس فریب کا پردہ پوری طرح چاک کیا ہے۔ اور تاریخی شواہد سے اسکی بددیانتی کو ظاہر کیا ہے چونکہ جرجی زیدان کی اصل کتاب عربی میں تھی اسلئے علامہ شبلی نے عربی میں بھی یہ تنقید شائع کی تھی۔ جس کو عربی دنیا

www.urduchannel.in

نے بڑی پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

اس مجموعہ میں اُردو کی بھی ایک کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" پر تبصرہ ہے جسے ظفر علی خاں نے ترجمہ کیا ہے۔ اصل کتاب کے مصنف ڈاکٹر ڈریپر (Dr. Drapper) ہیں جو امریکہ کے مشہور عالم اور نیویارک یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ شبلی نے ترجمے کی تعریف کی ہے کہ کسی علمی کتاب کا صحیح ترجمہ اس سے زیادہ صاف اور قریب الفہم نہیں ہو سکتا۔ اور اصطلاحات کے بعض ترجموں کی بھی تعریف کی ہے۔ لیکن بعض سخیف محاوروں کے استعمال پر اعتراض ہے۔ کتاب کا موضوع گو مطلق "معرکہ مذہب و سائنس" ہے لیکن بحث میں صرف عیسائی مذہب اور سائنس کا معرکہ دکھایا ہے جسنے علم پر بڑی زیادتیاں کیں اور آخر میں سائنس کے مقابلہ میں شکست کھائی ہے۔ اسلام نے حکمت و فلسفہ کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا اسلئے اسلام کے متعلق مصنف کے بعض بیانات صحیح بھی ہیں۔ ڈریپر صاحب (Drapper) متعصب نہیں ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کی علمی ایجادات اور انکشاف کا ذکر تفصیل سے کیا ہے لیکن اسلام کو وہ بحیرہ راہب کا فیض بتاتے ہیں جو سراسر غلط ہے۔ بحیرا راہب سے آنحضرت صلعم کے دینی استفادہ پر اتنی کچھ بحث ہو چکی ہے کہ اب اس پر کسی مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ یہ واقعہ سراسر مہمل ہے۔ مصنف کی جن مقامات پر اسلام کے خلاف اس قسم کی باتیں تھیں اسکا جواب مترجم نے فٹ نوٹ میں دیدیا ہے۔ اور بقول شبلی ایسے موقعوں پر وہ مترجم نہیں اچھے خاصے تند مزاج مولوی معلوم ہوتے ہیں۔

مجموعی حیثیت سے کتابوں پر یہ تنقیدیں کچھ مختصر سی ہیں۔ اسکی وجہ شاید یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں تنقید کا فن بہت ترقی کر گیا ہے اس لئے یہ تنقیدیں مختصر معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم ان سے شبلی کی ناقدانہ نظر، وسعت مطالعہ اور موضوع پر کامل عبور کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ایسے مضامین میں جو تاریخ اسلام سے متعلق ہیں اور جن میں معترضین یورپ کے اعتراضات یا اُنکے جوابات کا سلسلہ ہے۔ ان کے قلم نے زیادہ جولانیاں دکھائی ہیں۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

مقالاتِ شبلی (جلد پنجم)

تاریخی جلد اول

تبصرہ

مقالات کی پانچویں جلد تاریخی مقالات پر مشتمل ہے۔ اسمیں اکابر اسلام کی سوانح حیات سے متعلق نو مضامین ہیں۔ پہلا مضمون حضرت اسماءؓ کے متعلق ہے۔ مقالہ کی تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ انکے پیش نظر ایک سلسلۂ مضامین تھا جسکے لئے ذریعہ غیر عربی داں بزرگان اسلام کے حالات سے واقف ہو جائیں۔ سلسلے کا یہ پہلا مضمون ہے۔ جسمیں اخلاق عرب کے عنوان سے عورتوں کا استقلال و ثبات، دلیری اور آزادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے موثر حضرت اسماءؓ کے حالات ہیں۔ جنہوں نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو خوشی سے حق کی خاطر شہادت حاصل کرنے کے لئے بھیجدیا۔ مضمون نہایت مختصر ہے اور ۳½ صفحوں میں ختم ہو گیا ہے۔

دوسرا مضمون البتہ نسبتاً طویل ہے۔ اسکا عنوان "المعتزلہ والاعتزال"[1] ہے۔ اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کے پیش نظر مضامین کا ایک سلسلہ تھا جسے وہ "تہذیب الاخلاق" کے لئے لکھنا چاہتے تھے۔ اس مقالہ میں اعتزال کی اجمالی تاریخ پیش کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی اختلافات خود صحابہ کرامؓ کے زمانے میں پیدا ہو گئے تھے اور عقائد میں بحث کا آغاز ہو گیا تھا۔ صحابہ میں بعض ایسے بزرگ تھے جو ہر بات کو عقل کے معیار سے جانچتے تھے۔ یا کم از کم عقل کو معاملاتِ شرعیہ میں بیکار نہیں سمجھتے تھے۔ شبلی کے بقول یہی اعتزال کی بنیاد تھی۔

اعتزال کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان جو برائیاں کرتا ہے خدا نہیں کرتا۔ اس عقیدے کو سب سے پہلے معبد جہنی نے رواج دیا۔ جسے حجاج نے سنہ ۸۰ھ میں قتل کر ڈالا۔ معبد کے بعد غیلان دمشقی نے بھی اسکی اشاعت میں حصہ لیا۔ لیکن ہشام بن عبدالملک نے اسے بھی پھانسی دیدی۔ عمرو بن عبید اور واصل بن عطا یہ جو حسن بصریؒ کے شاگرد تھے، اعتزال کے اماموں میں شمار ہوتے ہیں۔ واصل کو علم کلام کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ ملحدوں کا رد سب سے پہلے انہی نے کیا۔ عمرو بن عبید اس پایہ کا آدمی تھا کہ خود خلیفۂ وقت نے اس کا مرثیہ لکھا۔

[1] محمد امین زبیری نے ذکر شبلی میں بتایا ہے کہ یہ مضمون "عبدالرحمن سیم" کا ہے [illegible] دیانتداری کا خون کرنا ہے۔ مضمون مذکور مولانا شبلی نے اس [illegible] شبلی مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ میں موجود ہے جو شبلی اور عبدالرحمن سیم کی [illegible] دونوں کی حیات میں چھپا۔ البتہ سیم نے [illegible] مقالات شبلی [illegible]

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

دولت عباسیہ کے دوسرے فرمانروا منصور نے اگرچہ خود یہ مذہب قبول نہیں کیا لیکن اسکے دور میں مذہب اعتزال کو بڑی ترقی ہوئی۔ اور فلسفہ کے جو اعتراضات مذہب پر وارد ہونا شروع ہوئے تھے ان کا جواب سوائے معتزلہ کے اور کوئی نہ دے سکا۔ مامون نے خود یہ مذہب قبول کر لیا۔ اسکے بعد معتصم اور واثق دونوں معتزلی ہوئے۔ اسکے بعد مذہب برابر ترقی کرتا رہا۔ اس مذہب کا سب سے بڑا آخر امام ابو علی جبائی کہا جاتا ہے جسنے ۳۰۲ھ میں وفات پائی۔ امام ابو الحسن اشعری پہلے معتزلی تھے بعد میں سنی اور شافعی ہو گئے۔ اور اعتزال کے رد میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ انکے مذہب کی تائید امام غزالی نے کی اور رفتہ رفتہ اشعری فرقہ زیادہ ترقی کر گیا۔ اور اعتزال تقریباً ناپید ہو گیا۔

تیسرا مقالہ ابن رشد پر ہے جو اندلس کا مشہور امام فلسفہ تھا۔ اصول فقہ، طب، فلسفہ و کلام وغیرہ جملہ علوم میں امامت کا درجہ رکھتا تھا۔ یورپ میں یونانیوں کا فلسفہ سب سے زیادہ اسی کی کتابوں کے ذریعے پھیلا۔ وہاں کے فلاسفہ کی ایک بڑی جماعت ابن رشد کی حامی تھی۔ اور ابن رشد کا فلسفہ یورپ کی بہت سی یونیورسٹیوں میں رائج تھا۔ مقالہ میں ابن رشد کے مختصر حالات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ حالات اسلامی تصانیف میں کم ملتے ہیں کیونکہ جتنا اعتنا ابن رشد کے ساتھ یورپ نے کیا وہ خود مسلمانوں نے نہیں کیا۔ موسیو رنیان نے ابن رشد کے یہودی شاگردوں کی تحریروں سے ابن رشد کی نہایت مفصل سوانح عمری لکھی۔ اور اسکے فلسفہ پر تفصیلی بحث کی۔ شبلی نے ابن رشد سے پہلے اسپین کی علمی حالت اور ابن رشد کی فلسفیانہ تعلیم کا ذکر کیا ہے اسکے بعد دربار سے اسکے تعلقات، عہدۂ قضاء پر اسکے تقرر کا ذکر اور فلسفہ کی بدولت ابن رشد کو جن پریشانیوں میں گرفتار ہونا پڑا اسکی تفصیل ہے۔ مرنے سے چند دن پہلے تک وہ فلسفہ کے جرم میں قید تھا۔ شبلی نے ابن رشد کی تصانیف کی جو فہرست دی ہے انسے معلوم ہوتا ہے کہ عبرانی اور لاطینی زبان میں ابن رشد کا مکمل کارنامہ محفوظ ہے۔ فلسفے میں اسکی مستقل کتابیں کم ہیں۔ زیادہ تر ارسطو کی تصانیف کی شرح یا اُن کا خلاصہ ہیں۔ یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے کہ یہ تمام تصانیف اسنے کثیر الاشغالی اور پریشانی کے عالم میں لکھیں۔ یورپ میں فلسفہ ابن رشد کی اشاعت اور اسکی ترقی کے متعلق شبلی نے رنیان کے مضمون سے استفادہ کیا ہے۔ ابن رشد کی تصنیفات اور اجتہادات پر ریویو کسی دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھا گیا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ کا مضمون مجددین اسلام کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ شبلی نے مجددین کے لئے تین شرطیں ضروری قرار دی ہیں:-

www.urduchannel.in

(۱) مذہب، یا علم، یا سیاست میں کوئی مفید انقلاب پیدا کرے۔

اورنگ زیب قاسمی

(۲) جو خیال اسکے دل میں آیا ہو کسی کی تقلید سے نہ آیا ہو بلکہ اجتہاد ہو۔

(۳) جسمانی مصیبتیں اٹھائی ہوں، جان پر کھیلا ہو، سرفروشی کی ہو۔

اس اعتبار سے شبلی کے نزدیک صرف علامہ ابن تیمیہ کی ذات ایسی ہے جو اس منصب کی مستحق ہے۔ یوں تو امام ابو حنیفہ، امام غزالی، امام رازی اور شاہ ولی اللہ بڑے پائے کے ائمہ تھے لیکن یہ تینوں خصوصیتیں صرف ابن تیمیہ میں پائی جاتی ہیں۔ اس مضمون سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری تک عورتوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور وہ پبلک زندگی میں حصہ لیتی تھیں۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ کا اصلی نام احمد ہے اور لقب تقی الدین تیمیہ ان کی والدہ کا نام تھا، جنکی نسبت سے ابن تیمیہ کہلائے۔ والدہ کی قابلیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ مستقل وعظ کہا کرتی تھیں۔ علامہ موصوف ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور تقریباً دو سو اساتذہ سے استفادہ کیا۔ لیکن باوجود انتہائی علم و فضل کے انہوں نے اپنی ساری زندگی مصیبت میں گزاری۔ وہ اشعری عقائد کے مخالف تھے۔ کئی مرتبہ قید کئے گئے۔ اور قید میں بھی تالیف و تصنیف کرتے رہے۔ آخری زمانے میں یہ سزا دی گئی کہ لکھنے پڑھنے کا تمام سامان قید خانہ سے ہٹا لیا گیا۔ جو امام کے لئے سب سے زیادہ سخت تھی۔ علامہ نے آخری تحریر کوئلے سے قید خانے کی دیوار پر لکھی تھی کہ مجھکو کوئی اگر اصلی سزا دی گئی ہے تو وہ یہی ہے۔ اسی قید خانے میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ مضمون طبقات ابن رجب اور فوات الوفیات سے ماخوذ ہے۔

متنبّی متنبّی اخلاق عرب کے سلسلے کا دوسرا نمبر ہے۔ اس میں مشہور شاعر احمد المعروف بہ متنبّی کے حالات ہیں۔ وہ چوتھی صدی ہجری میں کوفہ میں پیدا ہوا۔ اس زمانے میں شعرائے عرب کے پرانے اوصاف و خصوصیات مٹ گئے تھے۔ لیکن متنبّی کی تربیت بدوؤں میں ہوئی۔ اسلئے بلند ہمتی، عزم و استقلال اور شریفانہ اخلاق اس میں نظر آتے ہیں۔ وہ فطرۃً شاعر تھا۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ اُسنے قرآن کا جواب بھی لکھا تھا لیکن شبلی اس کی عربی کو مبتذل قرار دیتے ہیں۔ البتہ مسلّم ہے کہ اسنے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور قبیلۂ بنی کلب وغیرہ کے بعض لوگ اسکے مرید بھی ہو گئے تھے، لیکن امیر لؤلؤ نے اسے قید کر دیا جسکے بعد اسنے توبہ کی اور قید خانے سے نجات پائی اور اسکے بعد شاعری کو پیشہ قرار دیا۔ عرب فرمانروا سیف الدولہ والی حلب کا دربار شعراء کا ملجا و ماوی تھا متنبّی بھی حلب پہونچا۔ پھر کافور فرمانروائے مصر سے وابستہ ہو گیا۔ لیکن وہاں سے بھی چلا آیا۔ آخر میں والی شیراز کے دربار میں پہنچا۔ اسنے متنبّی کی بڑی قدر کی۔ لیکن متنبّی کا دل وہاں سے بھی اچاٹ ہو گیا۔ اور کوفہ کے لئے روانہ ہوا۔

www.urduchannel.in

راستہ میں بدّوؤں کے ایک قبیلہ نے دولت لوٹنے کے لئے چھاپا مارا۔ متنبّی نے بہادری سے مقابلہ کیا۔ اور وہ، اسکا بیٹا اور غلام اس مقابلہ میں کام آگئے۔ اگرچہ شبلی نے مقالہ کی تمہید میں لکھا ہے کہ وہ اسکے کلام پر بھی تنقید کرینگے لیکن کلام کی تنقید نہ ہونے کے برابر ہے۔

دوسرا مقالہ جس کا عنوان "موبدانِ مجوس" ہے زیادہ تر، بلکہ شبلی کے الفاظ میں قریباً کل 'دبستان مذاہب' سے لیا گیا ہے۔ جسمیں دوسرے مذاہب کے ساتھ پارسیوں کے پیشوایان مذہبی کا بھی مختصر حال لکھا ہے۔ اس میں صرف سلطنت تیمور کے دور کے حالات ہیں اور صرف چند نام گنانے پر اکتفا کی ہے۔ حالانکہ پارسی آغاز اسلام میں ایران سے بھاگ کر ہندوستان آگئے تھے، اور تلاش کرنے پر انکے حالات آسانی سے دستیاب ہو سکتے تھے،

اگلا مضمون زیب النساء پر ہے۔ جسمیں مآثر الامراء، مآثر عالمگیری، تذکرہ سرو آزاد، تذکرہ ید بیضا، تذکرہ مجمع الغرائب، خزانۂ عامرہ اور عالمگیر نامہ سے زیب النساء کے حالات و واقعات اخذ کرکے صحت اور ترتیب کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اسکی ولادت اور تعلیم، کمالات علمی اور عام عادات و اخلاق، علم اور شعراء پروری تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ آخر میں زیب النساء کے متعلق دو جھوٹے قصوں کی جو عاقل خاں اور ناصر علی سے متعلق ہیں تردید کی ہے۔

دوسرا مضمون مولوی غلام علی آزاد بلگرامی پر ہے جو بارھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے بڑے نامور فضلا میں تھے۔ اس مضمون میں اسکو خاص طور سے دکھایا گیا ہے کہ ان کی تصانیف ہندوستان میں اپنی قسم کی پہلی ہیں۔ طبقات و رجال یعنی تذکروں میں مسلمانوں کی بکثرت تصانیف ہیں لیکن ہندوستان کے علماء اور ارباب فضل و کمال حال سب سے پہلے انہی نے لکھا۔ ان کی تصانیف میں سرو آزاد، ید بیضا، مآثر الکرام، خزانۂ عامرہ، اور روضۃ الاولیاء تذکرے ہیں۔ عربی میں کئی دیوان ہیں۔ ایک فارسی دیوان بھی ہے۔ ان کی شرح بخاری، کے قلمی نسخے بھی جا بجا ملتے ہیں۔ وہ ہندی سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ شبلی نے ان تصانیف پر نہایت مختصر تبصرہ کیا ہے اور آخر میں آزاد کے معاصرین اور ان کی علمی صحبتوں کا ذکر ہے۔

اس جلد کا آخری مضمون جو صرف ۲½ صفحوں کا ہے "فرید وجدی بک" پر ہے جنہوں نے جدید فلسفہ اور اسلام کی تطبیق پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ شبلی نے یہ حالات عربی رسالے "مجلۃ المجلات" المصریۃ سے لئے ہیں۔ اسمیں اسکے نہایت مختصر حالات اور اسکی تصانیف کی مختصر فہرست دی ہے۔

مقالات کی یہ جلد اگرچہ تاریخی ہے لیکن یہ اتنے اہم نہیں جتنے وہ مضامین جو تاریخی مقالات

www.urduchannel.in

کی دوسری جلد میں ہیں۔ اس جلد کے بیشتر مضامین دوسروں کی تصانیف سے ماخوذ ہیں جس کا اعتراف شبلی نے حاشیوں میں کیا ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

اور جدید تعلیم کے علمبرداروں میں بڑی کشمکش پیدا ہو گئی ۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے لیکن پھر زمانے کے حالات نے خود علماء کی جماعت میں تعلیم جدید کے بعض حامی پیدا کر دئے ۔ انہیں ایک شبلی بھی تھے ۔ گو وہ بعض امور میں سرسید سے اختلاف رکھتے تھے لیکن اسکے باوجود مسلمانوں کے لئے وہ جدید تعلیم ضروری سمجھتے تھے ۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"مسلمانوں کو آجکل غیر قوموں سے جو اجتناب ہے اور جسکی وجہ سے وہ دنیا کے تمام مفید علوم وفنون سے محروم ہیں اسکے لحاظ سے حقیقت میں مشکل سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کسی زمانے میں غیر زبانوں سے کچھ فائدہ اٹھایا ہوگا ۔ لیکن واقعہ یہ ہے اور اس سے کوئی شخص انکار بھی نہیں کر سکتا کہ عہد وسطیٰ میں مسلمانوں نے دنیا کی تمام قوموں کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا اور اگر دنیا میں مسلمانوں کا قدم نہ آتا تو یونان، مصر، ہند، فارس کے تمام علمی ذخیرے برباد ہو گئے ہوتے ۔" [۱]

تبصرہ اس سلسلے میں شبلی نے پہلا مضمون جو دراصل تصنیفی زندگی کا آغاز ہے "مسلمانوں کی گزشتہ" کے عنوان سے لکھا ۔ اسپر ہم مفصل اظہار خیال کر چکے ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم علم و فن کے معاملہ میں مسلمانوں پر قومی تعصب کا الزام نہیں لگایا جا سکتا ۔ باوجودیکہ غیر قوموں کے علوم وفنون سے مسلمانوں کے عقائد و خیالات پر برے اثرات پڑنے کا خطرہ تھا اور کسی حد تک یہ صورت پیش بھی آئی ۔ لیکن اسکے باوجود انھوں نے یونانی علوم کی وہ کتابیں جو آجتک فلاسفہ کی بحثوں کا ماخذ ہیں نہایت کوشش اور محنت سے خود بھی عربی میں ترجمہ کیا اور غیر قوموں سے بھی ترجمے کرائے ۔ اور دونوں کی پوری قدردانی کی ۔ "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" میں اس موضوع پر اختصار سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن پیش نظر مقالے میں اسکی پوری تفصیل ہے اور ۱۱۲ صفحات پر یہ مضمون مشتمل ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علوم وفنون سے قطع نظر خود رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کے عہد میں مسلمانوں نے غیر قوموں کی مفید چیزوں کو بے تکلف قبول کیا ۔ جنگ احزاب میں حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے اہل ایران کے طریقے کے مطابق خندقیں کھودی گئیں ۔ یہ پہلا دن تھا کہ عربوں کے فنون حرب میں یہ چیز داخل ہوئی ۔ اور اس عہد سے لفظ خندق عربی لغت میں داخل ہوا ۔ اسیطرح طائف کے محاصرہ میں منجنیق کا استعمال ہوا ۔ زمینوں پر جو جزیہ لگایا گیا تھا اسکے متعلق تحقیقات سے ثابت ہے کہ قباد اور اسکے بیٹے نوشیرواں نے ایران میں جن اصولوں پر ٹیکس لگایا تھا وہی مسلمانوں نے ملحوظ رکھے ہیں ۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں زید بن ثابت نے خود رسول اللہ صلعم کے حکم

---

[۱] مقالات شبلی : جلد ششم : ص۲ : مطبوعہ معارف ۱۹۳۲ء

www.urduchannel.in

سے ترجمہ ہوئیں۔ کتابوں کے تلفظ زیادہ تر مبہم اور غیر واضح ہیں اسلئے شبلی چند نام گنانے پر اکتفا کی ہے۔ اورنگ زیب قاسمی

اس مقالہ سے مسلمانوں کے علمی ذوق و شوق کے علاوہ اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قیام حکومت کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دنیا کے تقریباً تمام علوم و فنون پر احاطہ کر لیا تھا۔ یہ موضوع اور زیادہ مکمل ہو جاتا اگر ایسے ہی ایک اور مفصل مقالے میں یہ دکھایا جاتا کہ مسلمانوں نے خود زمانۂ قدیم میں ان علوم و فنون پر کیا اضافہ کیا۔

کتب خانۂ اسکندریہ

کتب خانۂ اسکندریہ کا مضمون مولانا کے معرکۃ الآرا مقالات میں ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ عرصہ سے اہل یورپ مسلمانوں پر یہ الزام لگاتے چلے آتے تھے کہ مصر کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کا کتب خانہ جو شاہان مصر نے قائم کیا تھا، جلا دیا گیا۔ یہ الزام یورپ کی لکھی ہوئی تاریخوں میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اور مشہور مورخ گبن سے پہلے کسی کو اسکی تحقیق کا خیال تک نہیں آیا۔ منجملہ اور الزامات کے جو یورپ کے متعصب مورخین نے مسلمانوں کے خلاف تراشے میں ایک یہ بھی ہے۔ جس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ مسلمان وحشی اور علم و فن کے دشمن تھے۔ شبلی نے اس مضمون کا تار و پود بکھیر دیا۔ اور خود مخالفین کی تصانیف سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ واقعہ سرتا سر غلط ہے۔ اور مسلمانوں کے مصر کے حملے کے وقت کتب خانۂ اسکندریہ کا وجود ہی نہ تھا۔ اور اس سے صدیوں پہلے جل چکا تھا۔ کتب خانۂ اسکندریہ دراصل بادشاہان مصر نے قائم کیا تھا جو بت پرست تھے۔ فرانس کے مشہور عالم موسیو رینان نے اسکی تردید کی ہے کہ کتب خانہ مسلمانوں کے ہاتھوں برباد ہوا۔ ڈریپر لکھتے ہیں کہ جولیس سیزر نے کتب خانۂ اسکندریہ کی نصف سے زیادہ کتابیں جلا دی تھیں۔ اسکے بعد اسکندریہ کے بطریقوں نے باقی کتابوں کو اپنی نگرانی کو تباہ کرایا۔ ایک اور مصنف اورسیس لکھتا ہے کہ "اس واقعہ کے پچاس سال کے بعد تھیوفلس نے شاہنشاہ تھیوڈوسس سے تحریری اجازت کتب خانہ مذکور کی حاصل کی تھی۔ اور میں نے اسکی المارئیاں اور خانے خالی دیکھے"۔ اس لئے اس واقعہ کے پانچسو سال بعد تک کسی نے مسلمانوں پر یہ الزام نہیں لگایا۔ یہانتک کہ سب سے پہلے ابو الفرج نے جو ایک یہودی طبیب کا بیٹا تھا اور عیسائی ہو گیا تھا، یعنی مسلمانوں کا دو آتشہ دشمن تھا، سریانی میں ایک تاریخ لکھی اور اس کا ایک خلاصہ عربی زبان میں کیا اور اسی خلاصہ میں اس الزام کو مسلمانوں کے سر تھوپا۔ لیکن گبن اس بنا پر کہ ابو الفرج اس واقعہ کے ۶۰۰ سال بعد پیدا ہوا اور اس دوران میں عیسائی مورخ نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا، اس واقعہ کو لغو قرار دیتا ہے۔ اس سلسلے میں تین مسلمان مصنفین کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ جنھوں نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ عبد اللطیف، مقریزی، اور حاجی خلیفہ، مقریزی کا یہ

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

حال ہے کہ اسنے عبداللطیف ہی کا بیان نقل کیا ہے اس کا کوئی بیان نہیں۔ پھر حاجی خلیفہ کا بیان یہ ہے :۔

”اہل عرب شروع اسلام میں تمام علوم سے بجز لغت و احکام شریعت، و طب کے کسی علم کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے ۔ صرف یہ علوم بوجہ عام حاجت کے بعض لوگوں کے پاس موجود تھے ۔ اور اس کا یہ سبب تھا کہ چونکہ اسلام کے قواعد اور لوگوں کے عقائد مضبوط و راسخ نہیں ہو چکے تھے اسلئے ڈر تھا کہ قدما کے علوم سے ان میں کوئی خلل پیدا ہو ۔ یہانتک کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے مشہروں کے فتوحات میں جو کتابیں پائی تھیں وہ جلادیں۔“[1]

اس بیان میں اسکندریہ کا ذکر تک نہیں ۔ اور آخری فقرے میں عربی عبارت میں لفظ ’یروی‘ ہے جو ضعف بیان کی دلیل ہے۔ اور اس سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ حاجی خلیفہ نے اسکندریہ کے کتب خانہ کی تباہی مسلمانوں سے منسوب کی ہے ۔ لے دے کر ایک عبداللطیف کی شہادت رہ جاتی ہے جو طبیب تھا مورخ نہیں اسلئے ایک ایسے اہم و مختلف فیہ واقعہ میں تنہا اسکی شہادت کافی نہیں ۔ حاجی خلیفہ کی علمی حیثیت یہ ہے کہ وہ صرف کتابوں کی ایک فہرست کا مرتب ہے ۔ شبلی نے لکھا ہے کہ اسلام کی جتنی ابتدائی تاریخیں لکھی گئیں (اور جنکی ایک فہرست انھوں نے منسلک کی ہے) انمیں اس کا ذکر نہیں پایا جاتا ۔ حتیٰ کہ ان کتابوں میں بھی جن میں مصر و اسکندریہ کے متعلق ایک ایک جزئی واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کا ذکر نہیں ملتا ۔ تاریخی کتابوں سے قطع نظر جغرافیوں، سفرناموں اور سوانح میں اس کا ضمنًا ذکر آسکتا تھا لیکن کہیں نہیں ملتا ۔ مسلمانوں کے علاوہ خود عیسائیوں نے ابوالفرج سے پہلے خود مصر میں رہ کر تاریخ مصر لکھی اور اسکندریہ کے فتح کے حالات نہایت تفصیل سے بیان کئے، اگر یہ واقعہ پیش آچکا ہوتا تو یہ متعصب عیسائی اسکو ضرور بیان کرتے ۔ ابوالفرج نے تباہی کی جو صورت بیان کی ہے وہ اور بھی مضحکہ انگیز ہے ۔ اسکے بقول کتب خانہ حماموں میں تقسیم کیا گیا اور چھ مہینے تک اس سے حمام گرم ہوتے رہے ۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مصر میں کم ازکم چار ہزار حمام ضرور تھے، اس حساب سے فی حمام نصف کتاب کا اوسط روزانہ پڑتا ہے ۔ پھر یہ کہ یہ کتابیں کاغذ پر نہیں چمڑے پر لکھی جاتی تھیں ۔ اور ڈریپر صاحب کے بقول اسکندریہ کے حمام والے جب تک کوئی اور شے جلانے کے لئے پاسکتے تھے اسوقت تک انھوں نے چمڑے کا کاغذ نہیں جلایا ہوگا ۔ اور ان کتابوں کا بہت بڑا حصہ چمڑے ہی کے کاغذ کا بنا ہوا تھا ۔

ان سب باتوں کے علاوہ فتح اسکندریہ کے بعد شہر والوں کو ذمیوں کے حقوق حاصل ہوگئے تھے،

---

[1] مقالات شبلی : جلد ششم : ص ۱۲۰

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

کسی کے ذمی ہو جانے کے یہ معنی تھے کہ اسکے جان و مال کی حفاظت مسلمانوں پر فرض تھی - اور تاریخ میں کہیں ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہو کہ مسلمانوں نے کبھی اس معاملے میں بد عہدی کی ہو - اسکے برخلاف علمی یادگاروں میں جو چیزیں باقی رہ گئیں انھیں مسلمانوں نے محفوظ رکھا - زمانہ اسلام سے پہلے اسکندریہ میں مشہور طبیب اور فلاسفر موجود تھے جن میں سے یحیٰی نحوی فتح اسلام تک زندہ رہا - دولت عباسیہ کے عہد میں جب علمی یادگاروں کی تلاش ہوئی تو اسکندریہ سے بڑا ذخیرہ ہاتھ لگا - یحیٰی نحوی جو ابو الفرج کے قول کے مطابق کتب خانہ اسکندریہ کا مہتمم تھا اسکی تصانیف میں سے ۳۰ سے زیادہ کتابیں تلاش کرکے عربی میں ترجمہ کی گئیں - ان تیس کتابوں کے نام شبلی نے گنائے ہیں -

نتائج

اس مقالہ کے مطالعہ سے شبلی کے طریقہ استدلال اور اُن کی انداز تحقیق کا نہایت صحیح اندازہ ہوتا ہے - شبلی نے محققانہ متانت اور سنجیدگی کو ہاتھ سے نہیں دیا ہے - اور متعصب یوروپین مصنفین کی غلط بیانیوں کی تاریخی تردید کے علاوہ ان کے متعلق ایک حرف بھی نہیں کہا ہے - تحقیق کا یہ انداز ہندوستان میں بالخصوص شبلی کے عہد میں بالکل نہ تھا - لوگ مناظرے اور مخالفین کے جواب میں سب و شتم پر اُتر آتے تھے - شبلی کی متین و متوازن طبیعت کا یہ اثر تھا کہ انکے قلم میں ایسا ضبط نظر آتا ہے - شبلی کے تمام مقالات میں یہ مقالہ بہترین قرار دیا جا سکتا ہے -

اسلامی کتب خانے

کتب خانہ اسکندریہ کے واقعہ کی تردید کے سلسلے میں یہ بھی دکھانا مناسب تھا کہ علمی یادگاروں کے محفوظ رکھنے میں خود مسلمانوں کے کیا کارنامے ہیں - یہ مضمون اس کا نتیجہ ہے - اگرچہ مضمون مختصر ہے لیکن اس سے اسلامی کتب خانوں کی ایک اجمالی تاریخ نظروں کے سامنے آجاتی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کی یادگاروں کے ساتھ کیا سلوک کیا - اور انکے متعلق جو تاریخی حالات لکھے ہیں کہاں تک قابل اعتبار ہیں -

اس مضمون میں پہلے عرب میں تحریر کی ابتدا سے بحث کی ہے لیکن یہ اہم بحث بالکل تشنہ ہے اور ساری تفصیلات فتوح البلدان کے بیان پر دس سطروں میں ختم کردی ہیں - حالانکہ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ عربوں نے ہی دنیا کا سب سے پہلا رسم الخط ایجاد کیا تھا اور انھوں نے یہ خیال فینیقیوں سے حاصل کیا تھا - شبلی نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے قبیلہ طے کے تین اشخاص مرامر، اسلم، عامر نے یکجا ہو کر حروف کی شکل اور وضع قرار دی جو صحیح نہیں - اس سے پہلے حروف کی شکل فینیقیوں کے یہاں ملتی ہے - اور فینیقیوں کے یہاں مصر سے آئی - شروع میں حروف تہجی کی شکلیں اُن چیزوں کی شکلوں کے مطابق ہوتی تھیں جن کو وہ ظاہر کرتی تھیں

فینیقیوں

www.urduchannel.in

مثلاً "الفا" جو حروف تہجی میں پہلا حرف یعنی "ا" یونانی "الفا" جسکی شکل کا ہوتا ہے ⊬ - اسکے معنی بیل کے تھے۔ یا "بیتا" یعنی "ب" یونانی کا بیتا جسکی شکل ◿ یعنی گھر کی سی ہوتی ہے - یہ دونوں نام عربی ہیں اور آجتک حروف تہجی کی وہی ترتیب قائم ہے جو عربوں کے رسم الخطی کی تھی - اور جو "ابجد ہوز" کی شکل میں تھی ۔

بہرحال آغاز اسلام تک عربی تحریر کا سرمایہ کلام عرب، قرآن مجید، متفرق سورتیں، رسول اللہ صلعم کے نامہائے مبارک اور معاہدے تھے - امیر معاویہ کے عہد میں طب کی بعض کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا - خالد بن یزید (اُموی) کو فلسفہ سے ذوق تھا اسلئے اسکی کچھ کتابیں جمع کیں - باقاعدہ کتب خانوں کا پتہ عباسی دور سے پہلے نہیں چلتا - سب سے پہلے ہارون رشید نے ایک بیت الحکمت قائم کیا جس کا ایک شعبہ کتب خانے کے لئے اور دوسرا غیر زبانوں کے ترجموں کے لئے تھا۔ اسکے بعد مامون، حاکم بامر اللہ فاطمی، نوح بن منصور سامانی، عضد الدولہ دیلمی، سیف الدولہ والی حلب، محمد بن الحسن بغدادی نے کتب خانے قائم کئے - جو نہایت نایاب ذخیروں پر مشتمل تھے اور انکے قیام پر بے دریغ دولت صرف ہوتی تھی۔ یہ پہلا کتب خانہ حاکم بامر اللہ نے جو فاطمی خاندان سے مصر کا فرمانروا تھا ۳۹۵ھ میں قائم کیا اسوقت پبلک کتب خانوں کا رواج عام ہوگیا۔

کتب خانوں کے حالات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کی علمی یادگاروں کو کس طرح محفوظ کیا۔ چنانچہ فارسی کی تاریخ کی کتابیں، فن اخلاق، فن حرب، شاہان فارس کے فرامین اور توقیعات، ناول اور قصے اور فارس کے بانیان مذہب کی تصانیف بکثرت جمع کیں۔ سنسکرت کے علوم و فنون کا بڑا حصہ ترجموں سے منتقل کر کے محفوظ کر لیا۔ لیکن یہ بڑے بڑے اسلامی کتب خانے بہت جلد برباد ہوگئے۔ جس کا سب سے بڑا سبب مرکزی اسلامی حکومت کا بہت سے حصوں میں بٹ جانا اور نئی نئی حکومتوں کا قیام تھا - اسکے بعد تاتاریوں کا سیلاب تھا اور ترکستان، ماوراء النہر، خراسان، بلاد جبل، فارس، عراق، جزیرہ، شام کی تمام علمی یادگاروں کو بہا لے گیا۔ اسپین میں خود یورپ کے محققین نے اعتراف کیا ہے کہ متعصب عیسائیوں نے کئی لاکھ کتابیں برباد کر دیں۔ لیکن قسطنطنیہ اور مصر میں اب بھی نادر چیزیں مل جاتی ہیں۔

مضمون میں شبلی نے ہندوستان کے کتب خانوں کا نہایت مختصر ذکر کیا ہے - اسکی غالباً وجہ یہ تھی کہ یہاں کے کتب خانوں کا حال تاریخوں میں بہت کم مذکور ہے - یہاں کے کتب خانوں پر سیاسی انقلابات سے بڑی تباہی آئی - لیکن بہت سی نادر کتابیں ہمارے پاس نہ بھی یورپ کے کتب خانوں میں جا کر محفوظ ہوگئیں اقبال نے اپنی نظم "نوجوان مسلم سے خطاب" اسی سے متاثر ہو کر لکھی۔

صفر گر رہا جا رہا ہے

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

اسلامی حکومتیں اور شفاخانے

مسلمانوں کا یہ بھی ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں امورِ عامہ اور رفاہِ عام کے کاموں کی طرف خاص طور پر توجہ کی۔ چنانچہ اس مضمون میں مسلمانوں کے پبلک ورکس کی ایک شاخ یعنی شفاخانوں کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس صیغہ کو اس قدر ترقی دی کہ شفاخانوں کے حالات اور تجربات پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ جوابات پیدا ہیں۔

عرب میں باقاعدہ طبابت رسول اللہ صلعم کے عہد سے کچھ پہلے شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ حارث بن کلدہ نے جو طبیب ایوب کہلاتا ہے ایران میں علم طب کی باقاعدہ تحصیل کی اور اسی سلسلہ سے نوشیروان کے دربار میں رسائی پیدا کی۔ اس کا بیٹا نضر اس فن کا بڑا ماہر تھا۔ اور اسی نے علم طب کو عرب میں رواج دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں عرب میں طبیبوں اور جراحوں کی ایک خاصی تعداد پیدا ہوگئی تھی۔ حضرت عمرؓ نے جب ایران پر فوج کشی کی تو بہت سے طبیب ساتھ بھیجے۔

امیر معاویہ کے عہد سے لے کر ولید کے زمانے تک اس فن میں بڑی ترقی ہوئی۔ ولید بن عبد الملک نے ۸۸ھ میں سب سے پہلے شفاخانہ کی بنیاد ڈالی اور اسکے بعد بکثرت شفاخانے قائم ہوئے۔ عباسیوں کے زمانے تک طب میں یونانی اور پارسی طبابت کے اصول شامل تھے۔ لیکن برامکہ کی وجہ سے اس میں ویدک کا اضافہ ہوا۔ بہت سے ہندو حکیم ہندوستان سے گئے اور طب کی کتابوں کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کیا۔ ہارون اور مامون کے زمانے میں شفاخانے کے عہدہ داروں کو بڑی بڑی تنخواہیں ملتی تھیں۔ یہاں تک کہ بعض طبیب لباس، سواری، سازوسامان اور شان و شوکت میں خود خلیفۂ وقت کا مقابلہ کرسکتے تھے۔ مصر میں احمد بن طولون نے شفاخانے کی بنیاد ڈالی۔ خلیفہ مقتدر باللہ کے عہد میں گشتی شفاخانے اور جیل خانوں کے اسپتال قائم ہوئے۔ اور اسکے تھوڑے عرصہ بعد یہ قانون بن گیا کہ کوئی طبیب بغیر سند لئے علاج نہیں کرسکتا۔ سند میں تصریح ہوتی تھی کہ کس درجہ کا امتحان پاس کیا ہے اور کس علاج کی اجازت ہے۔ نور الدین زنگی نے دمشق میں شفاخانۂ نوریہ قائم کیا جس میں امیر و غریب سب علاج کراسکتے تھے۔ صلاح الدین کا شفاخانہ جو قاہرہ میں تھا صلاح الدین کے مغازی میں تھا۔ ملک منصور قلاؤن نے ایک بڑے محل میں بہت بڑے شفاخانے کی بنیاد ڈالی۔ اسکے متعلق شبلی لکھتے ہیں:

> "اس کثرت سے لوگ اس میں علاج کو آتے تھے کہ ان کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ معمولی شربت چھوڑ کر شربت انار وغیرہ کے روزانہ پانچسو رطل خرچ ہوتے تھے۔"[1]

لہ

www.urduchannel.in

مکہ اور مدینہ میں بھی شفاخانے تھے۔ ہندوستان میں صرف دہلی میں محمد بن تغلق کے زمانے میں ستر شفاخانے تھے۔ اور جہانگیر کے زمانے میں بھی ہر بڑے شہر میں ایک شفاخانہ قائم ہوا۔ ان شفاخانوں میں دواؤں کے بہم پہنچانے کا اور نئی نئی دواؤں کے تجربہ کرنے کا بھی مستقل انتظام تھا۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر

مسلمانوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ جس ملک میں گئے اسے اپنا وطن بنا کر رہے۔ اور جدید و قدیم کی آمیزش سے ایک نئی تہذیب اور معاشرت کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ اس مضمون میں شبلی نے ان فیوض و برکات کا ذکر کیا ہے جو ہندوستان کو مسلمانوں سے پہونچیں۔ پہلے بابر کے الفاظ میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہندوستان کی حالت دکھائی گئی ہے۔ اگرچہ بابر کے عہد تک مسلمانوں کو آئے ہوئے ایک مدت گزر چکی تھی اور انکے اثرات تہذیب و معاشرت میں راہ پا چکے تھے، تاہم بابر جیسا سپاہی منش آدمی بھی یہاں کی تہذیب و معاشرت کو دیکھکر اس پر سخت تنقید کرتا ہے۔ اور اسے بیساختہ اپنا وطن یاد آتا ہے۔ اسکے بعد مضمون میں بتایا گیا ہے کہ زمین کی پیداوار، صنعت اور مصنوعات میں مسلمانوں نے کیا کیا اضافے کئے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہترین پھل پھول اور میوے سب اسی زمانے میں آئے۔ بقول شبلی اہل ہند پہلے گزی گاڑھے کے سوا اور کچھ نہ جانتے تھے۔ مسلمانوں نے ایران اور چین سے کاریگر بلاکر ہر قسم کے نرم و نازک کپڑے تیار کرائے۔ صرف ابوالفضل نے چوبیس ریشمی کپڑوں کے نام اور ان کی قیمتیں لکھی ہیں۔ اٹھارہ سوتی کپڑے انکے علاوہ تھے۔ بندوبست آراضی اور پیمایش کے سلسلے میں عہد اکبری میں زمین کی پیمائش ہوئی۔ اور مختلف درجے قائم ہوکر مختلف شرحیں قائم ہوئیں۔ افزائش اور ترقی حیوانات کے سلسلہ میں اونٹ باہر سے منگوائے گئے۔ اور گھوڑوں کی اعلیٰ نسلیں تیار کی گئیں۔ صحرائی جانور عجائب خانوں میں جمع کئے گئے۔ شاہجہاں اور جہانگیر نے ان کی تفصیلات لکھی ہیں۔ شیرشاہ نے بنگال سے سونی پت تک سایہ دار سڑک بنوائی۔ جہانگیر نے اس محکمہ کیطرف خاص توجہ کی اور اسکے علاوہ یہ حکم دیا کہ تمام بڑے بڑے شہروں میں غلہ خانے قائم کئے جائیں۔ جہاں سے مستحقین کو کھانا تقسیم کیا جائے۔ ڈاک کے انتظامات نہایت مکمل تھے۔ تیموریوں کے زمانے میں خاص طور پر ایجادات و اختراعات ہوئیں۔ عہد اکبری میں امیر فتح اللہ شیرازی نے ایک کل کی چکی ایجاد کی جو خود بخود چلتی تھی اور آٹا پیستی تھی۔ اکبر ہی کے دربار کے ایک صناع نے سترہ نال کی ایک توپ تیار کی جسکی سب نالیں ایک ہی دفعہ چلتی تھیں۔

نفاست پسندی اور آسائش کے بہت سے سامان پیدا ہوئے۔ نور جہاں نے بہت سے

www.urduchannel.in

لباس اور زیورات رائج کئے۔ چاندنی بھی انکی ایجاد ہے۔ عطرِ گلاب بھی اسی سے منسوب ہے۔ خس کی ٹٹی اکبر نے ایجاد کی۔ اور اسی زمانے میں شورے سے پانی ٹھنڈا کرنے کا رواج ہوا۔ فنِ تعمیر کے سلسلے میں تاج محل کا نام کافی ہے۔ جو نزاکت و نفاست اس میں پائی جاتی ہے الفاظ میں نہیں سماتی۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے "ہفت عجائب" میں شمار کیا جاتا ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

موسیقی، مصوری وغیرہ پر شبلی نے کچھ نہیں لکھا ہے لیکن انھوں نے مستقل مضمون لکھنے کا ارادہ ضرور کیا تھا جسے وہ پورا نہ کر سکے۔

مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی

یہ مضمون دراصل ایک نہایت معمولی کتاب سے متعلق ہے۔ ایک ہندو نے ملا مسیح کی رامائن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس کتاب کا گمنامی میں پڑا رہ جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور میں ہندوؤں کے علوم و فنون کی جانب توجہ نہیں کی۔ شبلی نے اسی کی تردید میں یہ مضمون لکھا ہے اور بکثرت حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ ہندوستان کے علوم و فنون کی قدر کی۔ آزاد بلگرامی نے "غزالان الہند" میں بکثرت ایسی باتوں کا ذکر کیا ہے۔ امیر خسرو نے مثنوی "نہ سپہر" میں ایک مستقل باب ہندوستان کے فضائل کا قائم کیا ہے۔ جہانگیر بڑے شوق سے ہندوستانیوں کے پاس جاتا اور ان کی گفتگو سنتا۔ مسلمانوں نے سنسکرت کی جو کتابیں ترجمہ کیں ان کا ذکر شبلی نے ایک علیحدہ مضمون میں بھی کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیحی کی رامائن کو جو قبولِ عام حاصل نہیں ہوا وجہ اسکی یہ تھی کہ اسکی فارسی بہت ادنیٰ درجہ کی تھی۔ اور اس میں شاعری کا مزہ نہیں تھا۔ بقول شبلی اگر وہ صحابہ کے حالات میں بھی کتاب لکھتا تو کوئی نہ پوچھتا۔

مقالات میں آخری مقالہ "مکینکس اور مسلمان" کے عنوان سے ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے یونان کے علوم و فنون سیکھ کر اس سے عملی کام بھی لئے۔ چنانچہ مکینکس کی ابتدا بھی دولتِ عباسیہ کے عہد میں تراجم سے ہوئی۔ جتنے نام شبلی نے گنائے ہیں مسلمانوں کی ایجادات میں کئی گھڑیوں کا ذکر کیا ہے۔ سلطان عبدالمومن خاں نے ایک صندوق بنوایا تھا جو خود بخود کھلتا تھا۔ اور اسمیں سے رمل اور جوکی کھل کر باہر آجاتی تھی۔ لیکن اس کا اعتراف شبلی نے بھی کیا ہے کہ مکینکس میں مسلمانوں نے زیادہ ترقی نہیں کی۔

www.urduchannel.in

شبلی کے تاریخی مقالات پر نظر ڈالنے سے حسبِ ذیل نتائج ذہن میں آتے ہیں

(۱) تاریخی مضامین سے انہیں طبعی مناسبت تھی۔ اس لئے جس کثرت سے اور جیسے پُرزور تاریخی مضامین انہوں نے لکھے ہیں، وہ زور و قوت ان کے دوسرے مضامین میں نہیں۔

(۲) متنازعہ فیہ مسائل میں وہ زیادہ تر قدیم ترین اور معاصر شہادتوں سے کام لیتے ہیں۔ اسی لئے ان کے نتائج بالعموم نہایت صحیح ہوتے ہیں۔ کتب خانہ اسکندریہ والا مضمون اس کی بہترین مثال ہے۔

(۳) شبلی اگرچہ صرف عربی کے عالم تھے لیکن یورپ کی جدید ترین تحقیقات سے ہر موقع استفادہ کرتے تھے۔ اور اہلِ یورپ کی تصانیف کا ذکر ہمیشہ رشک سے کیا کرتے تھے۔

(۴) یورپ کی زبانوں میں علمی تحقیق سب سے زیادہ فرانسیسی اور جرمن میں ہوئی۔ ان میں فرنچ سے شبلی واقف تھے۔ جس کا انہوں نے بار بار ذکر کیا ہے۔ اور جرمن سے ناواقفیت پر انہوں نے جا بجا افسوس کا اظہار کیا ہے۔

(۵) سارے مقالات ایک مقصد کے تابع ہیں یعنی مسلمانوں کو ان کے گزشتہ علمی کارنامے یاد دلا کر ترقی پر آمادہ کرنا۔ جو ایک طور پر سرسید کی تحریک کا ہی ایک پہلو ہے۔ اس سلسلے میں ان اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے جو یورپ کے بعض مصنفین نے اسلام اور مسلمانوں پر کبھی برنائے تعصب اور کبھی ناواقفیت کی وجہ سے کئے۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

مقالات شبلی (جلد ہفتم)

فلسفیانہ

تبصرہ

جلد ہفتم میں بارہ (۱۲) مضامین ہیں۔ اور آخری مضمون کو چھوڑ کر جو ندوۃ العلماء کے اجلاس اور علمی نمائش سے متعلق ہے، باقی سب مضامین فلسفیانہ ہیں۔ شبلی ان معنوں میں فلسفی نہیں تھے جن معنوں میں ارسطو یا افلاطون فلسفی کہے جاتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے کوئی مستقل نظام مرتب نہیں کیا۔ لیکن اپنے فن میں وہ انتہائی حقیقت تلاش کرنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اور اس اعتبار سے ان کی تمام تحریروں میں فلسفی کا تجسس منطقی کا استدلال اور مفکر کی گہرائی نظر آتی ہے۔ فلسفہ انکے موضوع میں بھی داخل نہیں تھا۔ لیکن علوم اور فنون سے انھیں تعلق تھا اُن میں فلسفہ کے مسائل کا آنا ناگزیر تھا۔ مثلاً علم کلام، دراصل اسلامی فلسفہ کا ہی دوسرا نام ہے چونکہ شبلی جدید علم کلام مرتب کرنا چاہتے تھے اسلئے متقدمین کے فلسفہ کا مطالعہ ان کے لئے ضروری ہوگیا۔

شبلی کا سب سے پہلا مضمون "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" ہے۔ اس میں جن تراجم کا ذکر کیا گیا ہے انمیں زیادہ تر فلسفہ کی وہ کتابیں ہیں جو یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے سے مولانا کی نظر فلسفیانہ تصانیف پر رہی ہوگی۔ بعد میں الکلام و علم الکلام کی تیاری میں اسکے مفصل مطالعہ کا موقع ملا۔ متقدمین کی بیشتر کتابیں ہندوستان میں ناپید تھیں۔ لیکن ترکی میں موجود تھیں۔ چنانچہ شبلی نے سرسید کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں بعض ایسی کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ شبلی جدید فلسفہ سے بہت کم واقف تھے۔ انکی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا ماخذ زیادہ تر عربی کتابیں تھیں۔ یوروپین زبانوں میں سوائے فرانسیسی کے وہ کسی سے آشنا نہ تھے۔ اور فرانسیسی بھی اتنی نہیں جانتے تھے کہ فلسفے کے دقیق مسائل پر اس زبان میں کتابیں پڑھ سکیں۔ علم کلام پر اعتراضات میں سب سے بڑا الزام یہی تھا لیکن مکاتیب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مسائل میں انھوں نے مسٹر عبدالماجد فلسفی

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

(جواب مولانا عبدالماجد دریابادی ہیں) اور اپنے بھائی مولانا حمید الدین سے مشورہ کرتے تھے۔ اس لئے یہ بھی نہیں کہنا چاہیئے کہ موجودہ فلسفہ کے مسائل انکے کان میں بھی نہیں پڑے تھے۔

فلسفیانہ مضامین میں چار مضمون فلسفہ یونان اور اسلام سے متعلق ہیں۔ جس میں اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے فلسفہ یونان پر کچھ اضافہ نہیں کیا ہے۔ مضمون میں شبلی نے یہ بیان کیا ہے کہ مسلمانوں میں فلسفہ کی ابتدا یونانی ترجموں سے ہوئی۔ مسلمان فلاسفہ میں دو فلسفی فارابی اور بوعلی سینا ارسطو کو اپنا استاد سمجھتے ہیں۔ لیکن امام رازی نے اسی فلسفے پر اعتراض کئے ہیں۔ تاہم ان کا فلسفہ ارسطو سے زیادہ مختلف نہیں۔ سب سے پہلے یحیٰی نحوی نے اس کا رد لکھا۔ یہ مسلمان نہ تھا لیکن اسکی تصانیف مسلمانوں میں بہت رائج ہوئیں۔ اور مصنفین اسلام نے اس کو حکمائے اسلام میں بھی شمار کیا ہے۔ اسی زمانے میں مشہور معتزلی ابو علی جبائی نے ارسطو کی ایک کتاب کا رد لکھا اور حسن نوبختی نے بھی ارسطو کی منطق کی غلطیاں ظاہر کیں۔ ابو بکر باقلانی نے جو امام غزالی کے استاد تھے فلسفہ کے رد میں ایک کتاب لکھی جس میں ثابت کیا کہ یونانیوں کی منطق پر اہل عرب کی منطق کو ترجیح حاصل ہے۔ [ع۵] چھٹی صدی ہجری میں ابو البرکات بغدادی، شیخ شہاب الدین شیخ الاشراق اور امام رازی نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔

یک مقالہ الراء اصل کے مقالہ اسکے دیکھنا چاہئے مجھے اس میں شک ہے
س

اسکے بعد مضمون کی دو قسطیں ہیں جس میں یونانی منطق کی غلطیاں بتائی ہیں۔ دونوں مضامین میں منطقیانہ شکلوں اور نتائج سے بحث ہے۔ اور بالعموم ابن رشد کے حوالے دئے گئے ہیں۔ منطقی

پانچویں مضمون میں تین بحثیں ہیں۔ یونان کا فلسفہ کیا تھا، فلسفہ حال کیا ہے اور مسلمانوں کے فلسفے کو ان دونوں فلسفوں سے کیا نسبت ہے۔ یہ مضمون شبلی نے نہایت مختصر لکھا ہے اور اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جسکے لئے یہ مضمون لکھا گیا۔

دو مضمون علم کی حقیقت اور کشش پر ہیں۔ کشش والے مضمون میں یہ بتایا ہے کہ سر آئزک نیوٹن کو مسئلہ کشش کا موجد نہیں سمجھنا چاہیئے کیونکہ مسلمانوں میں ثابت بن قرہ اور امام رازی نے نیوٹن سے پہلے اس مسئلہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور مثنوی مولانا روم میں بھی اس کا ذکر نہایت تفصیل سے آیا ہے۔

آٹھویں مضمون میں ڈارون کے مسئلہ ارتقا کا ذکر ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں میں یہ خیال پہلے سے موجود تھا۔ چنانچہ رسائل اخوان الصفا اور علامہ ابن مسکویہ کے الفوز الاصغر میں یہ مسئلہ نہایت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اور نظامی عروضی نے بھی چہار مقالہ میں اس پر بحث کی ہے۔ باقی مضامین میں سے

ع۵ مقالات شبلی ج ۷، ص ۸ میں یہ عبارت ہے: "نوبختی کے بعد ابوبکر باقلانی .... غزالی کے استاذ الاستاد تھے، دقائق کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں فلسفہ کا رد تھا اور یہ ثابت .... ترجیح ہے!" ۔ ہلال

www.urduchannel.in

ایک ڈاکٹر ہرٹن کے تصرف میں ہے، جسنے جرمن زبان میں بو علی سینا کی مابعد الطبعیتم کا ترجمہ کیا ہے ۔ اور ایک کتاب فلسفۂ اسلام پر بھی لکھی ہے ۔ فلسفہ اور فارسی شاعری کے عنوان سے سحابی نجفی کی شاعری کا ذکر کیا ہے جو مشہور رباعی گو تھا ۔ اور اسکے کلام سے فلسفیانہ مباحث کی مثالیں دی ہیں ۔ ایک چھوٹا سا مضمون حقائق اشیاء اور معشوق حقیقی کے عنوان سے ہے ۔

اورنگ زیب قاسمی

ان مضامین کے مطالعہ سے مولانا کی افتادِ طبع کا صاف پتہ چلتا ہے ۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ انھوں نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھایا ۔ یہ مضامین اس دعوے کے شاہد ہیں ۔ مولانا کے اسلوب تحریر میں جو سلجھاؤ اور ٥ منطقیانہ استدلال ملتا ہے وہ بھی اسی کا مرہونِ منت ہے ۔ اس اعتبار سے اگر یہ مقالات کسی نئے فلسفے کا انکشاف نہیں کرتے تو نظر انداز بھی نہیں کئے جا سکتے کیونکہ ان سے مولانا کا ایک خاص رجحان ظاہر ہے ۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

مقالاتِ شبلی (جلد ہشتم)

قومی اور اخباری مضامین

تبصرہ

مقالات کی آٹھویں جلد مولانا کے متفرق اخباری مضامین اور تجاویز پر مشتمل ہے۔ ان میں نو مضمون مذہبی ہیں۔ صیغۂ[۱] اشاعت اسلام، نومسلم[۲] راجپوت، حفاظت[۳] و اشاعت اسلام، نومسلموں[۴] کو دوبارہ ہندو ہونے سے بچانے کے لئے تمام برادران اسلام کی خدمت میں فریاد۔ کارروائی[۵] انجمن وقف علی الاولاد، وقفِ[۶] اولاد کی کارروائی کہاں تک پہونچی، اوقاف[۷] اسلامی، وقف[۸] اولاد، میموریل[۹] متعلق نماز جمعہ۔ یہ مضامین اخباری ہیں۔ اسلئے ان میں تلاش و تحقیق و استدلال کا کوئی سوال ہی نہیں۔ ایک بات البتہ نہایت اہم معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص تالیف و تصنیف کو مقصد حیات بنالے وہ کسی اور قومی، ملکی یا مذہبی تحریک میں حصہ لینے کا وقت نہیں نکال سکتا۔ لیکن قرون اولیٰ میں بکثرت ایسے مسلمان ملتے ہیں جو بیک وقت صاحب سیف بھی تھے اور صاحب قلم بھی۔ جنہوں نے سپہ سالاری، ملکی انتظام، تالیف و تصنیف، جملہ کام بیک وقت انجام دئے۔ شبلی کے ان تمام مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گفتار کے ساتھ کردار کے بھی غازی ہیں۔ ان مضامین کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اشاعت اسلام کا کام باقاعدہ شروع کیا تھا، یہ مضامین زیادہ تر ۱۹۰۸ء کے چند سال بعد کے ہیں۔ اس زمانے میں مسلمانوں کو ہندو بنانے کی تحریک بڑے زور پر جاری تھی۔ اس سلسلے میں شبلی نے خود دورے کئے، کئی طالب علموں کو تیار کیا اور اپنے شاگرد رشید سید سلیمان ندوی کو اس اسکیم میں اپنا مددگار بنایا۔ اسیطرح وقف علی الاولاد اور اوقاف اسلامی پر انکے مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہبی اصلاح کے ساتھ معاشی اصلاح کو بھی اہم اور ضروری سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں سب سے بڑا مسئلہ اقتصادیات کا تھا۔ جسکی اہمیت اب بھی ویسی ہی ہے۔ مسلمانوں کی جائدادیں رفتہ رفتہ ساہوکاروں کے قبضہ میں جارہی تھیں۔ انکے انسداد کے لئے مولانا نے وقف علی الاولاد کا قانون بنوایا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ اصل جائداد

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

باقی رہے اور اسکے نفع سے اولاد فائدہ اٹھاتی رہے۔ یہ مسئلہ سرسید نے بھی اٹھایا تھا لیکن باوجود حکومت میں سرسید کے اثر و اقتدار کے انھیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ شبلی نے اس پر کئی مضامین لکھے، علمائے ہند سے جن میں سنی اور شیعہ دونوں شامل تھے فتوے حاصل کئے جس سے مسئلہ وقف اولاد کی مذہبی حیثیت بھی پوری طرح واضح ہو گئی۔ ایک رسالہ وقف اولاد پر لکھا۔ جس میں قرآن مجید، حدیث اور فقہ سے استدلال کر کے مسئلہ کو ثابت کیا۔ ملک کے قانون دانوں کی رائیں حاصل کی گئیں۔ اور فارموں پر مسلمانوں کے دستخط کرائے گئے، آخر کار یہ مسئلہ اسمبلی میں پیش ہوا۔ اور محمد علی جناح کی تحریک پر منظور ہو گیا۔

٭ اوقاف اسلامی کا مسئلہ نہایت نازک تھا۔ اگرچہ اسمیں شبلی کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی لیکن اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی قومی ضرورت کے لئے قومی سرمائے کی اہمیت محسوس ہونے لگی۔ اگرچہ مسلمانوں نے ہر قومی کام میں دل کھول کر چندہ دیا تاہم ان کی ضروریات کے لئے یہ کافی نہ تھا۔ اوقاف اسلامی جنکی تعداد حد شمار سے افزوں ہے آمدنی کا ایک مستحکم ذریعہ بن سکتے ہیں۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ ان اوقاف کی چونکہ نگرانی نہیں ہوتی اسلئے ان کی آمدنی قومی ضروریات میں صرف ہونے کے بجائے متولیوں کی ذات پر صرف ہوتی ہے۔

علمی و تاریخی مضامین تعداد میں دس ہیں۔ جن میں سب سے اہم سیرۃ النبیؐ کی تجویز ہے۔ یہ تجویز بھی مولانا کے ہاتھوں عملی جامہ نہ پہن سکی۔

تعلیمی مضامین زیادہ تر ندوہ کے ابتدائی زمانہ سے متعلق ہیں۔ اور مجموعہ کا سب سے اہم مضمون غالباً "مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ" ہے چونکہ ہندوستانی سیاست پر مولانا کا ایک ہی مفصل مضمون ملتا ہے اسلئے اسکا تفصیلی جائزہ لینا چاہیئے۔

اسلام کا نشو و نما عرب میں ہوا۔ جہاں حریت اور آزادی کی روح پہلے سے کار فرما تھی۔ اسلام نے اس آزادی کو اور زیادہ تقویت دی۔ خلیفۃ المسلمین کے انتخاب کا طرز جمہوریت پسندی کی تائید کرتا ہے۔ لیکن بعد میں سیاسی حالات کی بناء پر خلافت سلطنت بن گئی اور رفتہ رفتہ ممالک اسلامیہ میں بھی شخصی سلطنتوں کا رواج ہو گیا۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی۔ اگرچہ اس کو گھن لگے ایک صدی سے زیادہ گزر چکی تھی لیکن سلطنت کا نام قائم تھا۔ اور مسلمانوں کی سیاست ایک فرمانروا کی سیاست تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ محکوم قوم کی سیاست بن گئی۔ اسوقت ہندوستان میں دو بڑے فرقے تھے ہندو اور مسلمان۔ چونکہ ہندوؤں کو غلامی سہتے صدیاں گزر چکی تھیں اور اب اُن کے سابق حاکم یعنی مسلمان بھی انہی کے ہم رنگ یعنی محکوم بن چکے تھے اسلئے

www.urduchannel.in

سیاسی آزادی کے خیالات پہلے ان میں پیدا ہوئے اور ان کے ساتھ بعض مسلمان بھی شریک ہوئے۔ ہندوستانی

اورنگ زیب قاسمی

سیاسی جدوجہد کی تاریخ بیان کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے، البتہ اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ جس وقت شبلی اس میدان میں آئے اسوقت کانگریس اور مسلم لیگ دو مستقل جماعتیں سیاسی جدوجہد کے لئے وجود میں آچکی تھیں۔ وہ زمانہ کانگریس کے شروع کا تھا۔ اور فرقہ وارانہ رنگ اس پر نہ چڑھنے پایا تھا اسلئے شبلی کانگریس کے حامی تھے اور اس مسئلہ میں سرسید سے سخت اختلاف رکھتے تھے۔ مولانا کے خیالات کا اندازہ "پولیٹیکل کروٹ" سے ہوسکتا ہے۔ انکی شاعری کے سلسلے میں ہم نے دکھایا ہی کہ انکے کلام میں کہاں تک سیاسی رنگ نمایاں ہے۔

یہ مضمون کئی قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ پہلی قسط میں مولانا نے وقار الملک کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ مسلمانوں کی جماعت ہندوؤں سے مل کر اپنی ہستی قائم نہیں رکھ سکتی۔ شبلی نے اسپر اظہار افسوس کیا ہے کہ مسلمانوں کا آئیڈیل یعنی مطمح نظر بی اے اور پھر نوکری ہے۔ ہندوؤں نے اپنی زندگی قومیت قومی کے لئے وقف کر دی ہے۔ سلسلے کی یہ پہلی قسط ۱۲ فروری ۱۹۱۲ء کو شائع ہوئی۔ دوسری قسط میں تین امور سے بحث کی ہے (۱) پالٹکس کی صحیح اسکیم (۲) ہمارے موجودہ طریقے کی غلطیاں (۳) ہندو مسلمانوں کا اتحاد۔ اول الذکر بحث میں لکھتے ہیں کہ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان حاکمانہ دماغ پیدا نہیں کر سکتا۔ ایسے مسلمانوں کے نام بکثرت ملتے ہیں جو ہندوستان میں ہی انگریزوں کے دوش بدوش ذمہ کے عہدے سنبھالے ہوئے ہیں۔ شبلی نے اس پر بڑا افسوس ظاہر کیا ہے کہ سرسید جو ابتدائی زمانے میں نہایت آزاد خیال تھے وہ بھی حالات اور گردوپیش کے واقعات سے مجبور ہو کر یہ رائے ظاہر کرنے پر آمادہ ہوگئے کہ مسلمانوں کو پالیٹکس سے علیحدہ رکھا جائے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سیاست ترقی نہ کرنے پائی۔ لکھتے ہیں:۔

"علی گڑھ نے سینکڑوں ہزاروں اعلیٰ درجے کے دل و دماغ کی تربیت کی۔ ہزاروں گریجویٹ بنائے کامریڈ کا ایڈیٹر، سجاد حیدر جیسا انشاء پرداز، اور ظفر علیخاں جیسا دلیر پیدا کیا۔ جو ایسے قابل اشخاص پیدا کر سکتا تھا وہ بدرالدین طیب جی، اور علی امام نہیں پیدا کر سکتا تھا۔ لیکن جس عضو سے کام نہیں لیا جاتا وہ بیکار ہو جاتا ہے! اسلئے پولیٹکل تعلیم سے محروم رہنے کا یہ لازمی نتیجہ تھا اور یہی ہونا چاہئے تھا۔" ۱؎

شبلی لکھتے ہیں کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سرسید نے نیشنل کانگریس کی شرکت سے مسلمانوں کو روکا تھا تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ مسلمانوں کو پالیٹکس سے علحدہ ہو جانا چاہئے۔ کیونکہ مسلمانوں کو ایک جداگانہ پولیٹیکل اسٹیج کی ضرورت ہے۔ اسوقت مولانا کی نظر مسلم لیگ پر پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:۔

۱؎ مقالات شبلی: جلد ہشتم: ص ۱۵۷

www.urduchannel.in

"مسلم لیگ، یہ عجیب مخلوق کیا چیز ہے، کیا یہ پالیٹکس ہے، خدانخواستہ نہیں، اینٹی کانگریس ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

نہیں۔ کیا ہاؤس آف لارڈس ہے۔ ہاں سوانگ تو اسی قسم کا ہے۔"

اس مضمون پر داروگیر ہونا یقینی تھا۔ چنانچہ مختلف لوگوں نے شبلی پر اعتراضات کئے۔ اسکے جواب میں شبلی نے تیسری قسط لکھی۔ جس میں بتایا کہ مسلم لیگ ایک فرضی بیکار چیز ہے۔ اس میں نہ پالیٹکس کی علامت پائی جاتی ہے نہ لیگ کا کانسٹیٹیوشن (Constitution) پالیٹکس سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ مسلم لیگ مسلم لیگ رہ کر کسی کام کے قابل ہو سکتی ہے۔ اسکے بعد انہوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کے مطالبات کا موازنہ کرکے یہ بتایا ہے کہ کانگرس سلف گورنمنٹ چاہتی ہے۔ اور اسکی جدوجہد سے اس میں تھوڑی بہت کامیابی بھی ہوئی ہے۔

آخری مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کا ہے۔ شبلی لکھتے ہیں کہ پرانے زمانے میں ہندوؤں نے ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر کام کیا۔ مغلوں کی تاریخوں میں مسلمانوں کی بغاوت کا ذکر ملتا ہے لیکن کسی ہندو راجہ نے جو اکبری دربار سے متوسل ہو بغاوت نہیں کی۔

شبلی کا یہ آخری استدلال بہت ہی کمزور ہے۔ اس وقت اور اس وقت کے مسلمانوں کی حالت میں بڑا فرق ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:-

> لیکن سوال یہ ہے کہ اگر مسلمان اپاہج بنے بیٹھے رہے۔ اگر وہ پالیٹکس سے خوف کھاتے رہے۔ اگر ان کو وائسرائے کی کونسل کے بیٹھنے کے بجائے لونڈوں کے ساتھ مکتب میں بیٹھنا زیادہ پسند تھا۔ اگر ان میں کسی قسم کا عزم، حوصلہ، ہمت اور حقوق طلبی نہ تھی تو کیا ہندوؤں کا یہ فرض تھا کہ وہ بھی بے دست وپا بنجاتے۔" [۵۲]

اس فقرے میں شبلی نے جس پر چوٹ کی ہے اس راز کو ہم کھولنے کی ضرورت نہیں سمجھتے، لیکن ان کا یہ انداز ان کی عام روش اور متانت کے خلاف نظر آتا ہے۔ سیاست کے جوش میں قلم کا اسطرح بہک جانا شبلی کا ہی قصور نہیں، اس میدان میں آکر تقریباً ہر شہسوار کہیں نہ کہیں ضرور ٹھوکر کھاتا ہے

---

۵۲ مقالات شبلی : جلد ہشتم : ص

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

خطباتِ شبلی

خطابت

مولانا شبلی جہاں شاعر و فلسفی، فقیہ و محدث، مورخ و معلم، ناقد اور ماہر تعلیم تھے وہاں قدرت نے انھیں قوت گویائی بھی عطا کی تھی۔ تقریر کا ملکہ اکتسابی نہیں وہبی ہوتا ہے۔ انسان کوشش سے تو مقرر بن سکتا ہے مگر اسکی تقاریر میں وہ اعجاز نہ ہوگا جو سامعین کے دلوں کو مسحور کرلے۔ مقرر کو سب سے پہلے نباض ہونے کی ضرورت ہے۔ اس کا سب سے پہلا فرض سامعین کا جائزہ لینا ہے۔ صرف نگاہوں سے ہی نہیں بلکہ دل و دماغ سے بھی۔ وہ ٹٹولتا ہے پرکھتا ہے اور پورے طور سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُسے دیکھنا پڑتا ہے کہ اسکے مخاطب کس قسم، کس طبقہ اور کس ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی ذہنی نشو ونما کیسے ہوئی ہے، اور ان کو کس انداز سے متاثر کیا جا سکتا ہے۔ جب ان کی دکھتی رگ ہاتھ آجاتی ہے اسوقت وہ زبان کو جنبش دیکر ان کے جذبات سے کھیلنا شروع کرتا ہے۔ اور موقع موقع سے انھیں ٹھنڈا اور مشتعل بھی کرتا رہتا ہے الفاظ کے زیر و بم سے ایک تناسب اور ہم آہنگی پیدا کرکے ایک تلاطم برپا کر دیتا ہے۔ مقرر کی آواز کبھی ڈوب کر اور کبھی ابھر کر اور کبھی گونج کر سامعین کو مسحور اور از خود رفتہ بنا دیتی ہے۔ اور وہ خطاب کرنے والے ہی کی زبان سے بولنے اسی کے کانوں سے سُننے اور اُسی کے دماغ سے سوچنے لگتے ہیں۔ یہی مقرر کی کامیابی اور تقریر کی معراج ہے۔ مقرر کیسا ہی خوش بیان اور چرب زبان کیوں نہ ہو، اسکی تقریر کیسی ہی دلکش اور اثر آفریں کیوں نہ ہو۔ اگر اسمیں ہم خیال بنانے کی صلاحیت نہیں تو بیکار ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مقرر کے لئے نبّاض ہونا ضروری ہے۔ اور یہ صلاحیت صرف خداداد ہوا کرتی ہے۔

علی گڑھ کی فضا اور ماحول نے نہ صرف مولانا کو ایک بلند پایہ مصنف بننے میں مدد دی، بلکہ انھیں ایک زبردست مقرر بھی بنا دیا۔ علی گڑھ آنے سے پہلے ان کے مقرر ہونے کا کہیں سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ انھیں اپنی خطیبانہ صلاحیت کا احساس یہیں آکر ہوا۔ مواقع ساز گار ملے، جوہر قابل تھے، انھوں نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اور کالج کی سوسائٹیوں اور کانفرنس کے جلسوں میں تقریریں کرتے رہے۔ تھوڑے عرصہ میں انھوں نے

www.urduchannel.in

اپنی شعلہ بیانیوں سے لوگوں کو متاثر اور مبہوت بنا دیا ۔ اسکے بعد ندوۃ العلماء قائم ہوا تو اسکے جلسوں میں مولانا کی
اورنگ زیب قاسمی
تقریروں نے بڑی اہمیت حاصل کی اور وہ ہندوستان کے بے مثل و بے نظیر مقررونمیں شمار ہونے لگے ۔

سامعین پر سب سے پہلا اثر مقرر کی شخصیت یا Personality کا پڑتا ہے ۔ اسکے بعد آواز اور پھر تقریر یا انداز بیان کا ۔ خوش قسمتی سے شبلی میں یہ تینوں چیزیں موجود تھیں ۔ قد لانبا، شکل وجیہہ، آواز بلند اور گونجنے والی، تقریر ٹھوس اور عالمانہ اس سے زیادہ کامیابی کے لئے اور کیا چاہئیے تھا ۔

مولانا کی تقریریں تاریخی واقعات اور علمی معلومات سے لبریز ہیں ۔ ان میں نہ قصص و حکایات ہیں اور نہ مبتذل اشعار، وہ کوئی بھی واقعہ بھی نہیں بیان کرتے جو دور از کار حکایتوں پر مبنی ہو۔ بے محل نہ ہوگا اگر مولانا کی تقریر کا انداز، اور اُن کی تقریروں پر نواب محسن الملک مولوی مہدی علیخاں کے تاثرات کو جو خود ایک سحر بیان خطیب تھے انہی کے الفاظ میں بیان کر دیا جائے ۔ وہ لکھتے ہیں :-

"...مولانا (شبلی) جو وقت اسٹیج پر تشریف لائے تو ہاتھ میں صرف ایک کارڈ تھا ۔ جسکا آدھا حصہ تو یقیناً بالکل سادہ تھا ۔ اور باقی پر دو ڈھائی سطر پنسلی تحریر معلوم ہوتی تھی ۔ جسپر کبھی کبھی دوران لکچر میں نظر ڈال لیتے تھے ۔ حقیقت تو یوں ہے کہ جس شخص نے مسلمانوں کی تاریخ پڑھی ہو وہ مولانا کی وقت نظر کی داد دے سکتا ہے ۔ زبان کی فصاحت اور شیرینی، سلسلۂ سخن کا ربط و ضبط، واقعات و دلائل سے ہر بات کا ثبوت، متانت اور سنجیدگی کے ساتھ الفاظ کی بے تکان روانی ۔ غرض ان تمام باتوں نے مل جل کر ایسا دلگیر سماں باندھا تھا کہ جسکی کیفیت نہ زبان سے کہی جا سکتی ہے اور نہ قلم اسکو لکھ سکتا ہے ۔ البتہ جنہوں نے سنا وہی اسکے اصل مزے سے واقف ہو گئے ۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں شورٹ ہینڈ کا قاعدہ نہیں اسلئے اسپیچوں کے لکھنے میں اتنی زحمتیں اٹھانی پڑتی ہیں کہ ان سے دوسرا شخص اسوقت تک آگاہ نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ اس کام کو خود نہ کرے ۔ ہمنے نہایت کوشش اس امر کی کی کہ مولانا کے لکچر کو جہاں تک ممکن ہو تمام و کمال قلمبند کریں لیکن لکھنے اور بولنے میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ بہرحال جہانتک ممکن ہوا انکے لفظوں کو چھوٹنے نہیں دیا ۔ اور جس قدر لکھا گیا خیال اور اُمید سے زیادہ ۔ پھر بھی نقل اور اصل کا فرق ہے ۔ اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو چیز ہمنے دیکھی وہ اس کوشش پر بھی دوسروں کو دیکھنے کو نہ ملے گی ۔"[1]

تبصرہ | سنہ ۱۹۴۱ء میں دارالمصنفین نے مولانا کے خطبات کا مجموعہ شائع کیا جو ایک سو چونسٹھ (۱۶۴) صفحات پر مشتمل ہے ۔ اور جنمیں

---

[1] روئداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰ دسمبر و ۱، ۲، ۳، ۴ جنوری سنہ ۱۹۰۲ء بمقام بمبئی مرتبہ محسن الملک : صفحہ ۲۶۳ – ۲۷۵

www.urduchannel.in

ان کی پندرہ تقریریں درج ہیں۔ یہ تقریریں حسب ذیل عنوانات پر ہیں :۔

اورنگ زیب قاسمی

(۱) چھوٹے کم درجہ اسکولوں کا قیام (۲) اسلامی علوم وفنون کی تاریخی ترتیب
(۳) ایجوکیشنل کانفرنس کی سالانہ رپورٹ پر ریمارک (۴) قدیم عربی نصاب کے نقائص
(۵) علماء کے فرائض (۶) مجوزہ دار العلوم
(۷) شاہ امانت اللہ غازیپوری کی وفات (۸) اسکولوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام
(۹) قدیم وجدید تعلیم (۱۰) تعصب اور اسلام
(۱۱) سنگ بنیاد دار العلوم (۱۲) ندوۃ العلماء کی ضرورت
(۱۳) تحفظ اسلام (۱۴) تحفظ مذہب (۱۵) اسلام کی بہترین جمہوریت

یہ مجموعہ نامکمل ہے۔ مولانا عبد السلام ندوی نے دیباچہ میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ مولانا نہ کبھی لکچر لکھ کر پڑھتے تھے اور نہ کبھی فرمائشوں پر لکھ کر بھیجتے تھے۔ یہ تقریریں جو اس مجموعہ میں شامل ہیں مکمل تقریریں نہیں کہی جا سکتیں۔ کیونکہ انہیں نہ تو الفاظ ہی اپنی اصلی جگہ پر قائم رہے اور نہ جملے۔ مختصر نویسوں نے دوران تقریر میں انھیں جسطرح قلم بند کر دیا کر دیا۔ مولانا نے انہیں دوبارہ دیکھنے اور لکھنے کی زحمت نہیں اٹھائی۔ مختصر نویسوں کی دست اندازی کے بعد تقریر کا اپنی اصلی صورت پر قائم رہنا ممکن نہیں۔ اس میں مطالب تو آجاتے ہیں مگر روح جو اصل چیز ہے نہیں آتی۔ ان تقریروں کو مردہ قالب سمجھئے۔ کاش ان میں زندگی ہوتی۔ نواب محسن الملک ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

" اگر افسوس ہے تو اسکا کہ مولانا شبلی نہ لکچر لکھ کر لاتے ہیں اور نہ بعد اجلاس کے اُسے لکھ کر بھیجتے ہیں۔ یہ پورا پورا کے نوٹوں سے معمولی اسپیچیں تیار ہو سکتی ہیں لیکن کسی علمی لکچر کا تمام وکمال لکھا جانا ناممکن ہے۔ لہٰذا لکچر و نمبر وہ خوبی تو پیدا نہیں ہو سکتی تاہم متفرق نوٹوں اور یادداشتوں سے اس قسم کی تمام تقریریں قلمبند کیجاتی ہیں۔ مگر نوٹوں کے ذریعہ سے لکچر مرتب کرنے کے چونکہ مولانا موصوف سختی کے ساتھ مخالف ہیں اور وہ ہمکو لکھ بھیجے کہ اُن کا لکچر نہ تیار کیا جائے۔ لہٰذا مجبوراً قلم انداز کیا جاتا ہے " [۱]

مولانا کا اپنی تقریروں کے بارے میں جو رویّہ تھا اُسنے ہم کو اُن کی بہت سی ایسی تقریروں سے محروم کر دیا جو یقیناً آج نہ صرف ہماری معلومات میں اضافہ کرتیں بلکہ ہمارے لئے ایک قابل تقلید نمونہ ہوتیں۔ یہ تقریریں

---

[۱] روئداد محمدن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۰۳ء : ص ۲۶۰-۲۶۱

www.urduchannel.in

تو ایک طرف انکے بکھرے ہوئے اجزا بھی آج ہم کو اپنی اصلی حالت میں نہیں ملتے۔

اورنگ زیب قاسمی

مولانا جس ترتیب تسلسل و دلائل اور براہین کے ساتھ لکھتے تھے اسی طرح بولتے بھی تھے۔ ان کی وسعت نظر، اُن کی ٹھوس معلومات، اُن کی تحقیق و تدقیق، ان کی نکتہ سنجی و دقیقہ رسی، کے بہترین نمونے نہ صرف ان کی تحریروں کی نمایاں خصوصیتیں ہیں بلکہ یہی چیزیں ان کی تقریروں میں بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کے تیرھویں اجلاس بمقام کلکتہ منعقدہ ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۸۹۹ء میں یہ ریزولیوشن تھا۔ "اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ بی۔اے کی ڈگری کے لئے فارسی کا بطور اختیاری مضمون کے قائم رہنا پسندیدہ امر ہے اور یہ کہ جو نصاب تعلیم ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مروج ہے اس میں اصلاح اور ترقی کی گنجائش ہے۔"

اس ریزولیوشن کی تائید میں مولانا نے ایک دھواں دار تقریر کی تھی جس کے متعلق نواب محسن الملک لکھتے ہیں:-

> "...... شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی نے نہایت مدلل اور پر معنی تقریر کی۔ جسکو ہر آدمی نے نہایت غور سے سنا۔ مولانا کی تقریر لمبی اور نہایت سلیس اور باترتیب تھی۔ اور واقعات اور دلائل سے بھری ہوئی تھی۔ تمام حاضرین تعجب کرتے تھے کہ مولانا شبلی کو خدا نے ایسا ملکہ دیا ہے کہ ایسے مشکل مسئلہ پر زبانی تقریر ایسی سلاست اور فصاحت سے کر رہے ہیں کہ تحریر میں بھی اس کا ادا کرنا لوگوں کو مشکل ہے ......" [۱]

اور پھر آخر میں نواب صاحب نے لکھا ہے کہ یہ تقریر بھی اور تقریروں کی طرح پوری نہ لکھی جا سکی اور نہ باوجود پیہم تقاضوں کے مولانا نے لکھ کر دی۔

زیر نظر مجموعہ میں بعض تقریریں نامکمل ہیں جن پر صحیح طور پر اظہار خیال نہیں کیا جا سکتا۔

۱؎ روئیداد اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۸۹۹ء بمقام کلکتہ۔

"روئیداد" غلط ہے، "رویداد" یا "روئداد"

www.urduchannel.in

لکھے اور پڑھے گئے مولانا کی شاعری کے صرف ایک پہلو کو اجاگر کرتے ہیں ۔ اور ان میں مولانا کی صرف اردو شاعری سے بحث کی گئی ہے ۔ فارسی شاعری کا ذکر اگر آبھی گیا ہے تو ضمنی اور سرسری طور پر۔ اسلئے مولانا کی شاعری پر تفصیلی بحث کی ضرورت باقی ہے ۔

اورنگ زیب قاسمی

ہندوستان میں فارسی شاعری کا رواج

سرزمین ہند پر فارسی شاعری کا آغاز شہنشاہ بابر کی آمد کے ساتھ ہوا خاندان تیموریہ کی قدردانیاں اور فیاضیاں ایران کے شعرا کو اپنی طرف کھینچ لگیں ۔ آتشی قندھاری جس نے بعد میں شاہنامہ ہمایونی لکھکر بیش بہا صلہ حاصل کیا بابر ہی کے ساتھ ہندوستان آیا تھا ۔ اسکے بعد اکبر اعظم نے اپنے دور میں وہ فیاضیاں دکھائیں کہ ایران کے گوشہ گوشہ کے شعراء (ہندوستان میں) امنڈ آئے ۔ آئین اکبری میں ابو الفضل نے شعراء اکبری کی جو فہرست دی ہے وہ تمام و کمال درج کی جاتی ہے :-

"حکیم سنائی، غزالی، عرفی، نظیری نیشاپوری، حزنی اصفہانی، قاسم کاہی، ہیلی ہروی، جعفر بیگ قزوینی، خواجہ حسن مروی، حیاتی گیلانی، شکیبی صفاہانی، انیسی شاملو، صالحی ہروی، محوی ہمدانی، صرفی ساوجی، قراری گیلانی، عتابی نجفی، ملا صوفی مازندانی، جدائی مریزی، وقوعی نیشاپوری، خسروی قائینی، وفائی صفاہانی، شیخ ساقی، رفیعی کاشانی، غیرتی شیرازی، حالتی، سنجر کاشی، جذبی، تشبیہی کاشی، اشکی قمی، اسیری رازی، فہمی رازی، قیدی شیرازی، پیروی ساجی، کامی سبزاوری، پیامی، سید محمد ہروی، قدسی کربلائی، حیدری تبریزی، ساری، فریبی نشاپوری، فسونی شیرازی، نادری ترشیزی، نوعی مشہدی، غیوری حصاری، قاسمی مازندرانی، امی نیشاپوری" [1]

اس فہرست میں ان شعراء کے نام نہیں ہیں جن کی رسائی کسی وجہ سے دربار تک نہ ہو سکی ۔ جہانگیر نے بھی اپنے فطری مذاق سخن کی بنا پر شعراء کی قدر و منزلت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ۔ غرض :

"ان سلاطین کے دربار میں شعر و شاعری کو جو ترقی ہوئی وہ صرف اسلئے نہ تھی کہ شاعری سے دولت ہاتھ آتی بلکہ زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ یہ سلاطین خود موزوں طبع تھے ۔ اچھے برے کی تمیز رکھتے تھے موقع بہ موقع شعرا کو ٹوکتے رہتے تھے ۔ ان کو صحیح داد دیتے تھے اسلئے ان کے دربار حقیقت میں شاعری کی تعلیم گاہ تھے" [2]

---

[1] شعر العجم حصہ سوم ص ۵ مطبع معارف اعظم گڈھ

[2] شعر العجم حصہ سوم ص ۹ مطبع معارف اعظم گڈھ

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

ان سلاطین کی فیاضیوں کے ساتھ ساتھ ان کی نکتہ رسی اور سخن سنجی نے شعرا کے مذاق سخن کو بلند سے بلند کر دیا۔ ہر شاعر کی کوشش رہتی تھی کہ وہ اپنے حریف سے بڑھ جائے اور بادشاہ کی نگاہوں میں عزت حاصل کرے۔ رشک کے اس جذبہ نے شاعری کی ترقی میں "عطیات کی آرزو" سے کہیں زیادہ کام کیا۔ ترقی کی ایک دوسری وجہ اور بھی پیدا ہو گئی یعنی مشاعرہ کا رواج ہو گیا۔

فارسی شاعری کے اس دور میں مختلف اصناف کو ترقی ہوئی۔ غزل میں واقعہ گوئی یا معاملہ بندی کا زور رہا۔ وحشی یزدی، علی قلی میلی، اور علی نقی کمرہ نے اس میں بڑا کمال پیدا کیا اور آگے چل کر واسوخت کی بنیاد ڈالی۔ عرفی نے غزل میں فلسفہ کی آمیزش کی لیکن اس کے ہمعصروں اور بعد کے شعرا نے اس طرز کو پسند نہیں کیا۔ مثالیہ شاعری کلیم سے شروع ہو کر علی قلی سلیم، مرزا صائب اور غنی کو ملی۔ یہی ورثہ اردو شعراء تک پہونچا۔ چنانچہ سودا۔ ناسخ اور غالب کی مثالیہ شاعری کا سلسلہ یہیں سے ملتا ہے۔ نظیری، شفائی اور علی نقی نے مجموعی طور پر تغزل کا پایہ بلند کیا۔ جلال اسیر اور ناصر علی نے خیال بندی اور مضمون آفرینی کی طرح ڈالی۔

یہ بھی صحیح نہیں | قصیدے میں عرفی اور ظہوری صاحب کمال ہوئے۔ ان لوگوں نے اکثر شاعری کی بنیاد "الفاظ" اور "صنعت ایہام" پر رکھی۔ استعارات کی نزاکت اور جدت تشبیہ ان کی خصوصیت ہے۔ الفاظ کی نئی تراشیں اور نئی نئی ترکیبیں کثرت سے پیدا ہوئیں۔ علاوہ ان دو کے باقی اور اصناف میں ان شعراء کا کوئی نمایاں کارنامہ نہیں۔ آخری دور میں صائب اور بیدل کی یادگار غالب ملتے ہیں لیکن فارسی زبان کی سرپرستی مغلوں کے ساتھ ختم ہو گئی جب قدردان ہی باقی نہ رہے تو شاعر کہاں رہتے۔ چنانچہ غالب کے علاوہ کوئی اور ایسا ہندی نژاد فارسی گو شاعر نظر نہیں آتا جس کا کلام فارسی میں اہل زبان کے لئے سند ہو۔ زمانۂ حال میں البتہ علامہ اقبال مرحوم نے اس طرف توجہ دی مگر ان کا زمانہ شبلی کے بعد کا ہے اسلئے اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

مولانا کی فارسی شاعری | مولانا کے فارسی کلام کے کئی مجموعے کلیات شبلی۔ دستۂ گل۔ بوئے گل اور برگ گل جن میں قصیدے، مرثیئے، غزلیں، قطعات اور مثنویاں جملہ اصناف سخن میں طبع ہو کر ارباب ذوق

---

[1] ان تمام مجموعوں اور ان کے اور ان کے متفرق اشعار و قصائد کو ملا کر ایک مکمل مجموعہ ان کی فارسی شاعری کا دار المصنفین نے "کلیات شبلی فارسی" کے نام سے شایع کر دیا ہے جس میں وہ عام کلام بھی آگیا ہے جو ان کے اکثر خطوط میں جابجا ملتا ہے۔ مگر یہ بھی نامکمل ہے۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

کی نگاہوں کے سامنے آچکے ہیں مگر علامہ کے چند گہرہائے گرانمایہ ایسے بھی ہیں جو نہ جانے کیوں ان لڑیوں میں پروئے نہ جا سکے ان میں ایک تو وہ ہزارہ واسوخت ہے جو علیگڈھ میں لکھا گیا تھا اور جس کو مولانا فاروق صاحب نے بہت پسند کیا تھا[1]۔ اس کے علاوہ انہوں نے بعض تاریخی مادے بھی نکالے ہیں لیکن وہ دیوان میں شامل نہیں البتہ مکاتیب میں ملتے ہیں:-

(۱)
چو راجندر پرشاد در خاک خفت — کہ غافل ز پیچ و خم مرگ بود
مرا بود سرمایۂ زندگی — وفا با منش تا دم مرگ بود
جہانے بہ مرگش غمیں شد ببیں — کہ ہم سال مرگش غم مرگ بود
سنہ ۱۳۱۳ھ [2]

(۲)
آں گراں پایہ یار من راجندر — از جہاں رفت و زیر خاک نہفت
خویشتن از میاں رمید مرا — خان و مان شکیب پاک برفت
چارہ چوں نیست جز شکیبائی — خود چہ آید کنوں گفت و شنفت
از سر وصل او تواں بگذشت — گر چہ ایں حرف خود نیارم گفت
وانگہے سال مرگ او گفتم — کافتابی بہ زیر خاک نہفت [3]

(۳)
مرحبا مرحبا ہمو بود — کہ بود بادۂ ایاغ کمال
باز در پیشگاہِ بزم وجود — گفت روشن از او فراغ کمال
سال تاریخ را چو امر نمود — گفت شبلی بہار باغ کمال [4]

(شاید "زہے (؟) مولود" ہو۔ یوں تو مصرع ناموزوں ہے۔)

---

[1] مکاتب شبلی، حصہ اوّل طبع دوم۔ ص ۷۲۔

[2] مکاتیب شبلی جلد اوّل طبع دوم ص ۵۷۔

[3] مکاتیب شبلی جلد اوّل طبع دوم ص ۵۸۔

[4] مکاتیب شبلی جلد اوّل طبع دوم ص ۷۴

www.urduchannel.in

قصیدہ عرب کی شاعری جب بالعموم مدحیہ قصائد تک محدود تھی اور تگ و تاز یک قافیہ تھی اس وقت ایران میں شاعری کا آغاز ہوا ۔ یہی وجہ ہوئی کہ ایرانی شعراء نے عربی قصائد کو سامنے رکھ کر ادھا دھند ان کی تقلید شروع کر دی ۔ عرب ممدوح کی انہیں خصوصیات [کا] ذکر کرتے تھے جو دراصل ان میں موجود ہوتی تھیں مگر عجمیوں نے مالی فائدے کو مدنظر رکھتے ہوئے مبالغہ کی رو میں اس کی بھی پروا نہ کی اور وہ کچھ کہہ ڈالا جو مافوق الفطرت ہی نہیں بلکہ بعید از قیاس بھی ہے مثلاً :-

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے ۔ تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

مگر شبلی کی جمعیت نے اس رنگ کو گوارا نہ کیا ۔ انہوں نے اپنے قصائد میں نہ جھوٹ کو اپنا کوئی شعار بنایا اور نہ ان لوازمات کی پیروی کی جن کو ایرانی شعراء نے قصیدہ کا "معیار حسن" قرار دیا تھا ۔

مولانا ابتدا ہی سے قصیدہ کہتے تھے جس زمانے میں وہ ایک امین کی حیثیت سے کام کر رہے تھے انہوں نے سلطان عبد الحمید خاں کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا اس میں مولانا نے ایک سائل فرض کیا ہے اور اس کے ذریعہ سے اپنے درد و غم کی داستان حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائی ہے ۔ اس کے علاوہ ایک اور قصیدہ سلطان عبد المجید کی شان میں لکھا ہے جس کی تشبیب کا ایک شعر ہے ؎

ہاں دگر فصل بہار آمد و آراستہ شد

بزم عیشے کہ درونیست جز از بادہ سخن

اس وقت تک مولانا کے قصائد کا طرز قدیم کہا جا سکتا ہے ۔ مگر جب مولانا علی گڈھ تشریف لے گئے وہاں لوگوں سے جان پہچان بڑھی ۔ محبت و خلوص کے رشتے قائم ہوئے تو دوستوں نے اس قدیم رنگ کو ترک کرنے پر مجبور کیا چنانچہ مولانا خود لکھتے ہیں :-

فرحت آں برگزیدۂ احباب

گفت روزے بمن ز روئے عتاب

کے بہ بیجا حیلے بسر بردہ

ہرزہ خون دل و جگر خوردہ

تا چہ خواہی ز شاعری یعنی

چند ازیں ترہات بے معنی

داستانہائے پاستاں تا چند

شکوۂ جور آسماں تا چند [۱]

---

[۱] کلیات شبلی فارسی ص ۵۱ مطبع معارف اعظم گڈھ

www.urduchannel.in

اور پھر جب ان لوگوں نے بار بار اصرار کیا تو مولانا بھی ان کی [illegible] سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ فرماتے ہیں :-

اورنگ زیب قاسمی

سخن او کہ متصل می رفت
از رہ گوش سوئے دل می رفت

گفتہ اش را بجاں پسندیدم
او گہر می فشاند و من چیدم

خواہم اکنوں عناں بگردانم
رسم پیشینیاں بگردانم

زیں بساط کہن چو برخیزم
پیکرے تازہ بر انگیزم

رسم دیرانہ را بر اندازم
در سخن طرح دیگر اندازم [1]

اب مولانا کی شاعری کا دوسرا ہی رنگ تھا۔ کالج چھوڑنے کے بعد اگرچہ مولانا کے تعلقات اسلامی ریاستوں سے قائم ہوئے اور انہیں سے سابقہ پڑا پھر بھی انہوں نے مداحی کو ہمیشہ اپنی شان سے فروتر سمجھا۔ موجودہ حضور نظام ولیعہدی کے زمانے میں ایک بار بندوق کے صدمے سے بچ گئے تھے جس کی خوشی میں نواب مدار المہام کی طرف سے ایک بہت بڑا جلسہ کیا گیا اس میں عمائد ریاست کے اصرار سے مولانا نے ایک قصیدہ پڑھا تھا۔ ایسے مسرت کے موقع پر بھی ان کی خودداری نے انہیں ایسی بات کی اجازت نہ دی کہ وہ اس سے فائدہ اٹھانا تو درکنار اس کا خیال بھی دل میں لاتے۔ ۱۹۰۸ء میں ندوۃ العلماء کے کسی جلسے میں مولانا نے ایک ترکیب بند پڑھا تھا اس کے آخری دو شعر ان کی مستغنی فطرت کی طرف اشارہ کرتے ہیں :-

شبلیا وقت دعا شد قلم از دست بنہ
آہ پر سوز و دل آغشتہ بخوں می باید

ما نہ آنیم کہ جاہ و حشمے می خواہیم
داورا! از تو نگاہ کرمے می خواہیم

---

[1] کلیات شبلی فارسی ص ۵۲ - مطبع معارف اعظم گڑھ

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

سرکار عالیہ بھوپال نے جب ندوہ کے لئے دوسو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر فرما کر اسکے شکریہ کے لئے رفاہِ ان کلب میں ایک جلسہ منعقد ہوا اس میں مولانا نے ایک مدحیہ قصیدہ پڑھا تھا گو یہ قصیدہ خود سرکار عالیہ کے سامنے پڑھا گیا تھا پھر بھی آخر میں مولانا نے یہ معذرت کر دی تھی :-

شبلیٔ غمزدہ را مدح شہان شیوہ نبود
لیک لطفت ہمہ را بندۂ احسان کرد است

یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ دوسو روپے ماہوار کا یہ عطیہ خود مولانا کے لئے نہ تھا بلکہ ندوہ کے لئے تھا پھر بھی مولانا اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے یہ شعر کہے بغیر نہ رہ سکے۔ بہر حال مولانا کی قصیدہ گوئی کا مقصد اور طرز دونوں شعرائے فارسی کے قصائد سے بالکل مختلف ہیں۔ انہوں نے قصیدہ گوئی میں بھی اپنی فطری اُپج سے کام لیا ہے۔ اور جو باتیں اور قصیدہ گویوں کے نزدیک "نقش ونگار قصیدہ" تھیں ان سے بھی بڑی حد تک پرہیز کیا ہے۔ تشبیب جو گویا قصیدہ کی بسم اللہ اور جان سمجھی جاتی ہے مولانا کے یہاں بالکل نہیں پائی جاتی۔ وہ ابتدا ہی سے حرف مطلب کو شروع کر دیتے ہیں اور بلا کسی تمہید کے جو کچھ انہیں کہنا ہوتا ہے کہنا شروع کر دیتے ہیں یا پھر خود نفس واقعہ سے تشبیب کا کام لیتے ہیں۔ سرکار عالیہ بھوپال کی مدح میں جو قصیدہ ہے اس کا آغاز دیکھئے

آنچہ با دشت وچمن ابر بہاراں کردہ است
خسرو کشور بھوپال بہ ما آں کردہ است

ندوہ را گر سر و ساماں رسد از وے چہ عجب
زاں کہ ہر کار کہ او کرد بہ ساماں کردہ است

چوں نگہ کرد کہ دین نبوی در خطر است
لاجرم یاوریٔ سنت و قرآں کردہ است

رایت علم نگوں بودہ وافراشتہ است
چہرۂ شرع حزیں بودہ وخنداں کردہ است

تخیل

مدح ودعا میں ہمارے شعراء اپنی تخیل کی انتہائی حدوں تک پرواز کرتے ہوئے زمین وآسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ الفاظ کا سارا زور اور شاعری کی پوری قوت اسی مقصد پر صرف کر دیتے ہیں اور پھر فخر کے ساتھ یہ کہکر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ؏ "شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم"

www.urduchannel.in

لیکن مولانا مدح میں کم سے کم اشعار کہتے ہیں اور ممدوح کی جو واقعی صفات ہوتی ہیں انہیں کا ذکر اور انہیں کی تعریف کرتے ہیں۔ شعرائے عرب کی طرح ان کا بھی یہی مسلک تھا کہ ممدوح میں جو واقعی صفات ہوں انہیں منظر عام پر لایا جائے اور جو نہ ہوں اُن سے گریز کیا جائے۔

مولانا کے اکثر قصائد، واقعات پر مشتمل ہیں لیکن ان واقعات میں وہ اسقدر ترتیب و تسلسل پیدا کر دیتے ہیں کہ ان میں نہ صرف منافرت و بیگانگی کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہتا بلکہ وہ سب مل کر سلسلے کی ایک کڑی بن جاتے ہیں۔

حساس طبایع کا خاصہ ہے کہ وہ ماحول کے خفیف سے خفیف اثرات سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں چہ جائیکہ مولانا جیسی حساس طبیعت کا آدمی جس کا اندازہ شیروانی صاحب کے مضمون کے اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جو موصوف نے مولانا کی وفات پر لکھا تھا :-

"احساس بہت شدید تھا اس لئے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے۔
سنہ ۱۹۰۵ء میں کانفرنس کے ایک اجلاس کے زمانہ میں وہ اور میں ایک مقام پر
مقیم تھے۔ ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے ان کے پاؤں پر ڈنک مار دیا
اس قدر بیتاب ہوئے کہ مجھے حیرت ہوگئی۔ اسقدر زمانہ گزرنے پر
آج تک اُس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے"۔ ؎

جب شدت احساس کا یہ عالم ہو تو کیسے ممکن تھا کہ مولانا کی زبان و قلم سے نکلے ہوئے الفاظ ان تاثرات سے خالی ہوتے جن کا اس زمانے اور اس ماحول میں پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ شبلی نے جس سیاسی، ذہنی اور معاشرتی خلفشار میں جنم لیا اس کا کچھ ذکر سطور بالا میں گذرا ہے۔ اسلئے ان کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے قصائد زیادہ تر قومی ہیں جن میں ذاتی اغراض و مقاصد کا کہیں شائبہ تک نہیں ملتا اور ان میں انہیں جذبات کا اظہار ہے جو واقعی ان کے دل کی انتہائی گہرائیوں سے نکل کر نظم کے سانچے میں ڈھلتے چلے گئے ہیں اسی لئے ان کے قصائد میں جو جوش پایا جاتا ہے اس کی نظیر اور شعراء فارسی کے کلام میں بہت کم ملے گی۔

مولانا کے قصائد میں تشبیہات اگرچہ نہایت سادہ اور قریب الماخذ ہوتی ہیں لیکن اُن سادہ

؎ ۔۔۔

www.urduchannel.in

تشبیہات میں وہ اپنی جدت طبع سے ایسی اورنگ زیب اکرقاسیمی پیتےہیں جس سے ان میں ایک خاص لطف پیدا ہوجاتا ہے فارسی شعراء کے قصائد کے دفتر الٹ ڈالئے مگر آپ کو شاید ہی کہیں حقیقی جذبات کی ترجمانی ملے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شعراء نے اسے صرف روزی کمانے، اپنی قوت تحریر و تخیل دکھانے اور اپنی لیاقت وقابلیت کا دوسروں پر سکہ جمانے کے لئے زیادہ تر استعمال کیا ہے۔ قصائد میں سچے اور دلی جذبات کے فقدان ہی نے غالباً مصنف "خاقانی ہند" سے یہ جملہ لکھوا دیا:۔

" اگر شاعری واقعی زندگی کی تنقید ہے تو قصائد کو
شعریت کے دعوئی سے دست بردار ہو جانا چاہئے" ؎

کیا شعریت کے دعوے سے دست برداری شبلی کے قصائد پر بھی لازم آتی ہے جس کی پرواز تخیل نے اصلیت اور حقیقت کا دامن کبھی اور کسی صورت میں بھی اپنے ہاتھوں سے نہ دیا؟

غزل

مولانا کی شاعری اکتسابی نہیں فطرتی تھی۔ خوش قسمتی سے آنکھ کھولتے ہی ان کو علمی او ادبی ماحول ملا۔ جن ہاتھوں نے پرورش کی اور پروان چڑھایا وہ صرف پڑھے لکھے ہی نہیں تھے بلکہ صاحب ذوق اور سخن سنج بھی تھے۔ مولانا خود لکھتے ہیں:۔

"فطری" بہتر ہوگا۔

"بھی" یہاں زائد ہے۔

" میری طالب علمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا:۔

سر پستاں چو دہد جلوۂ یغمائی را
اوّل از سرو کند جامۂ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے میں نے کہا کپڑے اتارنے کو "جامہ کشیدن" بھی کہتے ہیں اسلئے شاعر اگر 'کند' کے بجائے 'کشد' کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا۔ "جامہ کندن" گو صحیح ہے لیکن فصیح نہیں۔ سب چپ ہو گئے والد نے ذرا سوچ کر کہا کہ نہیں یہی لفظ 'کند' شعر کی جان ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں غارتگری کی شان دکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اتار لیتا ہے۔ لباس اتارنے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑے اتار کر رکھ دے یا اس کا نوکر اتار لے۔ دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اتروا لئے جائیں۔ فارسی میں اس کے لئے دو مختلف لفظ ہیں "جامہ کشیدن" اور "جامہ کندن" چونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق ذلت کے طور پر سرو کا کپڑا اتار لیتا ہے

؎ خاقانی ہند مصنفہ میاں محمد رفیق۔

www.urduchannel.in

اس لئے یہاں جامہ کشیدن سے
زیادہ موزوں ہے۔ تمام حاضرین نے اس توجیہہ کی بیساختہ
تحسین کی"۔ [1]

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا کے والد کس حد تک دقیقہ سنج تھے اور فارسی زبان پران کی نگاہ کس قدر گہری تھی۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ایسے شخص کے دامن تربیت میں پلا ہو اس کا مذاق سخن کس قدر نکھرا ہوا ہوگا۔ پھر مولانا کو مولانا فیض الحسن اور مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی جیسے یگانۂ روزگار اساتذہ میسر آئے جنہوں نے ان کے فطری مذاق سخن کو اور جلا دیدی۔ مولانا کو اپنے کلام کی اصلاح کے لئے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا نہیں پڑا جیسا کہ ان کے اس خط سے جو انہوں نے اڈیٹر 'الناظر' لکھنؤ کو لکھا تھا معلوم ہوتا ہے:-

"جناب اڈیٹر صاحب زاد لطفہٗ آپ نے اپنے پرچے میں لکھا ہے کہ
میں خواجہ عزیز الدین صاحب کا شاگرد ہوں۔ خواجہ صاحب میرے
مخدوم ہیں لیکن میں ان کا شاگرد نہیں۔ میں نہ شاعر ہوں نہ
میں نے کسی شاعر سے اصلاح لی ہے۔ یہ جو کبھی کبھی موزوں کر لیتا
ہوں یہ شاعری نہیں تفریح طبع ہے"۔ [2]

نامناسب نہ ہوگا اگر اس جگہ یہ بھی بیان کر دیا جائے کہ مولانا نے کسی کو اپنا شاگرد بھی نہیں بنایا۔ البتہ شروانی صاحب نے دوستانہ طور پر ان سے کچھ نہ کچھ مشورہ لیا ہے جیسا کہ ان کے متعدد خطوط سے ظاہر ہوتا ہے جن میں سے ایک درج

"..... اب نکتہ چینی کی خدمت ادا کرتا ہوں:-

"خوشم انداز قدِ سرو با در گل نمی آید"

'خوشم' بیچ میں آتا تو اچھا ہوتا 'قد' کا لفظ بھی کچھ ضروری نہیں اس کے
نکلنے سے توالی اضافت کا بار بھی ذرا کم ہوجائے گا۔

"بہ پہلویم رواں آن سرو خوش رفتار بایستی"

"پہلو" میں چلنا ٹھیک نہیں ہے۔ سامنے سے گذرنا چاہئے کیا خوب کہا ہے

گاہ گاہ از نظرم مست و غزلخواں بگذرد
ورنہ بر عہدۂ من نیست کہ رسوا باشم

"بآغوش بتے بودی و با بردار بایستی" 'و' کو اس طرح متحرک لانا قدماء ہی
تک ختم ہوچکا۔ اب جائز نہیں۔ مقطع کا آخر مصرعہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔
والتسلیم۔ شبلی"۔ [3]

"بگذر" یا "گزرد" (؟) "بگذرد" وزن کو بگاڑتا ہے۔

---

[1] شعر العجم جلد چہارم ص - ۱۸ - مطبوعہ معارف۔
[2] مکاتیب شبلی حصہ اول - ص - ۳۴۱ -
[3] مکاتیب شبلی حصہ اول - ص ۱۳۵ -

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

اِصابت

ان خطوط سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی مولانا تفنن طبع کے لئے شعر و شاعری کرتے تھے اور دوسری طرف ان کی سلامتیٔ فکر اور ثابت رائے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ایک اور چیز جو مولانا کے مذاق سلیم پر دلالت کرتی ہے یہ ہے کہ انہوں نے اکثر خود اپنے اشعار کو خفیف سی ردّ و بدل کے بعد زمین سے آسمان تک پہنچا دیا ہے مثلاً ؎

پیکر آرائے ازل طلعت زیبائے ترا
نقش می بست و بروئے تو تماشا می کرد

جو مکاتیب شبلی حصہ دوم کے صفحہ ۲۶ پر درج ہے اور پھر اسی شعر کو کلیات شبلی صفحہ ۴۷ پر دیکھئے لکھتے ہیں:-

پیکر آرائے ازل طلعت زیبائے ترا
نقش می بست و ہم از ذوق تماشا می کرد

غور کیجئے کہ اب شعر ذرا سی تبدیلی کے بعد کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ 'بروئے تو' سے چہرہ مخصوص ہو گیا تھا حالانکہ محبوب کا ایک ایک عضو 'ذوق تماشا' کے لائق تھا۔

مولانا کی غزل گوئی کے تین دور کئے جا سکتے ہیں:-

(۱) پہلا دور — آغاز

(۲) دوسرا دور — دورِ عبوری

(۳) تیسرا دور — دورِ آخر

آغاز اس دور کی غزلوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دل میں کچھ نہیں ہے بسنی سنائی باتیں ہیں جن کو سیدھے سادے الفاظ میں دہرایا جا رہا ہے۔ مثلاً ؎

نگاہے بر من مسکیں خدارا — کہ گاہے شاہ بنوازد گدارا
کجا دربار گاہش بار بخشند — چو تسنیم[۱] غریب بے نوا را

ازبس بہ یاد آں قد رعنا گریستم — ہجو بہ زیر سایۂ طوبیٰ گریستم
عیبے بزرگ تر ز ہنر در زمانہ نیست — شبلی بہ حال مردم دانا گریستم

---

[۱] مولانا پہلے اپنا تخلص 'تسنیم' کرتے تھے بعد میں شبلی کر دیا تھا۔

www.urduchannel.in

اے گل باغ صباحت روئے تو
اورنگ زیب قاسمی

سنبل تر بستۂ گیسوئے تو

سرو در گلشن بہ یکبار ایستاد

بہر تعظیم قد دلجوئے تو

شبلی دل خستہ را دانی کہ کیست

او سگ ہست از سگاں کوئے تو

اس قسم کے اشعار کی زبان اگرچہ نہایت سلیس اور عام فہم ہے مگر خیالات کے اعتبار سے ان میں کوئی گہرائی نہیں ہے۔ مطالب اور انداز کی سادگی قدماء کے دور اول کی یاد دلاتی ہے۔

دور عبوری مولانا کی شاعری کے اس دور میں حیرت انگیز پختگی ملتی ہے۔ اس دور کے کلام کو مولانا کے معاصر فارسی زبان کے مستند شعراء نے اساتذۂ فارسی کلام کے برابر مانا ہے۔ یہ ایک دلچسپ لطیفہ ہے۔ مولانا ہی زبان قلم سے اسے سنئے :-

"چہ کنم" کی ردیف کی غزل پر یہاں ایک لطیفہ ہوا۔ چند لوگوں نے کہا کہ استاد کی غزل پر غزل لکھنی اس سے کیا حاصل ؏

ہمتائے فلک نہ ہوگا بادل

میں نے کہا :-

دریا نہیں کا بند ساقی

غرض "میری" اور علی حزیں کی غزل خواجہ عزیز الدین صاحب عزیزؔ مصنف قیصر نامہ اور نیرؔ دہلوی کے بغرض محاکمہ ارسال کی گئی۔ یہ وہی نیرؔ ہیں جن کو غالب نے لکھا ہے ؎

مجھے تم سے نفرت سہی نیرؔ سے لڑائی

فارسی نہایت عمدہ کہتے ہیں اور غالب کے تلمیذ ارشد ہیں۔ دونوں نے تسلیم کیا کہ اہل زبان کا کلام ہے۔ نیرؔ نے تو بہت تعریف لکھی اور لکھا کہ سلف کے کلام کے ہم پلہ ہے۔ دونوں صاحبوں کا خط میں نے رکھ چھوڑا ہے۔ خط میں یہ نہیں ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ غزلیں کس کی تصنیف ہیں۔ بلکہ اسی لئے دونوں کے مقطع اڑا دئے تھے"[1]

اس دور کے غزلوں میں اگرچہ پختگی، صفائی اور روانی بدرجہ اتم موجود ہے لیکن کوئی خاص جوش اور اثر نہیں پایا جاتا :-

---

[1] مکاتیب شبلی حصہ اول طبع دوم ص ۷۱

www.urduchannel.in

درجلوہ گاہِ حسن دل پارہ پارہ را ... تا بہ چہ عنواں فروختیم
نیمے ازآں بہ نرگسِ مستانہ باختیم ؎ نیمے دگر بہ غمزۂ پنہاں فروختیم

صحبت گلرت بود بہ اغیار کہ امروز
ابروے تو یکبارہ فروریخت شکے را
عرض ہنر از ہر دو جداگانہ تواں خاست
با غمزہ میالا نگہ عربدہ فن را

آیم

ہوش می گفت بہ آں فتنہ گرِ ہوش ربائے
یکرہ از جلوہ بیارام کہ ایرم ہر جائے
غمزہ درکار شد اے حوصلہ ہاں گرم بخیز
ناز ہنگامہ بیاراست۔ تو آئے صبر میائے
جائے راحت نہ بود سینۂ پر سوز اے دل
؟ آسے و در سایۂ مژگانِ ترحم آسائے

خود گرفتم کہ بہ زلفش نہ فروشم دل و دیں
؟ ور لبات برد آں نرگسِ فتاں چہ کنم
جائے کے از دستِ جنوں پردۂ من باشد وگر
ارمغانش نفرستم بگریبان چہ کنم

دورِ آخر اس دور کو مولانا کی غزل گوئی کا حقیقی دور سمجھنا چاہئیے۔ اس دور کے کلام کو ایک تھکے ہوئے دماغ کا نتیجہ ہونا چاہئیے تھا مگر اس کے برعکس اس میں انحطاط کے بجائے غیر معمولی عروج نظر آتا ہے۔ جو شراب عہدِ شباب میں بے کیف تھی وہ پیری میں کیوں اس قدر تیز ہو گئی؟ شاید شاعری کا چراغ بھڑکنے کے لئے صبحِ پیری کا منتظر تھا۔

جذبات کی فراوانی، طبیعت کی روانی، زبان کی لطافت، الفاظ کی دلکشی، ترکیبوں کی چستی،

www.urduchannel.in

مصرعوں اور تخیل کی بلند پروازی کے جو نادر نمونے نظر آتے ہیں وہ اس سے پہلے نہیں ملتے۔ پہلے الفاظ کے حسن پر نگاہ تھی اب معانی کی بلندی اور گہرائی پر نظر ہے۔ پہلے صرف شیشہ رنگین تھا اب شراب بھی رنگین ہوگئی ہے اسلئے وہ رنگ جو پہلے ہلکا دکھائی دیتا تھا اب زیادہ شوخ اور چمکدار ہوگیا ہے۔

گذشتہ دور اور اس دور میں کیوں اتنا نمایاں فرق ہے؟ اس کے وجوہات حسب ذیل ہیں:-

(۱) اس زمانہ میں مولانا شعر العجم کی تالیف کا کام کر رہے تھے اور ان کی نگاہیں فارسی شعراء کے گہر ہائے گرانمایہ کو پرکھنے میں مصروف تھیں۔ اس کے لازمی اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا اور مولانا کے ذوق شاعری کے لئے اس نے تازیانے کا کام کیا۔

(۲) یہی زمانہ تھا جب مولانا ہر سال کچھ دنوں بمبئی جاکر قیام کرتے تھے۔ یہاں کی خوشگوار آب وہوا، دلکش مناظر، حسن وجمال کی فراوانی، اور صحبتہائے رنگیں ایسی چیزیں نہ تھیں جن کا مولانا کے حساس اور شاعر دل پر اثر نہ ہوتا۔ چنانچہ بمبئی کی رنگینیوں اور اس کی دلفریبیوں کو مولانا نے بڑے مزے لے لے کر بیان کیا ہے:-

زذوق طبع شبلی من دراول روز دانستم
کہ در آشوب گاہِ بمبئی در بازد ایماں را

بیا ایں جا کہ ہر سو کارواں در کارواں بینی
بتان آذری را، دلبران شام و ایراں را

گردم از مدحت شیراز و صفاہاں زدہ ام
شرم بادم کہ نواہائے پریشاں زدہ ام

بمبئی بود مرا منزل مقصود محبت
بیش ازیں گام طلب در رہ فرماں زدہ ام

نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را ۔ طراز مسند جمشید و فر تاج خسرو را
بہ ہر سو از ہجوم دلبراں شوخ بے پروا ۔ گذشتن از سر رہ مشکل افتاد است رہرو را

www.urduchannel.in

فغاں از گرمیٔ ہنگامۂ خوبان زردشتی اورنگ زیب ہم آغوشی بمعنی زلف و عارض ظلمت و ضو را

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت ؛ کنارِ آب جوہاٹی و گلگشت اپالو را

یہ "اعترافاتِ تاثر" صرف ان کی غزلیات ہی تک محدود نہیں بلکہ ان کے اکثر خطوط بھی 'بمبئی کی شیفتگی' کے جذبہ سے لبریز نظر آتے ہیں :-

"۔۔۔۔ ۱۹ برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں۔ آدمی ضبط نہیں کرسکتا۔ اپالو یہاں ایک عجیب سیرگاہ ہے اور جوہاٹی اس کا جواب ہے خواجہ حافظ کے مصرعہ کو یوں بدل دیا ہے :-

'کنارِ آب جوہاٹی و گلگشت اپالو را' [۱]

مولانا کی غزل گوئی کے پہلے دو دوروں میں اور اس میں وہی فرق ہے جو 'جگ بیتی' اور 'آپ بیتی' میں ہوا کرتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ پہلے شبلی فن کے سہارے جیتے تھے اب فن شبلی کے سہارے جی رہا ہے۔

شعر العجم کی تالیف و تصنیف کے کلم سے مولانا کی شاعری پر جو اثر پڑا وہ اسقدر غیر محسوس طریقے پر رفتہ رفتہ اور آہستہ آہستہ ہوا کہ مولانا نے اُسے کوئی اہمیت نہیں دی اور کہیں اس کا اعتراف نہیں کیا برخلاف اس کے بمبئی کے قیام کا اثر فوری اور اس قدر زوردار طریقہ پر ہوا کہ مولانا نے بھی اُسے شدت کے ساتھ محسوس کیا۔

بمبئی سے شروانی صاحب کے نام مولانا نے جو خطوط بھیجے ہیں اُن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بمبئی ہی کے قیام کے زمانے میں مولانا نے نسبتاً زیادہ تعداد میں غزلیں لکھیں۔ یہ غزلیں اس قدر زوردار جوش سے لبریز اور رندانہ ہیں کہ معلوم ہوتا ہے حافظ کی شراب دوبارہ کھینچ کر نئے پیمانوں میں آگئی ہے "دستۂ گل" جب مولانا حالی کی نگاہوں سے گذرا جن کی سخن سنجی اور نکتہ آفرینی کا ایک زمانہ قائل ہے) تو وہ لکھتے ہیں :- "۔۔۔۔۔ اول سے آخر تک اس کو دیکھا۔ کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ

---

[۱] مکاتیب شبلی جلد دوم طبع دوم ص ۲۰۷

www.urduchannel.in

اُس شخص کا کلام ہے جس نے "سیرۃ النعمان" "الفاروق"
اور سوانح عمری مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کا ہے
کو ہیں شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی، بھی ملا ہوا
ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ رندی و بیباکی کے مضامین پر مشتمل ہے
ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلبری ہو مگر خیالات کے لحاظ سے یہ
غزلیں اس سے بھی زیادہ گرم ہیں .... مگر 'دستۂ گل' دیکھنے کے
بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں"۔ لے

اس کے بعد جب مولانا نے دوسرا مجموعہ 'بوئے گل' ان کی خدمت میں روانہ کیا تو اس کے جواب میں لکھتے ہیں :-

"مولانا و مشفقا، 'بوئے گل' رسید و بہ ایں بیت حافظ مترنم ساخت ۔

بوئے خوش تو ہر کہ ز باد صبا شنید
از یار آشنا خبر آشنا شنید

------ " ۲ے

لطف سے خالی نہ ہوگا اگر ہم اس جگہ پر مولانا کے اُس خط کو نقل کردیں جو انہوں نے ایم مہدی حسن کے نام لکھا تھا اور جس میں مولانا حالی کی رائے کا تذکرہ کیا ہے :-

"... 'بوئے گل' کی نسبت تمام اہل نظر کی رائے ہے کہ 'دستۂ گل'
اور اس میں جذب و سلوک کا فرق ہے۔ واقعی دونوں کی شان نزول
اسی قدر مختلف ہیں جس قدر دونوں کے جوش و سرمستی میں فرق ہے۔
ایک شعر میں خود یہ راز کھل پڑا ہے :-

یا جگر کاوی آن نشتر مژگاں کم شد
یا کہ خود زخم مرا لذت آزار نماند

لیکن مولانا حالی سب سے مختلف الرائے ہیں۔ وہ "بوئے گل"
کو حال بتاتے ہیں اور 'دستۂ گل' کو قال ع
ببیں تفاوت ..... الخ" ۳ے

واردات عشق مولانا صرف ظاہری حسن وجمال کے دلدادہ نہ تھے بلکہ وہ ایک بڑے نقاد و نکتہ داں بھی تھے اس لئے انہوں نے حسن وعشق کے وہ رازہائے سربستہ فاش کئے ہیں جن پر ایک ہوس پرست

لے - ــــ ــــ ــــ
۲ے - ــــ ــــ ــــ
۳ے - مکاتیب شبلی حصہ دوم - طبع دوم ص - ۲۲۱

www.urduchannel.in

کی نگاہیں بھی نہیں پہنچ سکتیں یہی وجہ ہے کہ ان [illegible] کو وہ قبولِ عام نصیب نہیں ہوا جو ہونا چاہئے تھا لوگ اسے بقدرِ ظرف و استعداد سمجھ سکے۔ نکتہ شناسوں نے اس میں حقیقت ہی حقیقت کا مشاہدہ کیا اور کم نظروں اور بدگمانوں کو مجاز ہی مجاز نظر آیا اور "خطوطِ شبلی کے مخاطب" کو ان کا محبوب سمجھ بیٹھے تاویلات کی دنیا اسقدر وسیع ہے کہ اس کے ذریعہ حقیقت تک پہنچنا بہت مشکل ہے اسلئے اصابتِ رائے، سلامتیٔ طبع، منصف مزاجی، ذہانت اور دیانت کی ضرورت ہے۔ اچھائیوں اور برائیوں کے درمیان صحیح توازن قائم کرنا۔ تاریک اور روشن دونوں پہلوؤں کو ایک آنکھ سے دیکھنا، اپنے احساسات اور جذبات کو فراموش کر دینا یہی ایک سچے اور اچھے تنقید نگار کا کام ہے۔ نقاد کی معراجِ کمال یہ ہے کہ اسکی تحریر یا تقریر میں کہیں بھی خوش اعتقادی یا بداعتقادی کا شائبہ تک نظر نہ آئے۔ اور یہ جوہر خداداد ہوتا ہے۔ تنقید نگار حضرات کی زیادہ تعداد ایسی ہے جن کی تنقیدی تحریروں میں تنقیص یا تعریف، مدح یا ذم کا پہلو زیادہ جھلکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لکھتے وقت زیرِ نظر مبحث کو بھول کر اپنا زورِ قلم دکھانے لگتے ہیں۔

شبلی کے آخری دور کی شاعری کا "غیر معمولی عروج" نہ صرف شعر العجم کی تالیف، بمبئی کے دلچسپ اور روح نواز مناظر، اور وہاں کی خوبصورت اور حسین ترین متحرک قیامتوں کا منت کش تھا، نہ تنہا زہرہ و عطیہ کا فیض بلکہ ان تمام اجزاء کا مشترک فیض تھا۔ اگر شبلی کا ظاہر و باطن یکساں نہ ہوتا تو وہ ہر طبقہ اور ہر گروہ کو خوش رکھ سکتے تھے اور اس طرح انہیں متفقہ طور پر اپنے کلام کی داد ملتی۔ سچ یہ ہے کہ مولانا کی دوررس نگاہیں جہاں اور جس چیز پر پڑتی تھیں گہری پڑتی تھیں۔ حُسن کے ظاہری خط و خال میں بھی اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اپنی ظاہری آب و تاب میں انہیں جذب کر کے اندرونی گہرائیوں کا جائزہ لینے سے باز رکھ سکے۔ وہ حُسن کو صرف حسن کا پرتو سمجھتے تھے حُسن نہیں۔ 'جزو' سے انہوں نے صرف اسقدر سروکار رکھا کہ وہ 'کل' کا 'جزو' ہے اور بس۔ ہاں اگر مجاز کے آئینہ میں حقیقت کا معائنہ کرنا گناہ ہے تو بیشک شبلی سب سے بڑا مجرم قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کو کیا کیجئے :-

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

نمونے کے طور پر چند اشعار درج کئے جاتے ہیں :-

سخن از صومعہ و اہلِ ورع چند کنی
کہ مرا کار بہ آں چشم قدح خوار افتاد

۱۹۱۵ء [illegible]
اور کشش [illegible]
بیوی عطیہ ان ایام
[illegible]
اس عطیہ بیگم نے اقبال کو
خطوط لکھے [illegible] شائع کر
[illegible]
[illegible]
س

www.urduchannel.in

چندے گرہ کشائے خمِ زلف بودہ ام
اورنگ زیب قاسمی

تا رفتہ رفتہ کار بہ بندِ قبا رسید

من شب وصل بہ ایں حیلہ فریبش دادم

کیں سحر نیست، فروغِ رخِ زیبائے تو ہست

اکنوں چہ گومیت کہ بہائے دلم چہ بود

تو خود فراموشی و مرا نیز یاد نیست

دل را بہ ایں فریب تسلی دہم کہ یار

با ما ازاں نہ ساخت کہ زود آشنا نہ بود

رندی و سرمستی

کم ایسے لوگ ہیں جن کا ظاہر و باطن ایک ہو۔ ایک ریاکار، پاکباز اور ایک رند میں صرف اتنا فرق ہے کہ :-

غیر ازیں از رندیٔ من تا بہ تقویٰ فرق نیست

برملا ہم کردم اکنوں آنچہ پنہاں کردہ ام

رندانہ جذبات کی تکمیل کے لئے غیر محدود آزادی کی ضرورت ہے کہ انسان کفر و اسلام دونوں سے آزاد ہو جائے :-

بایہ گذار چہ حد چوں بتے نبود ورے
غیر موزوں

مرچ ایں شادم کہ آخر ہم مسلماں نیستم

لیکن ان باتوں سے پھر بھی عالم ہوش کا اطلاق ہو سکتا ہے بہتر تو یہ ہے کہ انسان "عقل" سے بھی دست کش ہو جائے کیونکہ اس منزل میں عقل سب سے بڑی رکاوٹ ہے :-

خواہید اگر کہ عیش و نشاط فزوں کنید

دیوانہ الیست عقل ز شہر ش بروں کنید

www.urduchannel.in

پیک فرخندہ قدم مژدہ سرا می آید زیب قاسمی
کز سفر یار سفر کردہ ما می آید

رفت از شہر بداں ساں کہ بہاراں ز چمن
آمد آں گونہ کہ در باغ صبا می آید

گوئیا یوسف گم گشتہ بہ کنعاں آمد
یا نگار یمنی سوئے سبا می آید

رفتنش گرچہ بہ کام دل احباب نہ بود
چوں بیامد بہ مراد دل ما می آید

خوئے خوش بہ ہمہ لطف و صفا ہست کہ بود
ہم بداں قاعدۂ مہر و وفا می آید مہر

بجنبید

شعبدہ ہائے دل عشاق بجنبید ز راہ
کز گزندش رسد آزار در تہ پا می آید

مرزند آب بہ خاک سراپش کیں کار
شیوۂ ہست کہ از دیدۂ ما می آید

دیدہ و دل ہمہ دکان تماشا چیدند
کاں تماشا کدۂ حسن و ادا می آید

ابروآں خنجر و گیسوئے فروہشتہ کمند
ترک شوخے است ز صیداں دغا می آید

بوئے جانے کہ مشام دل و جاں تازہ کند
میتواں یافت کزاں بند قبا می آید

ہر کجا می گذرد، عطرفشاں می گذرد
ہر نسیمے کہ ازآں زلف دوتا می آید

آمد و از دل ما صبر و سکوں می طلبید
شاہ بنگر کہ بہ آئین گدا می آید

www.urduchannel.in

"نگہ" میں ہ ملفوظ ہے اور ہمزہ حرف مختفی ہ پر ممکن ہے۔

کار ز اندازہ برائے نگہ شوق گذشت اورنگ زیب قاسمی

روئے بنہفت و بہ آئین حیا می آید

اے دعائے سحر از چرخ فرود آے کنوں

کاں کہ می خواستی او را بدعا می آید

شمائی غمزہ آورد دل و دیں بہ نثار

غیر ازیں چیست کہ از دست گدا می آید

معشوق کے پاس قاصد بھیجتے ہیں اور اس کو پیغام پہنچانے کے تمام طریقے بتاتے ہیں :-

نسیم صبح بیا را اے بہ جاں برساں

پیام بندہ بہ آن خاک آستاں برساں

متاع جاں دہم از بائے مردمی خواہی

وگرنہ لطف بفرما و رائگاں برساں *ہمزہ اور ی نہیں، رایگان چاہیے*

وفور شوق شکیبا نمی تواند شد

روادار درنگ و ہمیں زماں برساں

حدیث شوق نہ چنداں کہ درمیاں گنجد

اگر نہ جملہ تواں، آنچہ می تواں برساں

تصرفے مکن از پیش خود در چیزے

چناں کہ با تو بگویم تو ہمچناں برساں

بگو کہ بر طبق وعدہ ہائے پے در پے

بیا و مرتبہ من بہ آسماں برساں

سلام شوق و تمنا ز بندہ نعمانی

بہ ساکنانِ در او یگاں یگاں برساں

بعض غزلوں میں اگرچہ ہر شعر کے مضامین الگ الگ ہیں لیکن بعض حیثیتوں سے ان میں اتحاد پایا جاتا ہے

www.urduchannel.in

اسلئے وہ بھی مسلسل معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً اس غزل کے تمام اشعار میں زمانۂ گذشتہ کی حسرت آمیز یاد ہے :-

یک سر و صد گونہ سودائے نہانے داشتم
یاد آن روزے کہ من با خود جہانے داشتم

یاد آن روزے کہ دور از ماجراہائے جہاں
ماجرائے با نگارِ نکتہ دانے داشتم

یاد آن روزے کہ پنہاں از حریف بدگماں
آشتی ہائے نہاں با پاسبانے داشتم

یاد آن روزے کہ دست افشاں گزشتم از حرم
از غرور آن کہ من ہم آستانے داشتم

خود تو دانی با جہانم تا چہ خواہد بود کار
من کہ در آغوش خود جان جہانے داشتم

ہیچ باک از گردش گردوں گرانم نبود
کز زمین کوچہ او آسمانے داشتم

یاد آں روزے کہ از ناکردہ کاری ہائے خود
ہم بہ او می گفتم او درد نہانے داشتم

گرچہ حرفے می نیارستم بدو گستاخ گفت
از نگاہِ شوق با او داستانے داشتم

یاد آں روزے کہ من از سادہ لوحی ہائے خود
با عدو می گفتم او راز نہانے داشتم

شبلیا آں جلوۂ نیرنگ ہائے بمبئی
بود تا وقتیکہ من خواب گرانے داشتم

www.urduchannel.in

عـہ یہ خیال کہ مثنوی صرف حسن و عشق یا تاریخی واقعات کے لیے مخصوص ہے، سراسر غلط ہے۔
مثنوی نظم کی ایک صورت کا نام ہے اور اس میں ہر مضمون نظم کیا جاتا رہا ہے۔

www.urduchannel.in

توارد مولانا کی نگاہوں میں فارسی کلام کا پورا ذخیرہ تھا۔ ہر شاعر کے اچھے شعر انہیں حفظ تھے۔ وہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ قدیم اساتذہ کے خیال کو اُسے بہتر طریقے سے ادا کریں۔ اکثر اس کوشش میں کامیاب بھی ہوتے ہیں:-

ساقی بیار بادہ و با مدعی بگو
انکار ما مکن کہ چنیں جام جم نداشت
حافظ

دل را بہ ہر کہ از رہ نمودیم در جہاں
انصاف داد و گفت چنیں جام جم نداشت
شبلی

عاشق و رند و نظر بازم و می گویم فاش
تا بدانی کہ بہ چندیں ہنر آراستہ ام
حافظ

رندی و سیہ کاری، مستی و نظر بازی
زیں گونہ اگر خواہی بسیار ہنر دارم
شبلی

اسے توارد قرار دینا درست نہیں

مثنوی اگر مثنوی کی بحر اور مثنوی کا انداز ہی کسی نظم کو مثنوی کہلانے کا مستحق بنا سکتا ہے تو مولانا کی مثنویات بیشک مثنویاں کہی جا سکتی ہیں ورنہ ان میں نہ حسن و عشق کا افسانہ ہے، نہ تاریخی واقعات نظم کئے گئے ہیں اور نہ ان میں متعدد ابواب و عنوانات ہیں۔ بلکہ جب کوئی ایسا واقعہ پیش آگیا جس کو قصیدے میں نظم نہیں کیا جا سکتا تھا تو مولانا نے اس کو مثنوی کی صورت میں نظم کر دیا۔ تاہم انہیں مثنویات سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر وہ مثنوی کہتے تو کس قدر پُرزور کہتے۔ قسطنطنیہ میں عید کے موقع پر سلطان معظم کا جو جلوس نکلا تھا اور جس سے مولانا بے حد متاثر ہوئے تھے اس کا خاکہ نہایت دلچسپ پیرائے میں کھینچا ہے۔

مرثیہ مولانا کی شاعری میں چونکہ نقالی نہ تھی وہ جو کچھ کہتے تھے دوسروں کے لئے نہیں بلکہ اپنے دل کے جذبات سے متاثر ہو کر کہتے تھے اس لئے وہ دوسروں کا اچھا مرثیہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس میں شاعرانہ محاسن تو ہوتے تھے لیکن تاثیر سے خالی ہوتا تھا۔ ضیاالدین خاں مرحوم کا انہوں نے نہایت پُرجوش مرثیہ لکھا

www.urduchannel.in

جو زورِ بیان کا نہایت بلند نمونہ ہے لیکن تاثیر سے خالی ہے :-

گرمِ ہنگامہ شو اے نالۂ دل ہاں برخیز
از پئے برہمئ عالمِ امکاں برخیز
تو ہم اے آہ جہاں سوز بہ ساماں برخیز
اے جنوں باز بہ تاراجِ خزاں برخیز

چشم خونابہ فشاں خواست چو طوفاں کردن
خوں شو اے دل کہ توانم سر و ساماں کردن

لیکن جب خود ان کا دل کسی صدمہ سے دوچار ہوتا تھا تو پھر ان کا مرثیہ سراپا سوز بن جاتا تھا - اپنے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحٰق صاحب مرحوم کی موت پر انہوں نے جو مرثیہ لکھا ہے اس کا ایک ایک شعر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے لیکن یہ مرثیہ اردو میں ہے ۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

شبلی کی اردو شاعری

تمہید | اردو شاعری چونکہ فارسی شاعری کی مقلد ہے اس لئے اس میں وہ تمام خصوصیات، رجحانات، اور میلانات کارفرما نظر آتے ہیں جن پر ایرانی شاعری کا قصر عالی شان کھڑا ہوا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کسی ملک و قوم کی شاعری کیوں نہ ہو اس کے ابتدائی دور میں فطری عناصر کی بہتات نظر آتی ہے مگر اس کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ عنصر تدریجی طور پر رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک اس کی حیثیت ثانوی ہوکر رہ جاتی ہے اور بعض بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ ان میں فطری عنصر کا نام و نشان تک نہیں۔

رودکی نے فطرت کی آغوش میں اپنی جولانیاں دکھائی ہیں۔ اوحدی جذبات سے کھیلا ہے خواجہ فریدالدین عطار، مولانا روم، عراقی، اور مغربی، نے تصوف کے اسرار و رموز بیان کئے ہیں۔ سعدی خسرو، اور حسن نے اخلاق اور فلسفے کا درس دیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاعری اپنی ارتقائی منزلوں میں نئے نئے اسلوب سے وسعت پیدا کرتی رہتی ہے اردو کی ابتدائی شاعری میں بھی وہی سادگی اور وہی فطری انداز ہے۔ ولی، حاتم، اور آبرو کے یہاں کہیں پیچیدہ خیالات اور مضامین نظر نہیں آئیں گے۔ سادہ جذبات کو سیدھے سادے طریقہ سے نظم کر دیا ہے۔ جس میں نہ کہیں تکلف ہے نہ تصنع مگر جوں جوں آگے بڑھتے جائے نئی نئی چیزیں ملتی جائیں گی۔ درد نے تصوف کو شعری پیکر دیا۔ میر نے واردات قلبی اور حسیات ذہنی کو نظم کے سانچے میں ڈھالا۔ جراءت اور انشاء نے معاملہ بندی کی طرف بے دھڑک قدم اٹھایا۔ غالب نے فلسفہ کو راہ دی، غرض اسی طرح اردو شاعری کا میدان بھی فارسی شاعری کی طرح وسیع سے وسیع ہوتا گیا اخلاق تصوف اور فلسفہ کی آمیزش سے اگرچہ شاعری میں وہ اگلی سی سادگی اور اس کا وہ معصوم حسن باقی نہیں رہا پھر بھی اسے شاعری کا عیب نہیں کہا جاسکتا۔ زبان اور خیالات دونوں ترقی کی مختلف حالتوں سے گذرتے رہتے ہیں۔ ابتداء میں زبان میں صرف بول چال کا سرمایہ ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے اسلوب سیدھا سادا اور عام فہم ہوتا ہے لیکن زمانے کی ترقی کے ساتھ نئے الفاظ، نئے استعارات، نئی تشبیہیں اور نئے اصطلاحات ضروری ہیں جن کا وجود اگر ایک طرف سادگی کو نقصان پہونچاتا رہتا ہے تو دوسری طرف رنگینیوں سے اس نقصان کی تلافی بھی کرتا جاتا ہے۔

یہی حال خیالات کا ہے۔ شروع شروع میں خیالات آسان، سریع الفہم، اور محدود ہوتے ہیں مگر جس قدر انسان ترقی کرتا جاتا ہے۔ ان میں وسعت اور ساتھ ساتھ پیچیدگیاں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں شاعری میں اخلاق، تصوف، اور فلسفہ کی آمیزش درحقیقت اس کی وسعت میں ایک سودمند اضافہ تھا

"جرأت" یا "جرءت"

www.urduchannel.in

مگر آگے چل کر جب 'ریختہ' نے ریختی کی شکل اختیار کی تو اس کی ترقی معکوس ہوگئی یعنی اضافہ ہوا تو حیوانی جذبات کی ترجمانی کا۔ شعراء ایسے کھل کھیلے کہ اخلاق کی علانیہ دھجیاں اڑنے لگیں۔

اس صنف شاعری کی ابتدا سعادت یار خاں رنگین سے ہوئی اور انتہا جان صاحب نے کی۔

اس کے ساتھ شاعری میں ایک اور صنف کا اضافہ ہوا۔ جس کا نام 'ہزل' ہے۔ اس نے شاعری کی رہی سہی آبرو بھی خاک میں ملا دی۔ سچ ہے جب دن بھرتے ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے کسے گمان ہو سکتا تھا کہ اردو کا ایک زبردست انشاء پرداز دنیائے نظم کی کایا پلٹنے کا خواب دیکھے گا اور دوسرا اس کی تعبیر میں ہمہ تن مصروف ہو جائے گا۔ مبارک تھا وہ خواب جو آزاد نے جاگتے میں دیکھا اور اس سے زیادہ مبارک تھی اس کی تعبیر جو خوش فکر حالی نے مسدس کی شکل میں دی۔

شاعروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ جو "ہوتے" ہیں اور دوسرے وہ جو 'بنتے' ہیں۔ جو 'ہوتے' ہیں ان میں پیدائشی طور پر وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو لازمۂ شعر و شاعری ہیں۔ مثلاً حساس دل، موزوں طبیعت، جدت پسندی، وغیرہ یہ چیزیں دماغی نشوونما کیساتھ ساتھ ارتقائی منزلیں طے کرتی رہتی ہیں اور اپنے دور عروج میں شعریت کا جامہ پہن کر کائنات پر محیط ہو جاتی ہیں۔ شاعر کی زندگی کا یہ زمانہ اس کی شاعری کے لئے نہایت خطرناک ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی سچا رہنما مل جائے جو صحیح راستے پر اسے ڈال دے۔

جو 'بنتے' ہیں ان کی معراج کمال صرف نقالی ہوتی ہے۔ وہ کوئی نئی بات 'پیدا' نہیں کر سکتے بلکہ 'پیدا' ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں تو دوسروں کی آنکھوں سے اور سنتے ہیں تو دوسرے کے کانوں سے۔ مولانا کا شمار ان شعراء میں ہے جو 'ہوتے' ہیں جیسا کہ مولانا کے ہم وطن مولوی محبوب الرحمٰن صاحب حکیم مرحوم کے اس تبصرہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے جو موصوف نے مولانا کی شاعری پر لکھا تھا:-

[حکیم نہیں۔ ان کا تخلص "کلیم" ہے]

"منشی خدا بخش صاحب ایک بہت کہن سال بزرگ ہیں اور وہ ایک مدت تک مولانا مرحوم کے پدر بزرگوار کی محرری میں رہ چکے ہیں وہ کہتے تھے کہ مولانا کی عمر نو یا دس سال کی ہوگی اور ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے اسوقت ان کو ایک چادر کی ضرورت پڑی۔ مہربان باپ کے روبرو عرض مطلب میں ہچکچاتے تھے۔ انہوں نے چادر کے حسن طلب

www.urduchannel.in

میں ایک نظم لکھی جس کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

پدر جس کا یوں صاحب تاج ہو
پسر اس کا چادر کو محتاج ہو

...... مولوی محمد عبداللہ صاحب جیراج پوری ..... سند فضیلت لیکر نکلے تو مولانا کے پدر بزرگوار کی نظر انتخاب ان پر پڑی اور مولانا کی تعلیم کے لئے ان کو مقرر کیا۔ اس وقت مولانا کا بالکل بچپن تھا اور ابتدائی کتابیں زیر درس تھیں۔ مولانا عبداللہ صاحب بیان فرماتے ہیں کہ ایک رات کو میں سو رہا تھا۔ قریب ایک بجے کا وقت تھا یک بہ یک میری آنکھ کھل گئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی شبلی ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک قطعہ تاریخ لکھ رہے ہیں۔

مولوی محمد عمر صاحب بزرگان قدیم کی ایک عمدہ یادگار تھے۔ وہ مولانا مرحوم کے ہم خاندان ہونے کے علاوہ ان کے بچپن کے دوست تھے وہ بسبیل تذکرہ ایک روز فرماتے تھے کہ مولانا کو ادبی ذوق بچپن ہی کے زمانے سے تھا۔ اس زمانے میں جب وہ محض مبتدی تھے جب کوئی اچھی نظم دیکھتے تو اس کو پڑھنے کے لئے بیتاب ہو جاتے تھے اور جب کوئی اچھا شعر سنتے تو ان کو وجد آجاتا۔ شعر و سخن کا شوق ان کو ابتدائے سن شعور سے تھا۔ عنفوان شباب کا زمانہ اعظم گڈھ میں بسر ہوا اور اس وقت ہمیشہ بزم مشاعرہ منعقد کرتے تھے اور مشاعرہ کے موقع پر کچھ نہ کچھ ضرور فکر کرتے تھے" ۵۱

حاضر جوابی ایک روز مولانا ننگے سر بیٹھے ہوئے تھے ان کے استاد (مولانا محمد فاروق صاحب) کا گذر ہوا انہوں نے ایک ہلکی سی چپت لگائی اور ہنس کر کہا ع

ہیگا چپت گاہ خلائق یہ سر

مولانا نے برجستہ جواب دیا:- ع

جتنے ہیں سر آئینہ ہے فائق یہ سر ۵۲

---

۵۲ دیباچہ کلیات شبلی ص ۲۔

www.urduchannel.in

اوپر کی دونوں مثالیں مولانا کی رجحان شعری پر دلالت کرتی ہیں اور ان سے ان کی طبیعت کی مناسبت کا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔

جوانی میں لوگ عموماً شعر و سخن کی طرف مائل ہوتے ہیں چنانچہ مولانا کو بھی اس سے دلچسپی تھی اکثر مشاعرہ کی مجلس خود اپنے گھر پر کرتے تھے اور شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ اس زمانہ میں مولانا تسنیم تخلص کرتے تھے مگر بعد میں شبلی کر دیا۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں کہ مولانا نے کسی سے اصلاح نہیں لی البتہ شمشاد لکھنوی جو اس زمانے میں مدرسۂ چشمۂ رحمت میں مدرس تھے اور مولوی محمد فاروق چریاکوٹی کی صحبت ضرور اٹھائی ہے۔ مولانا کی اردو شاعری چار دوروں میں تقسیم کی جاسکتی ہے :-

پہلا دور -	زمانہ قیام اعظم گڈھ ،	۱۸۸۳ء / ۱۳۰۱ھ	
دوسرا دور -	" " علی گدہ ،	۱۸۹۸ء / ۱۳۱۶ھ	
تیسرا دور -	" " حیدرآباد ،	۱۹۰۸ء / ۱۳۲۶ھ	۱۹۰۵
چوتھا دور -	آخری ،	۱۹۱۴ء / ۱۳۳۲ھ	

پہلا دور اس دور کی شاعری کی کل کائنات مولانا کی چند غزلیں، ایک نظم، اور ایک قصیدہ ہے جو سلطان عبد المجید خاں کی مدح میں لکھا گیا تھا۔ تعجب ہے کہ چھبیس ۲۶ برس کی عمر تک انہوں نے صرف اسی قدر شعر کہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اس دور کے کلام کا زیادہ حصہ ضایع ہوگیا۔ جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے ان میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی۔ اسی پرانی طرز کی نقالی ہے۔ ان سے یہ بھی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ آگے بڑھ کر ان کی شاعری کیا رنگ اختیار کرے گی۔ مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں :-

ضعف میں بھی یہ مرے تیر فغاں میں زور ہے
روک لے اس کو کہاں یہ آسماں میں زور ہے

نیست تھی اس کی کمر پر تو نے ثابت کر دیا
واہ وا تسنیم کیا تیرے بیاں میں زور ہے

مولانا نے اگرچہ اردو شاعری کی طرف توجہ کی لیکن غالب کی طرح وہ بھی اسے وقیع نہ سمجھے۔ اس کی وجہ سوا اس کے اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کی نگاہوں کے سامنے غزلوں کے جو نمونے تھے، وہ اتنے بلند تھے کہ انہیں

www.urduchannel.in

دیکھ کر اس میدان میں طبع آزمائی کرنا محض لا حاصل نظر آیا۔ پھر بھی کبھی نہ کبھی، کچھ نہ کچھ کہہ ڈالتے تھے غزل کو چھوڑ کر جب ہم اس دور کے ان کے قصیدے اور پہلی نظم کو دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے اور یہ یقین نہیں آتا کہ یہ نظم و قصیدہ اسی کے قلم سے نکلا ہے جس نے ایسی غزلیں لکھی ہیں۔ قصیدہ کے اچھے اشعار بطور نمونہ پیش ہیں :-

پھر بہار آئی ہے شاداب ہیں پھر دشت و چمن
بن گیا رشک گلستانِ ارم پھر گلشن
شعلہ زن پھر چمنستاں میں ہوئی آتشِ گل
پھر صبا چلتی ہے گلشن میں بچا کر دامن
باغ میں بادِ بہاری کی جو آمد کی ہے دھوم
بہرِ تسلیم ہر اک شاخ کی خم ہے گردن
شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں صبا ہے بدست
وجد میں تال لگاتا ہے ہر اک برگِ چمن

اس قصیدے کے لکھتے وقت غالباً آتش کا وہ قصیدہ مولانا کے سامنے تھا جس کا شعر ہے :- ؎

بکھیاں پھولوں کی تیار کر اے باد سمن
کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن

اس خیال کو اس سے بھی تقویت پہونچتی ہے کہ مولانا کے قصیدے کی زمین بھی وہی ہے جو اس قصیدہ کی ہے۔ بہر حال اس قصیدے کی آن بان، اس کے استعارات و تشبیہات کی نزاکت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اگرچہ یہ مولانا کا نقشِ اولیں ہے پھر بھی اس میں وہ تمام لوازمات اور خصوصیات پائی جاتی ہیں جو قصیدے کی جان سمجھی جاتی ہیں۔ مولانا کی اس دور کی نظم بھی ان کی غزلوں کو دیکھتے ہوئے بہت بلند ہے۔ اس کے بھی چند شعر درج کئے جاتے ہیں :-

لو سنو تیغ و سناں کی داستاں
رایت و طبل و نشاں کی داستاں
پہلوانانِ جہاں کی داستاں
شاہ کے اعزاز و شاں کی داستاں

www.urduchannel.in

حکمرانِ بحر و بر کی فتح ہے
قیصرِ ہندوستاں کی فتح ہے ؎۱

دوسرا دور اس دور کی غزلیں بھی شاید پہلے دور کی غزلوں کی طرح ضایع ہو گئی تھیں۔ اگر مولانا نے انہیں اپنے خطوط کے مضمون پر جگہ نہ دی ہوتی۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی ہر غزل کو اپنے عزیزوں اور دوستوں کو نہ بھیجا ہوگا بلکہ جو خود مولانا کی نظروں میں قابلِ وقعت رہی ہوں گی انہیں کا حوالہ اور انہیں کی نقل بھیجی ہوگی۔ اس لئے ان غزلوں کو اس نظر سے نہ دیکھنا چاہئے کہ یہ مولانا کی پسند کی غزلیں ہیں جنہیں وہ اس قابل سمجھے کہ دوسروں کے پاس بھیجی جائیں۔ مکاتیب میں بھی ان غزلوں کی تعداد چار پانچ سے زیادہ نہیں۔ ان میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے جو قابلِ ذکر ہو۔ مثلاً

کی ذرا دست جنوں نے کوتہی
چاک اگر تا بداماں رہ گیا

حسن چمکا بار کا اب آفتاب
اک چراغ زیرِ داماں رہ گیا

یاد رکھنا دوستو اس بزم میں
آ کے شبلی بھی غزل خواں رہ گیا

پوچھتے کیا ہو جو حالِ شبِ تنہائی تھا
رخصتِ صبر تھی یا ترکِ شکیبائی تھا

شبِ فرقت میں دلِ غمزدہ بھی پاس نہ تھا
وہ بھی کیا رات تھی کیا عالمِ تنہائی تھا

یہ وہ زمانہ ہے جب مولانا علی گڈھ آ چکے ہیں اور شہر کے ایک معمولی کرایہ کے مکان میں اقامت گزیں ہیں۔ پڑوس میں ایک شاعر قیس صاحب رہتے ہیں اور مولانا کی ان کے یہاں آمد و رفت ہے۔ ان حضرات کی وجہ سے یہاں شعر و شاعری کا چرچا ہے۔

؎۱ یہ ایک فرمائشی نظم ہے جو ایک انگریز کی فرمائش پر لکھی گئی۔ یہ نظم ایک شاعر کی انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ ہے جس میں قندھار و کابل کی لڑائی کا ذکر ہے۔ مولانا کو غالباً اس نظم کا اردو ترجمہ بتایا گیا ہوگا جسے انہوں نے نظم کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

www.urduchannel.in

مثنوی صبح امید

چند دنوں کے بعد علی گڈھ کی آب و ہوا نے ان کی شاعری میں نئے برگ و بار پیدا کئے اور انہوں نے غزل کے فرسودہ راستے کو چھوڑ کر قومی نظموں کی طرف توجہ کی۔ اور ایک قومی مثنوی "صبح امید" لکھی جو ۱۸۸۵ء میں شایع ہوئی۔ اس مثنوی سے سبھوں کی نگاہیں مولانا کی طرف اٹھ گئیں۔

یہ اپنی طرز کی پہلی مثنوی ہے جس میں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ قومی مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مثنوی، مثنوی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ کیوں کہ یہ عام انداز سے بالکل ہٹ کر لکھی گئی ہے۔ اگر میر حسن، پنڈت دیا شنکر نسیم اور مرزا شوق کی مثنویوں کو سامنے رکھ کر اس کے متعلق رائے قائم کی جائے تو بجز اس کے کہ یہ مثنوی کی بحر اور مثنوی کے انداز میں لکھی گئی ہے اور کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی کیوں کہ اس میں نہ کوئی شاہزادی یا وزیر زادی ہے، نہ شاہزادہ یا وزیر زادہ۔ نہ سوداگر بچہ ہے نہ کوئی پری۔ نہ جن ہے، نہ بھوت پریت، نہ سحر ہے نہ ساحری، نہ کسی قسم کی بازی گری، نہ متعدد ابواب ہیں اور نہ عنوانات۔ اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی اس کا صدق و خلوص ہے جس نے اس میں ایک جوش اور زور پیدا کر دیا ہے۔ الفاظ کی فصاحت۔ استعارات و تشبیہات کی نزاکت، معانی کی بلندی اور ترکیبوں کی دلپذیری نے اس میں ایک ایسا سحر پھونک دیا ہے جو بغیر مسحور کئے نہیں رہتا۔ کہیں کہیں سے اس کے اشعار نقل ہیں:-

عروج:-

کیا یاد نہیں ہیں وہ ایام — جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی — جو تاج تھی فرق آسماں کی
تھے جن پہ نثار فتح و اقبال — کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گل کر دئے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دئے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اڑا دئے تھے — اٹلی کو کوئیں جھکا دئے تھے

تنزل:-

اب خضر کو گمرہی کا ڈر ہے — عیسیٰ کو تلاش چارہ گر ہے
اسلام کی جان پر بنی ہے — دم توڑ رہا ہے جانکنی ہے

عزت نہ رہی نہ جاہ و ثروت — افلاس کی بج چکی ہے نوبت
دولت سے جو ہاتھ دھو چکے تھے — ہم علم و ہنر بھی کھو چکے تھے

اب وقت آخر ہے خبر لو — جو کچھ کرنا ہے جلد کر لو

www.urduchannel.in

*۔ "صبح امید" ~~[illegible]~~ وقتی ضرورت کی بنا پر، ظاہرا سرسری طور پر لکھی گئی تھی۔ مسدسِ حالی سے اُس کا مقابلہ برجا نہیں۔

"چیخ پکار" کے درمیان وَ کی ضرورت نہیں بلکہ اُردو میں حرف عطف (اور یا وَ) کا حذف کرنا اِس صورت میں صحیح اور فصیح ہے۔ اِس چیز پر ادیب کو خاص کر توجہ کرنا لازم ہے۔

www.urduchannel.in

سرسید کی تحریکات :-

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ — ایک سمت سے ایک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہ دلگیر — پہلو میں اثر بغل میں تاثیر
دل ہاتھ سے لینے میں بلا تھی — جادو تھی، فسوں تھی، جانے کیا تھی
ڈوبی ہوئی تن جو تھی اثر میں — نشتر سی اتر گئی جگر میں

سرسید کی تصویر :-

دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکیں — آیا نظر اک بہر دیریں
صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرہ پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سفیدی — جھلکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم — توقیر کی صورت مجسم
وہ ملک پہ جان دینے والا — وہ قوم کی ناؤ کھینے والا

رجائیت :-

اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی — اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
اس حال میں بھی روش وہی ہے — دن ڈھل بھی گیا تپش وہی ہے
اس جام کے ہے شراب باقی — اب تک ہے گہر میں آب باقی
گو خار ہیں طرز و خو وہی ہے — مرجھا گئے پھول بو وہی ہے

اس میں شک نہیں کہ یہ مثنوی 'مسدس حالی' کی طرح قبول عام حاصل نہ کر سکی لیکن نفس شاعری کے اعتبار اور فنّی حیثیت سے اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس میں جو آمد' جو جوش اور جو صداقت ہے وہ مسدس میں نہیں۔ مسدس میں نا امیدی' مایوسی' افسردہ حالی' اور یاس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ دلوں کو مردہ اور عزم و استقلال کو افسردہ کر دینے والا ہے۔ برخلاف اس کے اس کا ہر ہر شعر شاندار ماضی سے ایک امید افزا مستقبل کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور مردہ دلوں میں ایک تازہ روح پھونکتا ہے۔ شبلی کی یہی رجائیت آج اقبال کے کلام میں اپنے انتہائی عروج کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اس مثنوی میں مولانا نے جن چیزوں کو لیا ہے یہ ہیں :-

(۱) قوم کی گزشتہ حالت
(۲) قوم کا موجودہ تنزل
(۳) بایں ہمہ قوم کی غفلت و جمود
(۴) شعراء و علماء کی ناگفتہ بہ حالت
(۵) دور جدید و مقتضیات حال سے بے خبری
(۶) اس حالت میں سرسید نے قوم کو بیدار کرنا چاہا
(۷) سرسید کی چیخ و پکار سے قوم کی بیداری
(۸) سرسید کے مخصوص اعوان و انصار
(۹) علوم جدیدہ کی تعلیم کی طرف توجہ
(۱۰) مدرسۃ العلوم کی بنیاد
(۱۱) مدرسۃ العلوم کے لئے سرسید کی دریوزہ گری
(۱۲) قوم کی طرف سے سرسید کی مخالفت

www.urduchannel.in

(۱۳) سرسید کی کامیابی　　　(۱۴) مدرسۃ العلوم کی ترقی

(۱۵) علماء پر طنز ۔

تماشائے عبرت ۱۸۹۴ء / ۱۳۱۲ھ کی علی گڈھ کی نمائش کے موقع پر سرسید کے قومی تھیٹر کے اسٹیج پر یہ مسدس پڑھا گیا۔ اس میں سولہ بند ہیں۔ چونکہ وقت کی چیز تھی اس لئے اسے سے زیادہ وقعت اور دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھی گئی نمونے کے طور پر دو تین بند لکھے جاتے ہیں :-

کوئی کہتا ہے تھیٹر تو نہیں ہے لیکن　　ساز و نغمہ بھی نہ ہو ساتھ نہیں ہے ممکن
راتیں کاٹی ہیں اسی شوق میں تارے گن گن　　دیکھیں کیا سیر دکھائیں یہ بزرگانِ کہن
کچھ نہ کچھ تازہ کرامات تو ہوگی آخر
بوڑھے غمزوں میں کوئی بات تو ہوگی آخر

کون تھا جس نے کیا فارس و یونان تاراج ...　　کس کی آمد میں فرار کر دیا جیپال نے راج
کس کو کسریٰ نے دیا تخت و زر و افسر و تاج　　کس کے دربار میں تاتار سے آتا تھا خراج
تجھ پہ اے قوم اثر کرتا ہے افسوں جن کا
یہ وہی تھے کہ رگوں میں ہے ترے خوں جن کا

ہم نے مانا کبھی دل سے یہ بھلا دیں قصے　　یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے　　دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب کے صفحے
کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر
یادگاروں کو زمانے سے مٹا دیں کیونکر

قصیدے مثنوی اور ترکیب بند کے علاوہ مولانا کے اس دور شاعری میں تین قصیدے بھی ملتے ہیں۔ ایک جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۸۹۳ء / ۱۳۱۱ھ میں پڑھا گیا۔ دوسرا وہ جو ۱۸۹۴ء میں انہوں نے پڑھا اور تیسرا جو آنریبل جسٹس سید محمود مرحوم کی شادی کے سلسلے میں لکھا گیا۔ طنز نگاری جو مولانا کے آخر دور کے کلام کا ایک نمایاں وصف ہے اس کی پہلی اور نہایت ہلکی مثال اس قصیدے میں ملتی ہے جس کا مطلع یہ ہے :-

بجا ہے آج اگر اس بزم میں یہ زیب و ساماں ہیں
یہ ان کی بزم ہے جو یادگار نسل عدناں ہیں

لکھتے ہیں :-

www.urduchannel.in

حمیت اور خود داری نہیں ہے گر طبیعت میں
تو اچھا ہے کہ مسکینی تو اول شرط ایماں ہے

دوسرے قصیدے میں ان کی مخصوص خصوصیت یعنی رجائیت کے ساتھ ہمیں نہایت نادر اور لطیف تشبیہیں ملتی ہیں :-

صفحۂ عیش کی سطریں ہیں برابر دیکھو
حسن و خوبی سے یہ مجمع ہے صف آرا کیسا
نوجواں جمع ہیں یا جوش کی تصویریں ہیں
میں نے اس بزم کا کھینچا ہے سراپا کیسا

اور پھر ان کی مخصوص رجائیت :-

دیکھنا ذرہ کا چمکے گا ستارہ اک دن ؎ دیکھنا قطرہ یہ بنجاتا ہے دریا کیسا

اور اس کے بعد اتحاد کا درس دیا ہے :-

نوجوانو، یہ زمانے کو دکھا دینا ہے ؎ اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا کیسا [1]

مذکورہ بالا شعر "حیات شبلی" میں ایک لفظی تغیر کے ساتھ درج ہے یعنی اس میں سید سلیمان صاحب نے 'زمانے' کے بجائے "حریفوں" لکھا ہے اور اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں :-

"اس شعر کو پڑھتے وقت حریفوں کے لفظ پر بے اختیار انگلی ان انگریزوں کی طرف اٹھ گئی جو جلسہ میں بیٹھے تھے۔ سمجھانے والوں نے ان کو سمجھایا کہ یہ اشارہ انگریزوں کی طرف تھا اور یہ طالب علموں کی بغاوت کا سبق تھا ایک انگریز نے دوسرے سے کہا اور بات عام ہوگئی۔ مولانا فرماتے تھے کہ اس زمانے میں وہ علی گڈھ سے آتے ہوئے ریل کی کسی بے ترتیبی سے فیض آباد اتر گئے اور وہاں کے ڈاک بنگلہ میں ٹھہر گئے۔ بنگلے کے خانساماں نے مولانا کا نام سنا تو ملنے آیا۔ مولانا نے پوچھا کیسے آئے تو اس نے کہا کچھ صاحب لوگ یہاں آئے تھے اور آپ کا نام لے کر کچھ یوں ہی کہہ رہے تھے اس سے دیکھنے کا جی چاہا" [2]

---

[1] کلیات شبلی اردو ص ۲۹۔ [2] حیات شبلی ص ۲۷۹-۲۸۰۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

نوٹ: اس بحر اور قافیے میں اور بھی قصیدے ہیں۔ آتش اور محسن کی تخصیص نہیں۔

www.urduchannel.in

تیسرے قصیدے کے تیور بڑے نرالے ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں :-

سمت قبلہ سے جو اٹھتی ہیں گھٹائیں ہر بار
کہتی ہیں طوبہٰ زاہد سے کہ ابکی تو سنبھل

توبۂ

نوعروسان چمن کے ہیں نرالے انداز
کہ صبا گود میں لیتی ہے تو جاتے ہیں مچل

جھومتی چلتی ہے بنجو در وشوں پر جو نسیم
غنچے کہتے ہیں چٹک کر کہ سنبھل دیکھ سنبھل

اے صبا باغ میں آنا تو دبے پاؤں آنا
نیند میں سبزۂ خوابیدہ کے آئے نہ خلل

اور پھر ذرا تعلیاں تو دیکھئے :-

مدح مقصود نہیں جوش محبت ہے یہ
میں نہیں وہ کہ لکھوں مدحت ارباب دول

مجھکو خود حسن طبیعت پہ ہے اپنے وہ غرور
کہ لکھوں مدح تو اپنا ہی لکھوں علم و عمل

میں ہوں عنصری وقت جو محمود ہے تو
میں ہوں نازسلف تو ہے اگر فخر اوّل

بھی

اُدل۔

مولانا کا یہ قصیدہ نہایت زوردار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لکھتے وقت دماغ میں دو قصیدے تھے

ایک انشاء کا ؏ "کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانان چمن"

اور دوسرا محسن کاکوری کا ؏ "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل"

X

متھرا

تیسرا دور مولانا کی شاعری کا یہ تیسرا دور حیدرآباد کے زمانہ قیام سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی شاعری میں کہیں کہیں 'داغیت' بھی دکھائی دینے لگتی ہے۔ حیدرآباد کے دوران قیام میں وہ داغ سے اکثر ملتے جلتے رہتے تھے اور ان کی شاعری سے بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ اس کا اظہار بھی

www.urduchannel.in

ہوگیا ہے :-

ہاں تو دعویٰ کن و ما نیز مسلم دارم

شبلی سحر فن و داغ غزل خواں از تست

مولانا داغ کی غزل گوئی کو بہت پسند کرتے تھے اور اکثر کوشش کرتے تھے کہ خود بھی انہیں جیسی غزلیں لکھیں۔ لکھتے ہیں :-

اثر کے پیچھے دل حزیں نے سراغ چھوڑا نہیں کہیں کا
گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رُخ کیا زمیں کا

بعلی تھی تقدیر یا بُری تھی، یہ راز کس طرح سے عیاں ہو
بتوں کو سجدے کئے ہیں اتنے کہ مٹ گیا سب نشاں جبیں کا

وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں
سیانے ہونگے تو ہاں بھی ہوگی ابھی تو سن ہی ہہیں نہیں کا

یہ نظم آئین، یہ طرز بندش، سخنوری کیا فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا

مگر جہاں تک اردو غزل گوئی کا تعلق ہے مولانا کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ افسوس ہے کہ حیدرآباد کے دورِ قیام کی صرف ایک غزل کے چند شعر ملتے ہیں جو اوپر درج کئے جاچکے ہیں اور باقی، سوا اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ زمانہ کی دست برد سے نہ بچ سکے مگر تلف ہوجانے کی ایک اس سے بھی بڑی وجہ یہ ہے کہ مولانا اپنی اردو شاعری کو غالب کی طرح بے رنگ سمجھتے تھے اور اس کو وقعت کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ چنانچہ اسی خیال نے ان کی اردو شاعری کے بڑے حصہ کو ضایع کردیا۔ اردو شاعری سے مولانا کی بے نیازی کی داستان سنیئے :-

"ایک مرتبہ راقم الحروف کو ایک قلمی بیاض سے مولانا کے کچھ اشعار کی نقل مل گئی لیکن جب مولانا سے ذکر آیا اور الناظر میں ان کی اشاعت کا ارادہ ظاہر کیا گیا تو انہوں نے باصرار اس سے باز رکھا۔ بلکہ یہاں تک کہا کہ اگر ان کی اشاعت کی جائے گی تو راقم الحروف سے تمام تعلقات منقطع ہوجائیں گے۔" ۵۱ (۷۰)

---

۵۱ دیباچہ مجموعہ کلام شبلی مرتبہ ظفرالملک، مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۲۳ء

(۷۰) بھائی! مولانا نے ظفر صاحب کو لکھا کہ ... ان اشعار ...

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

اس سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن سیاسی اور تاریخی نظموں کو
غالباً سب سے پہلے مولانا ہی نے رواج دیا۔ علاوہ اس کے طنز لطیف
کی آمیزش بھی مولانا ہی کا رنامہ فخر ہے "[1] کا کارنامہ

مولانا کی شاعری کے اس دور پر تبصرہ کرنے سے پہلے ان واقعات یا حادثات اور حالات کا ذکر کر دینا ضروری ہے جو یکے بادیگرے دنیائے اسلام پر نازل ہوتے رہے اور جنہوں نے مولانا کے پیمانۂ صبط کو چھلکا کر انہیں آتش نوائی پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا کے رجحانات 'میلانات' حسیات' اور کیفیات پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے جو اُن میں موجود تو پہلے سے تھے مگر اب اپنے پورے زور اور جوش کے ساتھ اُبھر آئے تھے۔ مولانا 'اتحاد اسلامی' (پین اسلامزم)[2] کی تحریک کی دل سے قدر کرتے تھے۔ مسلمانوں کے تنزل کا احساس انہیں ہر وقت تڑپایا کرتا تھا۔ اسلامی سلطنتوں کی زبوں حالی پر وہ آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلام کی گذشتہ تاریخ ایک امر واقعہ بن کر پھر نگاہوں کے سامنے آجائے۔ اسلامی عروج کی داستانیں جو تاریخ کے اوراق میں دفن ہو چکی ہیں اور جن کی آج 'فسانے' سے زیادہ اہمیت نہیں ایک بار پھر مجسم شکل اختیار کر لیں۔ یہ ذکر کہیں آچکا ہے کہ روم و روس کی لڑائی میں مولانا ترکوں کے لئے چندہ کی بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ اس سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں ترکوں سے کتنی محبت تھی۔ طرابلس اور بلقان کے ہنگامے کے زمانے میں مولانا کی مشہور نظم 'شہر آشوب اسلام' جو ایک دردمند دل کی دلدوز صدا ہے ان کے قلم سے نکلی اور کیسی نکلی۔ یہ مولانا کی جراءت اور ہمت کی ایک ایسی عرفانی مثال ہے جس کی نظیر ڈھونڈے نہ ملیگی کیوں کہ نظم اس زمانہ کی پیداوار ہے جب "دستور زباں بندی" کی بنا پر بات کرنے کو زبان ترستی تھی۔ ترکوں سے محبت کی مثالیں ان کی نظم و نثر دونوں میں ملتی ہیں۔ ترکوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :-

تازگیٔ بدر و حنین از تو ہست
زیب و طراز حرمین از تو ہست

فرۂ دین نبوی از تو ہست
بازوے اسلام قوی از تو ہست

یا ٹرکی نے جب 'دستوریت' کا اعلان کیا تو مولانا اچھل پڑے اور فرط مسرت سے جھومنے لگے چنانچہ مہدی الافادی مرحوم کو لکھتے ہیں :-

---

[1] رسالہ ہندوستانی جلد اول، حصہ دوم، ص ۲۸۲ - ۲۸۳
[2] دیباچہ مقالات شبلی، جلد ہشتم۔ ص ۳ - مطبع معارف اعظم گڈھ، ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء۔

www.urduchannel.in

"ترکی کی جدید زندگی نے اس کے ہوا خواہوں کو مخمور کر دیا ہے۔ کیا بتاؤں عربی اخبارات میں آج کل کیا نٹ ہوتا ہے۔ سو سو دفعہ پڑھتا ہوں اور سیر نہیں ہوتا۔ آپ کو مبارک ہو کہ آزادی کے جو جلوس نکلے ان میں بیس ہزار کی جمعیت کا ایک کانڈر ایک جنس لطیف تھی۔

اس فوج کا کیا عالم ہوگا جو قدرتی اور نیچرل فاتح القلوب ہیں اور ان کی سپہ سالاری کیا قیامت ڈھائیگی۔ یاد رکھیگا ایران اور ترکی کی پارلیمنٹ یورپ کا اثر نہیں گو توارد ہے 'امرھم شوریٰ' کا سبق مسلمانوں کو اب یاد آیا اور چونکہ گھر کی چیز تھی کسی کو تکسیر نہ ہوئی۔

خدا کی قسم یہ جوش، یہ صداقت، یہ مسرت، یہ اعتدال، دنیا کی تاریخ دکھائے گی تو اسلام ہی کے آئینے میں دکھائے گی۔ خیال فرمائیے آٹھ لاکھ آدمیوں کا دریا قسطنطنیہ میں موجیں لے رہا تھا اور ایک تنکے کا بال بیکا نہ ہوا۔ معاویہ کے گناہوں کا کفارہ عبدالحمید نے ادا کر دیا۔" [۵۵]

اوپر کی سطور میں مولانا کی واردات قلبی اور حسیات ذہنی پر روشنی ڈالی گئی ہے اب اس دور یعنی ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء سے ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء تک کی اجمالی تاریخ کا خاکہ پیش ہے:-

۱۹۱۲ء یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی دنیا میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی مسلم لیگ کا ہنگامہ، مسلم یونیورسٹی کا قیام اور اس کے حقوق کے لئے جد وجہد، گورنمنٹ سے مطالبات اور اُدھر سے انکار اور اسی بنا پر مسلمانوں اور گورنمنٹ کے درمیان اختلافات، پھر مسجد کانپور کا خونیں واقعہ، تنسیخِ بنگال، طرابلس اور بلقان کی جنگ، ان سبھوں نے ملکر مسلمانوں میں ایک آگ لگا رکھی تھی اور وہ جوش غضب میں دیوانے ہو رہے تھے اور ان کا یہ اشتعال ان کو ایک علانیہ بغاوت کے اظہار پر مجبور کر رہا تھا۔ شبلی کی اس دور کی شاعری اسی ماحول کی پیداوار ہے:-

"اس پر آشوب زمانے کا شاعر اگر کوئی ہے تو وہ مولانا شبلی تھے۔ ہر ہفتہ جو واقعہ پیش آتا تھا اس پر وہ ایک ایسا شاعرانہ اظہار خیال کرتے تھے کہ اس زمانے کے بچہ بچہ کی زبان پر وہ اشعار چڑھ جاتے تھے۔ ان نظموں میں جوش بیان، قوت نظم اور مؤثر طنز کا ایسا تیز نشتر چھپا تھا کہ وہ جس پر پڑتا تلملا جاتا تھا۔" [۵۶]

---

۵۵ مکاتیب شبلی، جلد دوم، طبع دوم، مطبع معارف، ص ۲۱۷ - ۲۱۸

۵۶ دیباچہ کلیات شبلی اردو، ص ۱۴ - از سید سلیمان ندوی

www.urduchannel.in

مولانا کے یہ منظوم تبصرے "زمیندار"، "ہمدرد"، "مسلم گزٹ" اور خصوصاً "الہلال" میں شایع ہوتے تھے۔ شروع شروع میں مولانا اپنے چہرہ پر "کشاف" اور پھر "وصاف" کا پردہ ڈالے ہوئے تھے پھر بھی اس کی تابانیاں چھن چھن کر باہر نکلتی ہی رہیں اور جب مولانا نے محسوس کیا کہ متجسس نگاہیں اکثر روز بھرم کھول دیں گی تو خود چہرے سے نقاب اٹھا دی۔ مولانا کا یہ دور شاعری پانچ عنوان کی تحت میں آ سکتا ہے :-

(۱) اخلاقی و مذہبی۔
(۲) تاریخی۔
(۳) سیاسی۔
(۴) طنزیہ۔
(۵) وقتی۔

اخلاقی و مذہبی یوں تو اردو میں اخلاقی اور مذہبی شاعری کی بنیاد مولانا سے بہت پہلے پڑ چکی تھی مگر جس انداز سے شبلی نے اس کو پیش کیا وہ اجتہاد کا درجہ رکھتا ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس "طرز ادا" کے موجد ہیں اور خاتم بھی۔ موجودہ زمانے میں مذہبی و اخلاقی شاعری کا ایک دفتر تیار ہو گیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ وہ مولانا کی نظموں کے پاسنگ بھی نہیں۔ "مذہبی روایات" و "تاریخی واقعات" کو بلا کسی رنگ آمیزی کے اس طرح نظم کر دینا کہ حقیقت نگاری کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے اور اس کا اثر بھی دوبالا ہو جائے اس کی اولیت کا سہرا مولانا ہی سر ہے۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی :-

> "اکثر کہا گیا ہے کہ بہترین شاعری وہ ہے جس میں جھوٹ یعنی مبالغہ اور خیال آرائی کا حصہ زیادہ ہو۔ مگر مولانا کی ان نظموں نے دکھا دیا کہ واقعیت کی سطح پر بھی شاعری کا کمال دکھایا جا سکتا ہے۔ عموماً ان نظموں میں روایت کے الفاظ کا ٹھیٹ ترجمہ کر دیا گیا ہے پھر بھی کمال یہ ہے کہ خوبی ادا اور تعبیر میں شاعری کا پورا زور ہے" لے

مثلاً یہ نظم :- ــــ اظہار قبول حق ــــ

وارث عدل پیمبر عمر ابن الخطاب
ہیچ تھی جن کے لئے منزلت تاج و سریر

لے دیباچہ کلیات شبلی اردو، مطبع معارف، ص ۱۹ -

www.urduchannel.in

مجمع عام میں لوگوں سے انہوں نے یہ کہا
"مہر باندھو نہ زیادہ کہ ہے یہ بھی تبذیر
جس قدر تم کو ہو مقدور وہیں تک باندھو
حکم یہ عام ہے سب کو امراء ہوں کہ فقیر"
ایک بڑھیا نے وہیں ٹوک کے فوراً یہ کہا
"تجھکو کیا حق ہے جو تو کرتا ہے ایسی تقریر
صاف قرآں میں قنطار کا لفظ آیا ہے
تجھکو کیا حق ہے کہ اس لفظ کی کر دے تغیر
لاکھ تک بھی ہو تو کہہ سکتے ہیں اس کو قنطار
تھا یہ اک وزن کہ اس وزن کی ہے یہ تعبیر"
سرنگوں ہو کے کہا حضرت فاروق نے آہ
میں نہ تھا اس سے جو واقف تو یہ میری تقصیر"۔
لہ

یا ان کی اور دوسری نظمیں "اہل بیت رسول صلعم کی زندگی" "ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حلم و عفو" وغیرہ

انداز بیان اور تاثیر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما چکے ہیں اور مدینے کی سرزمین میں داخل ہوتے ہیں :-

یاں مدینے میں ہوا غل کہ رسول آتے ہیں
راہ میں آنکھ بچھانے لگے ارباب نظر
لڑکیاں گانے لگیں ذوق میں آکر اشعار
نغمہ ہائے 'طلع البدر' سے گونج اٹھے گھر
ماں کی گود میں بچے بھی مچل جانے لگے
نازنینان حرم بھی نکل آئیں باہر
آل نجار چلے شہر سے ہو کر تیار
زرہ و جوشن و چار آئینہ و تیغ و سپر
دفعتاً کوکبۂ شاہ رسل آ پہونچا
غل ہوا صل علیٰ خیر اناس و بشر
جلوہ طلعت اقدس جو ہوا عکس فگن
دفعتاً نار سنعاً گی تھا ہر اک تار بصر
طور پر حضرت موسیٰ کی صدا آتی تھی
آج اک اور جھلک سی مجھے آتی ہے نظر
- - - - - - - - - - - - - -

لہ یہ نظم منتخب کر کے نہیں لکھی گئی ہے۔ چونکہ اختصار مد نظر تھا اسلئے قرعہ اسی پر پڑا

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

'ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر' کے عنوان سے مولانا نے جو نظم لکھی ہے اس کا ایک ایک شعر اثر اور تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے ۔ ملاحظہ ہو :-

کافروں نے یہ کیا جنگ اُحد میں مشہور
کہ پیمبر بھی ہوئے کشتۂ شمشیر دودم

ہو کے مشہور مدینہ میں جو پہونچی یہ خبر
ہر گلی کوچہ تھا ماتم کدۂ حسرت و غم

ہو کے بیتاب گھروں سے نکل آئے باہر
کودک و پیر و جوان و خدم و خیل و حشم

وہ بھی نکلیں کہ جو تھیں پردہ نشینانِ عفاف
جن میں تھیں سیدۂ پاک بھی با دیدۂ نم

ایک خاتون کہ انصار نکو نام سے تھیں
سخت مضطر تھیں، نہ تھے ہوش و حواس انکے بہم

موقع جنگ پہ پہنچیں تو یہ لوگوں نے کہا
کیا کہیں تجھ سے کہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں ہم

تیرے بھائی نے لڑائی میں شہادت پائی
تیرے والد بھی ہوئے کشتۂ شمشیر ستم

سب سے بڑھ کر یہ کہ شوہر بھی ہوا تیرا شہید
گھر کا گھر صاف ہوا ٹوٹ پڑا کوہ الم

اس عفیفہ نے یہ سب سن کے کہا تو یہ کہا
یہ تو بتلاؤ کہ کیسے ہیں شہنشاہ امم

سب نے دی اس کو بشارت کہ سلامت ہیں حضورؐ
گرچہ زخمی ہیں سر و سینہ و پہلو و شکم

بڑھ کے اُسنے رُخ اقدس کو جو دیکھا تو کہا
تو سلامت ہے تو ہر ہیچ ہے سب رنج و الم

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا
اے شہ دین ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

تاریخی نظمیں | علامہ شبلی نے اسلامی تاریخ کے اکثر مؤثر اور سبق آموز واقعات کو بھی نظم کیا ہے اور اس طرح ہماری شاعری میں واقعہ نگاری کے بہترین نمونے پیش کر دیے ہیں ۔ مولانا کو تاریخ سے جو لگاؤ

www.urduchannel.in

تھا اس کا ثبوت صرف ان کے نثری کارناموں میں ہی نہیں ملتا بلکہ اس کی کارفرمائیاں ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہیں ان واقعات کو بھی نظم کرنے میں مولانا کا مقصد وہی ہے جو اُن کی تاریخی تصانیف کا ہے یعنی مسلمانوں کی تاریخی عظمت کا اظہار، اسی لیے ان نظموں کے لئے انہوں نے ایسے واقعات کا انتخاب کیا ہے جو خود بھی ایک تاثیر اور اثر رکھتے ہیں 'عدل جہانگیری' 'ہمارا طرز حکومت' وغیرہ اس کے بہترین نمونے ہیں۔ مثال کے طور پر 'عدل جہانگیری' کو لے لیجئے۔ مولانا لکھتے ہیں :۔

قصر شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گذر
ایک دن نورجہاں بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہ گیر ادھر آ نکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن
غیرت حسن سے بیگم نے طمنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن

ساتھ ہی شاہ جہانگیر کو پہنچی جو خبر
~~غیض~~ غیظ سے آگئی ابروئے عدالت پہ شکن
حکم بھیجا کہ کنیزان شبستان شہی
جا کے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

نخوت حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بہ آئین حسن
ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموس حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن
اسکی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشور حسن میں جاری ہے یہی شرع کہن

مفتی دیں سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن
مفتئ دین نے بے خوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن

www.urduchannel.in

لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اٹھے
پر جہاں گیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن
ترکنوں کو دیا حکم کہ اندر جا کر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن
پھر اسیطرح اُسے کھینچ کے باہر لائیں
اور جلا دوں کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن

یہ وہی نورجہاں ہے کہ حقیقت میں وہی
تھی جہاں گیر کے پردے میں شہنشاہ زمن
اسکی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن

اب نہ وہ نورجہاں ہے نہ انداز غرور
نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن

اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھراتے ہیں
جن کی رفتار سے پامال تھے مرغان چمن
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

خدمت شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امر حسن
مفتیٔ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا
بولے جائز ہے رضامند ہوں گر بچۂ وزن
وارثوں کو دئے اک لاکھ درم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہ زمن
ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن -

ہو چکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں
کہ نہیں اس میں کوئی شائبۂ حیلہ و فن
اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم
تھی جہاں نورجہاں معتکف بیت حزن

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

دُھکتا پاؤں پہ بیگم کی گرا اور یہ کہا
تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من

سیاسی نظمیں

'سیاست' جیسے خشک مضمون کو مولانا نے اپنی رنگین قلم سے ایسا دلکش بنایا اور اس میں ایسی ایسی جولانیاں دکھائی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے مولانا پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا۔ مولانا ہمیشہ سیاست کے دلدادہ رہے مگر سیاست کے باب کو اپنے قلم کا موضوع کبھی نہیں بنایا اور اس سے گریز کرتے رہے مگر جب پے در پے مسلمانوں پر ہندوستان اور ہندوستان کے باہر آفتیں نازل ہونا شروع ہوئیں جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے تو ان کے ضبط کا پیمانہ چھلک پڑا اور وہ اپنے دلی جذبات کو بڑے جوش و خروش کیساتھ اپنی شاعری کے ذریعہ سے منظر عام پر لے آئے۔ زبان کھلنے کی دیر تھی ایک ہنگامہ برپا ہوگیا مسلمان مشتعل پہلے ہی سے تھے اسنے آگ پر تیل کا کام کیا۔ مولانا کی اس دور کی شاعری کا زیادہ حصہ سیاسیات ہی پر مشتمل ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفلِ خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے منتظرِ نفخِ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار
ازبس کہ مستِ بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناس ذوقِ دلِ ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک و خوں میں بھی ہمتن غرقِ نور ہیں

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

پوچھا جو میں نے کون ہو تم آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

مولانا نے "علمائے زندانی" کے نام سے اسی سلسلہ میں جو نظم لکھی ہے وہ بھی پیش ہے :-

۱۔ مساجد کی حفاظت کے لئے پولس کی حاجت ہے
خدا کو آپ نے مشکور فرمایا عنایت ہے

۲۔ عجب کیا ہے کہ اک شاہرہ سے یہ صدا آئے
مجھے بھی کم سے کم اک غسل خانے کی ضرورت ہے

۳۔ پہنائی جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہے

۴۔ یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی
تو مجھ کو سستی بازوئے قاتل کی شکایت ہے

۵۔ شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروس مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے

۶۔ عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے

۷۔ شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے

چوتھے شعر میں طنز کی زہرناکی قابل غور ہے۔
"شہر آشوب اسلام" "ہنگامہ مسجد کانپور" "مسلم لیگ" "خطاب بہ احرار" وغیرہ
مولانا کی بہترین سیاسی نظموں میں شمار کی جاتی ہیں۔

طنزیہ | 'طنز' نام ہے انسان کے 'جذبۂ تضحیک' کا اس میں ادبی اسلوب کا ہونا ضروری ہے، اس کا مقصد اصلاح ہے اور اُن پر صرف ہوتا ہے جو اپنے متعلق حسن ظن رکھتے ہیں۔ طنز کے لئے گرد و پیش سے بے اطمینانی ضروری ہے۔ دنیا کا کوئی ادب اس سے خالی نہیں۔ یونانیوں میں ایرسٹوفینس

www.urduchannel.in

مشہور طنز نگار گذرا ہے۔ اس کے دو ڈرامے 'فرگ' اور 'کلارڈ' مشہور ہیں جن میں سقراط اور اس کا غوث پر مشق ستم ہوئی ہے۔ یونانیوں میں چوں کہ طنز ذاتی تھا اس لئے اس میں زہرناکی بھی زیادہ تھی۔ رومیوں نے اس میں اعتدال پیدا کیا۔ جووینل یونان کا سب سے بڑا طنز نگار سمجھا جاتا ہے۔ ازمنۂ وسطی اور نشاۃ الثانیہ میں یورپ میں کروِنٹیز کا طنز نگاری میں بڑا مرتبہ ہوا ہے۔ اس کے بعد مغربی طنز نگاروں میں ڈریگن کا نام قابل ذکر ہے یہ پہلا شخص ہے جس نے سیاسی مقصد کے لئے طنز کو استعمال کیا۔ انگریزی ادب میں سوفٹ کو بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ اس میں طنز یاتی روح سب سے زیادہ ملتی ہے سجاد انصاری کی طرح وہ اپنی آگ میں خود جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ سوفٹ کے طنز کا موضوع ادب اور سیاست ہے۔ فرانس میں والٹیئر بڑا شخص گذرا ہے اس نے اکبر الہ آبادی کے برعکس قدامت پسندی پر چوٹیں کی ہیں۔ اردو ادب کے طنز نگاروں میں سودا، انشاء، نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی، اور شبلی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ شبلی، جووینل، اور ڈریگن سے ملتے جلتے ہیں۔ جووینل سے اسلئے کہ اس کے طنز کا انداز 'المیہ' ہے اور ڈریگن سے یوں کہ اس نے سیاست کو اپنے طنز کا حدف بنایا ہے۔

'طنز نگاری' اور طنز نگاروں کا ایک اجمالی خاکہ ہے۔ جو ایک طرف پس منظر کا کام دیگا اور دوسری طرف اس سے مولانا کی طنز نگاری پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑے گی مولانا کی طنزیہ نظمیں، یا ان کا طنز کہیں الگ نہیں ملتا بلکہ ان کی سیاسی شاعری ہی کا ایک جزو ہے۔ اکبر کا طنز ظرافت کے پردے میں صرف ہوتا ہے اور جس پر صرف ہوتا ہے وہ فرط انبساط سے تڑپنے لگتا ہے۔ شبلی کے طنز میں الم ناکی ہے۔ اس کا ہدف مغموم و دلگیر ہو کر غصہ سے بیتاب ہو جاتا ہے۔ اکبر طنز کا نشتر پھینک کر مارتے ہیں اور خود الگ ہو جاتے ہیں۔ شبلی اسی نشتر کو آہستہ آہستہ پیوست کرتے ہیں اور پکڑے جاتے ہیں۔ 'مسلم لیگ' کے عنوان سے ایک نظم ملاحظہ ہو:۔

جناب لیگ سے میں نے کہا کہ 'اے حضرت
کبھی تو جا کے ہمارا بھی ماجرا کہئے
کلیم طور پر کرتے تھے عرض قوم کا حال
تو آپ شملہ پہ کچھ حال قوم کا کہئے

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

معاملاتِ حکومت میں دیجئے کچھ دخل
یہ کیا کہ قصۂ پارینۂ وفا کہئے
خدانخواستہ ترکِ وفا نہیں مقصود
ہر ایک بات بہ اندازِ آشنا کہئے
عدالتوں کی پریشانیاں بیاں کیجئے
فسانۂ ستم و جورِ نا روا کہئے
درازدستئ پولس کا کیجئے اظہار
مقدمات کے حالات فتنہ زا کہئے
گزر رہی ہے جو کچھ کاشتکاروں پر
یہ داستانِ الم ناک و غم فزا کہئے
شیوخِ علم میں قیدیں جو بڑھتی جاتی ہیں
یہ کون شیوۂ دانش ہے اس کو کیا کہئے
سنائیے انہیں کچھ بحرِ قہر و جبر کا حال
پھر اس کے بعد ستم ہائے ناخدا کہئے
برادرانِ وطن کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ
کبھی تو آپ بھی افسانۂ جفا کہئے
نہ ہو سکے تو اشاروں میں کیجئے اظہار
وگرنہ لطف تو یہ ہے کہ برملا کہئے
جناب لیگ نے سب کچھ یہ سن کے فرمایا
"مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے" -

کیجے

یا ایک اور نظم جس کی سرخی ہے "آپ ظالم نہیں زنہار یہ ہم ہیں مظلوم" :—

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا نہ اب ہے انکار
کہ ہر اک شہر میں ہے آپ کے انصاف کی دھوم
یہ بھی تسلیم ہے ہم کو کہ یہ جو کچھ کہ ہوا
اس میں ملحوظ رہے عدل کے آداب و رسوم

www.urduchannel.in

تو صرف اتنا کہہ دیجئے تنقید یہ نہیں . .

www.urduchannel.in

آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سرمو
فیر کا حکم دیا آپ نے جب بہرِ ہجوم
یہ حقیقت بھی مگر قابلِ انکار نہیں
کہ بیک چشم زدن موت کو تھا اذنِ عموم
گولیاں کھا کے جو گرتے تھے جوانانِ حسین
سب یہ کہتے تھے "قیامت ہے کہ ٹوٹے تھے نجوم"
گولیوں کے تھے نشاں منبر و محراب پہ بھی
بلکہ درکار ہیں مسجد کے لئے نقش و رسوم
جا بجا خون سے مسجد ہے نگاریں اب تک
یہ وہ صنعت ہے کہ تا حشر نہ ہوگی معدوم
پا بہ زنجیر تھے مجرم بھی تماشائی بھی
اور پولس کو یہ تھا عذر کہ "ہم ہیں محکوم"

واقعہ یہ ہے غرض کوئی نہ مانے نہ سہی
آپ ظالم نہیں زنہار یہ ہم ہیں مظلوم

مذکورہ بالا نظم کی طنزیائی روح قابلِ داد ہے۔

وقتی | یہ وہ نظمیں اور قطعات ہیں جو مولانا نے کسی وقتی جذبہ یا فوری واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ چوں کہ ان میں بھی مولانا کا ایک خاص رنگ جھلکتا ہے اور ان کا مخصوص شاعرانہ اندازِ بیان بھی جلوہ گر ہے اس لئے یہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ بعض قطعات نہایت پر لطف اور دلچسپ ہیں۔ مثلاً عطیہ بیگم کی شادی کے موقع پر مولانا نے عطیہ کی زبان سے تین شعر کہے ہیں :-

کھینچ سکتا نہ تھا مجھ کو کوئی اپنی طرف
اس لئے ننگِ قرابت سے مجھے دوری تھی
آپ نقاش ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں
آپ نے مجھ کو جو کھینچا تو یہ مجبوری تھی

بتانِ ہند کافر کیا کرتے تھے مسلم کو ÷ ÷ ÷ عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے۔

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

(واضح رہے کہ عطیہ کی شادی ایک نومسلم یہودی نقاش و مصور سے ہوئی تھی)

ان چھوٹے چھوٹے قطعات اور نظموں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک نئی چیز کا انکشاف ہوتا ہے جو نہایت تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے مولانا نہایت سنجیدہ اور متین انسان تھے وہ ہمیشہ اپنے کو لیتے دیئے رہے اس لئے جب ان کے اشعار میں کہیں کہیں شوخی اور ظرافت کی چاشنی ملتی ہے تو پہلے باور کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کیسے امید ہو سکتی ہے کہ ایک زبردست متکلم اور بے مثل اسلامی مورخ یوں خود بھی ہنسے گا اور دوسروں کو بھی ہنسائے گا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :—

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں میں
لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ بڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی
جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں

یہ اشعار حادثۂ گزند پا کے بعد لکھے گئے۔ مولانا کی اس میں بھی ایک جدت ہے، لوگ دوسروں پر پھبتی کہتے ہیں لیکن مولانا نے فرسودہ راستہ پر چلنا گوارا نہ کیا اور بجائے اس کے کہ دوسروں پر پھبتی کہیں خود اپنے کو اس کا ہدف بنایا ہے۔ پھر ایک جگہ لکھتے ہیں :—

لیگ والوں سے کہا میں نے کہ باتیں کب تک
یہ تو کہئے کہ عمل کی بھی بناء ڈالی ہے
ایک صاحب نے کہا آپ نہ گھبرائیں ابھی
حال بھی آئے گا اب تک تو یہ قوالی ہے

'حال' اور 'قوالی' کی رعایت چھپی نہیں ہے۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

باب پنجم

مکتوبات

مکاتیب اور ان کی اہمیت قلم ہی ایک ایسی چیز ہے جو فانی انسان اور اس کے کارناموں کو خواہ ان کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو زندگی جاوداں عطا کر سکتا ہے ایک صاحب قلم اگر یہ چاہے کہ اس کے دلی جذبات اور قلبی احساسات اس کی تحریروں میں کبھی منعکس نہ ہونے پائیں تو یہ ناممکن ہے۔ انتہائی احتیاط کے باوجود اس کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں اس کی شخصیت جھلکنے لگے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا ہر پہلو روشن نہ ہونے پائے اور خاکہ اس قدر دھندلا رہ جائے کہ لوگوں کی نگاہیں اُسے فوراً محسوس نہ کر سکیں۔ یہ عام تحریروں کا حال ہے۔ خاص تحریریں یعنی خطوط جو عزیزوں اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں وہ تکلفات اور مصالح کے قیود سے قطعاً آزاد ہوتے ہیں۔ ان میں بناوٹ اور تصنع نہیں ہوتا۔ اس کا ہر ہر لفظ سادگی اور سچائی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے اگر انسان کی شخصیت کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو اس کو اس کے خطوط و مکاتیب کے آئینہ میں دیکھنا چاہیئے۔ جس کی ہر ہر سطر اس کی زندگی کے نشیب و فراز اور اس کے جذبات و احساسات کے مدوجزر کی غمازی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو جاذبیت خطوط میں ہوتی ہے وہ دوسری تصنیفوں میں نہیں ملتی۔

کسی شخص کی شخصیت، اس کے کارنامے، اس کے افکار و خیالات، عادات و خصائل، اس کے طریق ماند و بود اور اس کے مشاغل کا اندازہ عموماً اس کی سوانح عمریوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ مگر اس ذریعہ میں چونکہ ایک درمیانی ہاتھ بھی ہوتا ہے اسلئے یہ اتنا قابل وثوق نہیں ہوتا۔ البتہ خود نوشت سوانح عمریاں اس سے بہتر ذریعہ ہیں مگر ان میں یہ نقص رہ جاتا ہے کہ آدمی خود اپنی سوانح عمری لکھنے بیٹھتا ہے تو اسکے دل میں فطرتاً یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ تصنیف منظر عام پر آئیگی، لوگ اسے پڑھ کر میری زندگی پر رائے قائم کرینگے لہذا اس انداز سے لکھنا چاہیئے کہ اس میں "شہد ہی شہد ہو" اس لئے کسی شخص کے بارے میں صحیح رائے قایم کرنے کا یہ ذریعہ بھی نامکمل ہے اب ایک تیسری چیز رہ جاتی ہے۔ یہ اس کے مکتوبات یا خطوط ہیں۔ یہ اس لئے بہتر ذریعہ ہے کہ خط لکھتے وقت کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس کے مرنے کے بعد یا اس کی حیات ہی میں اس کے خطوط کبھی منظر عام پر آ کر اس کے قلبی واردات

www.urduchannel.in

اور ذہنی حسیات کو عریاں کر دیں گے اس لئے وہ ان میں اپنے واقعی خیالات وجذبات کو بے کم و کاست بیان کر دیتا ہے اور اپنی اصل شکل میں نظر آتا ہے۔ اس لئے یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے صحیح طور پر اس کو پرکھا جا سکتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم براہ راست شبلی کے مکاتیب وخطوط پر اظہار خیال کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے مکتوبات پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

اردو مکاتیب کی مختصر تاریخ اور غالب کا درجہ

غالب کے مکتوب کو جو قبول عام اور شہرت نصیب ہوئی اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی 'اولیت' ہے۔ غالب کے زمانے تک تعلیم یافتہ طبقہ اپنے اظہار مطالب کے لئے فارسی ہی کو ترجیح دیتا تھا اور دیسی زبان یعنی اردو کو اپنی شان سے فروتر سمجھتا تھا۔ انکی عبارت کو ہم سہل ممتنع کہہ سکتے ہیں جو دیکھنے میں نہایت صاف، سادہ اور آسان معلوم ہوتی ہے مگر جب اس کی نقل کی کوشش کیجئے تو ایک جملہ بھی قلم سے ویسا نہیں نکلتا۔ مرزا صاحب چونکہ فارسی زبان کے ایک نکتہ داں شخص تھے اور انہیں متقدمین کے کلام اور طرز پر پورا پورا عبور تھا اس لئے ان کے اردو کے خطوط میں فارسی کی ہر حسین ادا اور اس کے محاسن پوری آب و تاب کے ساتھ جھلکتے نظر آتے ہیں۔ آتش غدر کے سرد ہو جانے کے بعد جس میں نہ جانے کتنے یار آشنا دنیا اُٹھ گئے تھے مرزا صاحب نے اردو خطوں کو ایک تفریحی شغلہ بنالیا تھا۔ جو کچھ لکھتے تھے اس خیال سے لکھتے تھے کہ اس سے ان کا اور مکتوب الیہ دونوں کا جی بہلے۔ چوں کہ طبیعت فطرتاً جدت پسند تھی اس لئے اس میدان میں بھی ان کی جدت اور اپج قائم رہی۔ انکے خط کو خط نہیں باتیں کہئے۔ مکاتبہ نہیں مکالمہ سے تعبیر کیجئے۔ تحریر نہیں تقریر سمجھئے۔

اس زمانہ کی روش عام سے ہٹ کر مرزا صاحب نے طول طویل القاب اور آداب کو غیر ضروری سمجھا۔ چنانچہ ان کے خطوط میں تلاش کرنے کے بعد بھی اس قسم کے پر تکلف القاب و آداب نہیں ملیں گے ان کے بجائے 'میاں' 'مولانا' 'برخوردار' 'بھائی صاحب' 'کیون صاحب' 'منشی صاحب' 'بندہ پرور' 'سید صاحب' 'میری جان' 'قبلہ و کعبہ' 'پیرومرشد' وغیرہ چھوٹے چھوٹے الفاظ ملتے ہیں جن سے وہ مکتوب الیہ کو مخاطب کرتے ہیں۔ 'یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت مطلوب' وغیرہ قسم کے جملوں سے انہیں سخت نفرت تھی

www.urduchannel.in

البتہ وہ مطلب کے ساتھ ساتھ اپنی خیریت اور مکتوب الیہ کی عافیت کا استفسار کر لیتے ہیں۔ بعض خطوط تو ایسے بھی ہیں جن کا انداز ایسا ہے جیسے دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اور سوال وجواب ہو رہے ہیں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ مرزا صاحب مکتوب الیہ کی سمجھ اور استعداد کے موافق اسے خط لکھتے تھے۔ ان سب خصوصیات کے علاوہ ان کے مکاتیب کی سب سے بڑی خوبی ان کا 'اسلوب نگارش' ہے اور 'شوخی تحریر' ہے جو ان کی زندگی جاوید کی ضامن ہے۔ مرزا صاحب کے خطوط کی مقبولیت نے مکاتیب کی اشاعت کا دروازہ کھول دیا چنانچہ ان کے بعد بہت سے صاحبان علم وفن کے خطوط کے مجموعے شایع ہو کر منظر عام پر آنے لگے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ان سب پر اظہار خیال کرنا طوالت سے خالی نہیں اور ہمارے موضوع سے بھی باہر ہے جن اکابر کے مکاتیب اب تک شایع ہوئے ہیں ان میں سے بعض ممتاز اصحاب کے نام یہ ہیں:-

سرسید احمد خان' آزاد' حالی' محسن الملک' مشتاق حسین' اکبر آبادی' امیر مینائی' مولانا محمد علی' اور شبلی۔

علامہ شبلی مرحوم کے مکتوبات کے دو مجموعے شایع ہوئے ہیں' ایک 'مکاتیب شبلی' کے نام سے دو جلدوں میں جن کی ضخامت علحدہ علحدہ ۳۴۹' و ۲۶۱ صفحات ہے اور جن کے مرتب مولانا سید سلیمان ندوی ہیں' دوسرا 'خطوط شبلی' کے نام سے جو ۸۲ خطوط پر مشتمل ہے اور جسے مولوی محمد امین زبیری نے ترتیب دیا ہے۔ اول الذکر کے مخاطب مرد ہیں اور آخر الذکر کا تخاطب عورتوں سے ہے۔ ترتیب اور جنسیت کا لحاظ کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں پر علحدہ علحدہ اظہار خیال کیا جائے چنانچہ ہم پہلے 'مکاتیب شبلی' کو لیتے ہیں:-

عربی خطوط

مولانا نے کچھ خطوط عربی میں لکھے ہیں۔ یہ زیادہ تر علماء مصر کے نام ہوتے تھے اس لئے دستیاب نہ ہو سکے اور انہیں مجموعہ مکاتیب میں جگہ نہیں مل سکی۔ مکاتیب جلد دوم کے آخری صفحات پر صرف تین خطوط درج ہیں جن میں غالباً تبرکاً درج کیا گیا ہے۔ پہلے خط کے مکتوب الیہ کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ دوسرا خط نواب سید علی حسن خاں صاحب کے نام ہے اور تیسرے کے مخاطب مولوی سید عبد الحئی صاحب ہیں۔

فارسی خطوط

سنہ ۱۸۸۲ء/۱۳۰۰ھ سے پہلے مولانا فارسی میں خط وکتابت کیا کرتے تھے ان خطوط کو عموماً قلم برداشتہ لکھتے تھے مگر ان میں کچھ خط ایسے بھی ہیں جو نہایت محنت اور کاوش کے ساتھ تحریر کئے گئے ان کی زبان نہایت صاف' سادہ' رواں اور با محاورہ ہے۔ کہیں کہیں عبارت مقفی بھی ملتی ہے مگر اس میں تکلف نہیں پایا

www.urduchannel.in

جاتا۔ نمونہ کے طور پر ہم یہاں دو خط نقل کرتے ہیں :-

(۱) "بگرامی خدمت جناب والد ماجد"

مرا دو ماہ می گذرد کہ ترک وطن کردہ ام۔ و بہ بیگانگاں بسر بردہ ام
بست و پنج روپیہ عنایت شدہ بود۔ سہ روپیہ بہ کرایہ از اعظم گڈھ
تا جون پور رفت۔ ہفت روپیہ صرف ریل تا بہ سہارن پور شد۔ و
پنج روپیہ از آں جا تا بہ لاہور۔ دہ روپیہ باقی ماند۔ اول کہ دریں جا
رسیدم دو یک روپیہ بحوائجِ ضروریہ کہ در وقت قیام جائے پیش می آید
صرف شد۔ چوں دریں جا جائے قیام نبود مکانے بہ کرایہ یک روپیہ
گرفتم۔ دو ماہ را دو روپیہ کرایہ می شود۔ انچہ باقی ماند بہ صرف طعام آمد
اگر انصاف روا بہ چنداں کفایت بسر بردہ ام کہ بیش ازاں متصور نیست
چوں مزاج عالی اندکے برہمی داشت از تکلیف ارسال حرف باز ماندم
اکنون کار مشکل افتادہ است۔ دیگر چہ گویم۔ تاخیر آزار تمام باعث
خواہد بود۔ حاداب۔ شبلی نعمانی سنہ ۱۲۸۹ھ" ؎۱

---

(۲) باز گلبانگ پریشاں می زنم ؛ آتشے در عندلیباں می زنم
حجلۂ گل بہرِ من کردند و من ؛ سر بہ دیوارِ گلستاں می زنم

المہدی باللہ

حیاک اللہ، دی با کالون صاحب برخوردم، از نام و نسب پرسیدم ہمہ باز گفتم
بہ تعلیم تمام پیش آمد و معذرت خواست کہ ارسال صحف اردو دگر نتوانم
دل زدہ بخانہ رسیدم و از دیوان غیب تفاول خواستم، ایں شعر آمد :- تخلص

آنچہ سعی ہست من اندر طلبت بنمودم
ایں قدر ہست کہ تغیر قضا نتواں کرد

ناامیدی را خیر مقدم گفتم و در پس زانوئے حرماں نشستم، ہمانا در دل خواہی گفت
کہ با ایں ہمہ آزادی بہ بیتے دل بستن، کاسۂ آرزو بہ سر پاس شکستن یعنی چہ
مگر چہ تواں کرد کہ سر بہ سنگ آمد و فسحت خانۂ دل از تراکم افکار تنگ آمد، دو
سہ سالے است کہ پائے طلب در دامن کشیدم و بجزیرے نہ رسیدم۔ عزیزاں
گویند کہ بغیر از تعلیم انگریزی نخواہی بسر برد۔ ایں خود چہ حرف است۔ جمعے راہ بیں
کہ ہیچ از انگریزی نخواندہ اند و باز بمناصب جلیلہ میرسند۔ آخر در تحصیلداری وغیرہ
او خود مشروط نیست۔ فی الجملہ ستیزۂ چرخ و آویزش بخت برانم آورد کہ
لختے از عمر بہ بادیہ پیمائی و ہرزہ درائی گذارم، اینک عزم سفر کردہ ام۔ می بینم تا
چرخ را دریں پردہ چہ نیرنگ ہست۔ والسلام، شبلی نعمانی ؎۲

؎۱ مکاتیبِ شبلی، جلد دوم، طبع دوم، ص ۲۳۶ (مطبع معارف)۔ ؎۲ مکاتیبِ شبلی جلد دوم ص ۲۳۹ - ۲۴۰ (مطبع معارف)

www.urduchannel.in

مولانا اپنے فارسی خطوط کو بہت عزیز رکھتے تھے اور انہیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے چنانچہ اکثر خطوط میں مکتوب الیہ کو تاکید بھی کر دیتے ہیں کہ ان خطوں کو حفاظت سے رکھو اور ضایع نہ ہونے دو :۔

"این علیف را بہ عزیزی محمد سمیع یا عبد الحمید خواہند سپرد و ضایع نہ خواہند فرمود" ؎۱

ان خواہش تھی کہ ان کے فارسی خطوط شایع کر دے جائیں چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"جناب مولانا محمد فاروق صاحب کو ہمارے فارسی نامے اور غزلیں جو تمہارے پاس موجود ہوں جلد بھیجدو" ؎۲

اردو خطوط اور ان پر تبصرہ مولانا اپنے اردو خطوط کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے اور انہیں 'ہفوات' سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ جب مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا کی بلا اطلاع 'الندوہ' میں جس کے وہ اس زمانہ میں اڈیٹر تھے ان کے خطوط کے سلسلے میں اعلان شایع کر دیا تو مولانا بہت برہم ہوئے۔ مگر پھر راضی ہونا پڑا کیوں کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی کے اصرار پر شیروانی صاحب کو لکھتے ہیں :۔ "سید سلیمان میرے خطوط جمع کر رہے ہیں، کیا آپ کے پاس میرے کچھ ہفوات غلطی سے محفوظ ہوں گے۔" ؎۲

اگر سید سلیمان صاحب اتنی جرات نہ کرتے تو ادب اور لٹریچر کا یہ بیش قیمت سرمایہ منظر عام پر نہ آتا کیوں کہ مولانا ان کی تشہیر نہیں چاہتے تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"میرے خطوط بالکل بے مزہ ہوتے ہیں ان کو کیا جمع کرتے ہو۔ مجھ کو خود مزا نہیں آتا تو اوروں کو کیا آئے گا" ؎۳

چھوٹوں سے شفقت، بڑوں کا ادب اور احترام اور دوستوں سے بے تکلفی اور راز و نیاز ان کے مکاتیب میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ہر شخص کی افتاد طبع اور مذاق کا خیال رکھتے ہوئے خط لکھتے تھے :۔

"شاگردوں کے خطوط میں علمی و اصلاحی مشورے نظر آئیں گے۔ مولانا حبیب الرحمن خاں کے خطوط میں زیادہ تر فارسی شاعری، نوادر کتب اور ندوہ کے متعلق باتیں ہیں۔ پروفیسر

؎۱ بحوالہ دیباچہ مکاتیب شبلی جلد اوّل ص ۵۔ ؎۲ مکاتیب شبلی جلد اول طبع دوم ص ۱۷۹
؎۳ مکاتیب شبلی، جلد اوّل، طبع دوم، ص ۲۲۳۔

www.urduchannel.in

عبدالقادر سے ادب و تاریخ فارسی مباحث پر گفتگو ہے۔ مولانا حمیدالدین صاحب سے تفسیر اور سیرۃ پر مکالمات ہیں۔ مسٹر عبدالماجد سے 'مغربیات' کی باتیں ہیں۔ مسٹر مہدی صاحب مصنف دائرہ ادبیہ کے خطوط میں 'محاسن ادبی' اور 'لطافت شعری' پر گلفشانیاں ہیں'' ۵

مراسلہ اور مکالمہ | ایک آدھ خط ایسا بھی ملتا ہے جس میں سرتا بقدم غالب کے طرز کی پیروی کی گئی ہے اور مکاتبہ کو مکالمہ بنا دیا ہے جس میں بات چیت کے علاوہ 'ڈرامائیت' بھی پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ ڈرامہ کے کردار بھی منتخب کر لئے گئے ہیں' محمد سمیع کے نام کا ساتواں خط درج ہے :-

''

مجلس

حاضران مجلس :- مولوی محمد عمر صاحب[۱]، محمد سمیع[۲]، عبدالغفور[۳]، حافظ حسن علی صاحب[۴]، مولوی احمداللہ[۵] - بھئی کچھ سنا ہے؟ (محمد سمیع) خیر تو ہے، ہاں ایک تازہ واقعہ ہے۔ میاں شبلی کا انتقال ہو گیا۔ (محمد سمیع) ارے سچ، نہیں جھوٹ ہوگا۔ ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا ان کا ایک خط میرے نام آیا تھا۔ (مولوی محمد عمر صاحب) تو تم نے آج سنا ہے، اجی اس کو کئی دن ہوئے۔ انہوں نے جو کتابیں بھیجی تھیں اس کی رسید بھی تو میں نے اسی وجہ سے نہیں دی۔ (محمد سمیع) انا للہ.... افسوس، ابھی مرنے کے کوئی دن تھے۔ (حمید) ہاں واقعی سخت رنج ہے مگر تقدیر سے کس کا زور چلتا ہے (اور دبی زبان سے) ارے میاں چلو قصہ پاک ہوا۔ آئے دن کی حکومت سے دم ناک میں آگیا۔ بھلا روئداد تو خیر ایک بار کا کام تھا، لکھ بھی لیا۔ اب روز روز مدرسہ میں لڑکوں کو مسودہ لکھاتے پھرو، اسی طرح یہ کہ ہفتہ وار مدرسہ کی رپورٹ لکھ کر ان کے پاس بھیجتے رہو۔ اچھی خاصی بیگاری بھگتا کرو (عبدالغفور) ارے میاں خیر مرنا تو سب کے لئے ہے۔ ہاں ان کے خط کا جواب رہ گیا مگر یہ بھی کوئی زبردستی ہے۔ جی نہ چاہے تو مفت کی محنت کون گوارا کرے۔ (حافظ حسن علی صاحب) تو ابکی ان کو خط لکھتے لکھتے رہ گیا۔ امتحان کا حال لکھنا تھا۔ اور جو کچھ ہو آدمی تو مزے کا تھا، دوگھڑی کیفیت رہتی تھی۔ (مولوی محمد عمر صاحب) بھئی کیا کہئے دنگی ہی جاتی رہی اور تو کس کام آدمی تھا، مگر ہاں ذرا جی بہل جایا کرتا تھا۔ (مولوی احمداللہ) اجی جی کیا بہلتا تھا، دنیا بھر کی شکایتیں ہوا کرتی تھیں۔ کبھی ان کی نقل کی، کبھی ان کا خاکہ اڑایا اور اس کے سوا ان کا کام ہی کیا تھا۔ چلو اچھا ہوا۔

---

۵ - دیباچہ مکاتیب شبلی جلد اوّل - ص ۱۰-

www.urduchannel.in

یا خوش قسمتی سے ایسے ایسے عزیز و احباب ہاتھ آئے ہیں۔
لوگ کہیں گے کہ کیا حماقت کی ہے مگر خدا کی قسم دل کی چوٹ اور جذبات
کی عنایت کا پورا جریہ ہے۔ تمہیں انصاف کرو خط لکھنا کم بخت کون سا
کام ہے مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا۔" [1] شبلی نعمانی
۷ فروری ۱۸۹۴ء

اختصار الفاظ مولانا بڑے سے بڑے مطالب اور لمبے سے لمبے مضمون کو چند سطروں میں لکھ جاتے ہیں خط کا محض مختصر یا الفاظ کا کم ہونا' خوبی نہیں بلکہ خوبی یہ ہے کہ وسیع سے وسیع مضمون کو چند لفظوں میں ادا کر دیا جائے اور اس طرح کہ مطالب کے اظہار میں کمی نہ ہونے پائے اور وہ بے کم و کاست ادا ہو جائیں 'زبان پر قدرت' اسی کا نام ہے مثلاً :-

(۱) " مکرمی' عنایت نامہ پہونچا۔ آپ کا خط بھی ایک دلچسپ آرٹکل ہوتا ہے لیکن اگر اس کی داد دوں تو ہم دونوں 'حاجی' ہوئے جاتے ہیں....." [2]

(۲) " مکرمی' حیدرآباد کی پولٹیکل زمین میں سخت بھونچال آیا وزارت کا قبلہ مشرق سے مغرب کی طرف بدل گیا" [3]

(۳) " .... لوگ اکبری یا عالمگیری ہیں مگر میں جہانگیری ہوں۔ الندوہ کے آئینہ میں جہانگیر کی صورت دیکھئے گا" [4]

(۴) " ..... ان کو (زہرا) قرآن مجید بھیجا تھا۔ وہ قیمت پوچھتی ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں شبلی صاحب قلم ہے صاحب دوکان نہیں" [5]

مولانا کے کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جن میں صرف چند الفاظ پر اکتفا کی گئی ہے۔ کہیں صرف 'ہاں' اور 'ناں' میں جواب دیدیتے ہیں' کہیں سلام پر خط کو ختم کر دیتے ہیں' کہیں محض اپنے نام پر اکتفا کیجاتی ہے کہیں اس کے ساتھ ایک آدھ لفظ کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً :-

(۱) " خاتون محترم زہرہ فیضی۔ سلام علیکم"
شبلی حیدرآباد' مکان معتمد کرہٹری
۷۔ فروری ۱۹۰۷ء
[6]

(۲) " زودمی آیم و ایں ہم دیرست" [7]
نعمانی ۱۹۔ اگست ۱۹۱۹ء ندوہ

---

[1] مکاتیب شبلی، جلد اوّل ص ۶۲۔۶۴ [2] مکاتیب شبلی، جلد دوم ص ۲۰۱ [3] مکاتیب شبلی اول ص ۱۲۷۔
[4] مکاتیب " " اول ص ۱۶۷۔ [5] خطوط شبلی (تاج کمپنی) ص ۴۶۔ [6] خطوط شبلی ص ۱۱۶

www.urduchannel.in

(۳) "چہ شود گر بہ سلامے دل ما شاد کنی" ۱ھ
شبلی ۱۹ اپریل ۱۹۰۹ء

اس اختصار کی معراج ملاحظہ ہو، مہدی الافادی مرحوم کو لکھتے ہیں :-

" شبلی "

یہ خطوط کاہے کو ہیں 'تار' ہیں مگر تار بھی تو اتنے مختصر نہیں ہوتے -

---

جواب بہ واپسی ڈاک مولانا کی مختصر نویسی بیان ہو چکی - اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ وہ جواب دینے کو بار سمجھتے تھے اور سر کا بوجھ اتار پھینکنے کی کوشش کرتے تھے بلکہ جواب دینے کے وہ سختی سے پابند تھے بیماری وغیرہ میں بھی اگر وہ خود نہ لکھ سکتے تھے تو دوسروں سے لکھوا دیتے تھے ۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی خط تشنۂ جواب رہ جائے - انتہا یہ ہے کہ انہوں نے ضروری ڈاک کے لئے ایک ملازم بھی رکھ لیا تھا - ایک خط میں مولانا حبیب الرحمن صاحب کو لکھتے ہیں :-

"اصل یہ ہے کہ میری تمام بیماریوں کا سبب معدہ کا فساد ہے اور اب تک نہیں گیا - غذا ٹھیک ہضم نہیں ہوتی ۔ کئی کئی وقت بھوک نہیں لگتی - کبھی نفخ رہتا ہے کبھی قبض اور اکثر تبخیر ۔ ان اسباب سے نہ تو قوت آتی ہے نہ ظاہر حال میں تندرستی معلوم ہوتی ہے ۔ شب و روز پلنگ پر پڑا رہتا ہوں ضروری ڈاک کے لئے ایک ملازم بمشاہرہ دس روپے رکھ لیا ہے ۔ والسلام" ۲ھ

القاب و آداب مولانا القاب و آداب کی مطلق پروا نہ کرتے تھے - اکثر خطوط ایسے بھی ہیں جن میں سرے سے ان کا پتہ ہی نہیں ہے ۔ جس طرح بلا تمہید کے وہ قصیدہ کہتے اور فوراً حرف مطلب پر آجاتے تھے اسی طرح خطوط میں بھی بلا تمہید کے 'آغاز مطلب' شروع ہو جاتا تھا - یا بہت خیال ہوا تو 'سیدی' 'مطاعی' 'جناب من' 'قبلہ ام' 'مکرمی' 'برادرم' 'عزیزی' 'محبی' 'مولانا' 'قرۃ العینی' 'خاتون محترم' 'مکرمہ' لکھ دیا اور حرف مطلب شروع کر دیا ۔ بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن میں القاب کے بجائے مکتوب الیہ کو نام لیکر مخاطب کر لیا

مثلاً :- مولوی عبدالسلام، عزیزی معین الدین،

تاریخ اور سنہ کا اہتمام البتہ کرتے تھے ۔ شاید ہی کوئی خط ایسا ہو جس میں تاریخ نہ ہو -

---

۱ھ خطوط شبلی - ص ۱۲۶ - ۲ھ مکاتیب شبلی، جلد اول ص ۱۱۲

www.urduchannel.in

سوادِ خط | شروع شروع میں مولانا کا خط 'شکستہ' تھا پھر 'نستعلیق' لکھنے لگے تھے لیکن کچھ دنوں کے بعد شکستہ اور نستعلیق کے امتزاج نے ان کے خط میں ایک عجب شان پیدا کردی تھی۔ ایم۔ مہدی الافادی مرحوم لکھتے ہیں :-

> "..... سوادِ خط اتنا پیارا تھا کہ میں نے عمدہ عمدہ ولایتی کاغذ اور لفافے بہم پہونچائے کہ تحریر کی حسنِ ظاہری کی چمک دمک کچھ اور بڑھ جائے۔ لیکن طبیعت (مولانا کی طبیعت) اس کی پابند نہ رہتی تھی۔ کبھی کارڈ برتاتے تھے کبھی اس طرح لکھتے تھے کہ کاغذ اور' لفافہ اور' تاہم میرے پاس بعض خطوط ایسے ہیں جو اس لائق ہیں کہ ان کے عکس ہاف ٹون کا بیاں لی جائیں" ۵؎

مکاتیب کی تعداد | مولانا کے خطوط کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ان کے بہت سے خطوط کو مکاتیب کی جلدوں میں جگہ نہیں ملی ہے ان میں صرف مولانا کی وہ تحریریں نظر آئیں گی جن سے ان کی سوانح زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہے یا کسی علمی' اصلاحی' ادبی' اور قومی کام کا ذکر ہے۔ مکاتیب کی جلدوں میں مولانا کے جتنے خطوط ملتے ہیں وہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی :-

> " ہزاروں خطوں کے انبار میں سے یہ چند دانے چھانٹ کر الگ کئے گئے ہیں"

مکاتیب شبلی جلد اول کے رقعات کی تعداد حسب ذیل ہے :-

سرسید احمد خاں کے نام ۳' نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خان کے نام ۲' شیخ حبیب اللہ کے نام ۴' شیخ عجیب اللہ کے نام ۳' ماموں کے نام ۳' مسٹر محمد اسحاق کے نام ۲۶۔ مولوی حکیم محمد عمر کے نام ۳' مولوی محمد سمیع کے نام ۵۷۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں کے نام ۱۱۹' پروفیسر عبدالقادر کے نام ۴' منشی محمد امین کے نام ۳۱' مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ۳۹' مولانا عبدالماجد کے نام ۲۰۔ عبدالحکیم دسنوی کے نام ۷' مولانا عبدالحی کے نام ۴' سید نواب علی کے نام ۵' مولانا محمد علی ناظم ندوہ کے نام ۵' ملا عبدالقیوم کے نام ۳' شیخ رشید الدین انصاری کے نام ۳' حکیم غلام غوث کے نام ۴' سید نظیر الحسن رضوی کے نام ۲' طلباء دار العلوم ندوہ کے نام ۱' مفتی عبداللہ کے نام ۱' سید افتخار عالم کے نام ۱' محمد محسن خاں بلگرامی کے نام ۲' احمد مرتضیٰ کے نام ۲' منشی شرف الدین کے نام ۱' شاہ سلیمان کے نام ۱

۵؎ بحوالہ دیباچہ مکاتیب شبلی جلد اول' ص ۷۔

www.urduchannel.in

مولوی عبدالغنی کے نام ۱، مولانا خلیل الرحمن کے نام ۱، اڈیٹر جرائد اسلامیہ کے نام ۱، مولوی عبداللہ صاحب بلوچی کے نام ۱، مہتمم دارالاخبار انجمن اسلامیہ کے نام ۱، اڈیٹر الناظر کے نام ۱، مسٹر شاکر اڈیٹر ادیب کے نام ۱، مولوی ظفر علی خاں کے نام ۱، اڈیٹر زمیندار کے نام ۱، جرائد اسلامیہ کے نام ۱، فاطمہ خانم کے نام ۳، حامد حسین نعمانی کے نام ۱، مولوی حسین عطاء اللہ کے نام ۲، حامد قادری کے نام ۳، نواب وقار الملک کے نام ۱، ماسٹر محمد شفیع کے نام ۱

مکاتیب جلد دوم کے اردو خطوط کی تعداد :-

۷۷۔ مولوی عبدالحمید کے نام ۸۲ سید سلیمان ندوی کے نام ۳۳ مولوی مسعود علی ندوی کے نام ۱۰ مولوی ضیاء الحسن ندوی کے نام ۸ مولوی عبدالسلام ندوی کے نام۔ ۸ مولوی عبدالباری ندوی کے نام۔ ۲ مولوی معین الدین ندوی کے نام ۹ مولوی سید ابوظفر ندوی کے نام ۱۵ نواب سید علی حسن کے نام۔ ۳۳ مولوی محمد ریاض حسن کے نام۔ ۷۹ ایم مہدی حسن کے نام۔ ۱ اڈیٹر رسالہ زمانہ کے نام۔ ان کے ساتھ ساتھ ۳۳ فارسی کے خطوط اور ۳ عربی کے بھی ہیں۔

مولانا خط لکھنے میں بہت کم کرتے تھے اور اپنے کو ہمیشہ لئے دئے رہتے تھے یہاں تک کہ اپنے مخلص دوستوں کے سامنے بھی انہوں نے کبھی اپنے کو ہلکا کرکے پیش نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کہیں وہ مخاطب کے لئے بار خاطر تو نہیں۔ چنانچہ اکثر تحریروں میں ان کی شخصیت کا یہ پہلو بہت ہی نمایاں ہوگیا ہے۔ ایم مہدی حسن جن سے مولانا نہایت ہی بے تکلف تھے انہیں اپنے ایک خط مورخہ ۲۸۔ اگست ۱۹۰۸ء کو لکھتے ہیں :-

> "اس فرعونیت کو دیکھئے کہ ان شہنشاہوں کو بھی ابتداً نہیں لکھتا پھر آپکو شکایت کا کیا موقع" ۵؎

اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ اُن شہنشاہوں کے دربار میں بھی مولانا کبھی جھک کر نہیں جاتے اور اپنی آن بان میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیتے۔ بعض مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں جب خود داری کا خیال بھی دل میں نہیں آتا۔ بربنائے خوف و عظمت، نہیں بلکہ بربنائے خلوص و محبت، مگر مولانا

۵؎ مکاتیب شبلی، جلد دوم۔ ص ۲۱۸۔

www.urduchannel.in

(جن کا نام غالباً "زُہرہ" تھا) یہاں زَہرا ہے اور ص ۲۷۰ میں زُہرہ۔ مراد ایک ہی بیوی ہے۔
زَہرا اور زُہرہ نام ہیں جدا جدا۔

www.urduchannel.in

ایسے مواقع پر بھی اپنی فطری خودداری کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ مولانا نے زہرا فیضی کے ایک خط میں صرف سلام علیکم پر اکتفا کی تھی، وہاں سے مختصر نویسی کی شکایت لکھ کر آئی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:-

"میں نے 'سلام علیکم' بھی لکھا۔ لیکن آپ صاحبوں نے تو مطلق یاد بھی نہیں کیا۔ شاید آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ میں بار خاطر ہونے سے بہت پرہیز کرتا ہوں جب میں وہاں تھا یا جب کبھی آپ لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کا ہر وقت کھٹکا رہتا ہے کہ میری ملاقات سے آپ گھبرا نہ گئی ہوں یہی حالت خطوط لکھنے کی ہے اور جب دیکھتا ہوں کہ آپ صاحبوں کے خطوط کبھی ابتداً نہیں آتے بلکہ میرے خط کے جواب میں آتے ہیں تو سمجھ لیتا ہوں کہ کیوں بار بار زحمت دوں اور زبردستی ایسے جواب حاصل کروں۔ بہرحال مختصر نویسی کا یہی سبب ہے ورنہ میں دفتر لکھ کر بھی سیر نہ ہوں" [1]

پھر اسی دربار سے ایک مرتبہ مولانا کی بے التفاتی کی شکایت ہوتی ہے جس کے جواب میں مولانا رقمطراز ہوتے ہیں:-

"افسوس ہے کہ آپ کا میری نسبت یہ خیال رہا کہ میں آپ کے خطوط کا جواب بے التفاتی سے دیتا ہوں اس پر یہ ستم کہ آپ نے یہ چور آج تک چھپائے رکھا" [2]

ایک اور خط میں زہرا فیضی کو عطیہ کے خط نہ لکھنے کی شکایت کرتے ہیں:-

"میرے خط کا جواب عزیزی موصوف نے نہیں لکھا۔ شاید کسی بات سے ناراض ہوگئی ہوں یا جلد جلد خط وکتابت کرنا خلاف شان سمجھا ہو بہرحال میں بھی اب پیش دستی نہیں کرتا" [3]

مولانا کی کسی تحریر میں داد دہش اور انعام کے معنی میں 'عطیہ' کا لفظ آجاتا ہے۔ عطیہ فیضی مولانا سے لفظ عطیہ کی شکایت کرتی ہیں اس کے جواب میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:-

"تم شاید اس کو حسن طلب سمجھتی ہو اور میں شہنشاہ سے بھی اس قسم کا خیال ننگ سمجھتا ہوں" [4]

متذکرہ بالا اقتباسات میں نے عمداً 'خطوط شبلی' سے دئے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے مخاطب وہ ہیں جنہیں مولانا بہت ہی عزیز رکھتے تھے اور جن کے اخلاق وعادات، تعلیم وتربیت، تحریر وتقریر،

---

[1] خطوط شبلی ص ۱۱۷۔ [2] خطوط شبلی ص ۱۹۔ [3] خطوط شبلی ص ۱۰۳۔
[4] خطوط شبلی ص ۸۴۔

www.urduchannel.in

سخن سنجی اور سخن فہمی کے نہ صرف بہت معترف اور مداح تھے بلکہ ان سے متاثر بھی ۔

شوخیٔ تحریر اور سنجیدہ ظرافت

الفاروق، الماموں، الغزالی، سیرۃ النعمان، الکلام، علم الکلام اور سوانح مولانا روم جیسی سنجیدہ اور متین کتابوں کے مصنف سے کسے توقع ہو سکتی تھی کہ اس کے قلم سے ایسے شوخ اور دلچسپ فقرے بھی نکل سکتے ہیں جو درحقیقت چمنستانِ ادب کے لئے باد بہاریں کا حکم رکھتے ہیں مولانا کے چہرے پر ثقاہت کی جھریاں دیکھنے والے یہ دیکھ کر یقیناً متحیر ہوں گے کہ ان جھریوں کی تہ میں لطافت و شعریت، رنگینی اور دلکشی کے خزانے بھی پوشیدہ ہیں ۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی ایک غزل بھیجتے ہیں، مولانا جواب میں لکھتے ہیں :-

"غزل دیکھی سنا ید نامہ و پیام ہو چکا ہے، صرف عقد رہ گیا ہے اگر ایسا ہے تو خدا مبارک کرے ..... " ۵۱

دوسرے خط میں ارشاد ہوتا ہے :-

" باقی غزلیں بھی بھیجئے اور اگر دلوان لوکر نا منظور ہے تو وصال کی تاریخ ٹالتے جائیے، ورنہ وہ ناسور بند ہو جائے گا۔ " ۵۲

حبیب الرحمٰن خان شروانی کی شادی کی اطلاع پر لکھتے ہیں :-

" مگر حضرت یہ اکل کھرا پن کیسا، خبر تک نہ کی، دعوت میں بلانا تو بڑی بات ہے خیر خوش رہئے ۔ نیازمندوں کی خدمت بڑھ گئی یعنی ایک جان کے ساتھ دو جانوں کی سلامتی کی دعا ذمہ ٹھہری " ۵۳

ایک اور بے تکلف دوست کو لکھتے ہیں :-

" بے شبہ میری خواہش ہے کہ چند روز دنیا سے الگ رہ کر سیر کروں ایسی حالت میں ایک تصنیف بھی انجام پا جائے لیکن دن رات تو وحشت کدے میں بسر نہیں ہو سکتی شنیعوں کے علمی فلسفہ کی کوئی صورت پیدا ہو تو البتہ ممکن ہے " ۵۴

---

۵۱ مکاتیب شبلی، جلد اوّل ص ۱۲۸ ۵۲ مکاتیب شبلی جلد اول ص ۱۲۹

۵۳ مکاتیب شبلی، جلد اوّل ص ۱۴۰

۵۴ مکاتیب شبلی جلد اوّل ص ۲۶۶ ۔

www.urduchannel.in

ایم۔ مہدی الافادی مرحوم سے مولانا سب سے زیادہ بے تکلف تھے یہاں تک کہ بقول مہدی مرحوم کوئی بات ان سے راز نہ رکھتے تھے۔ مولانا کے یہاں بچہ پیدا ہوتا ہے، مہدی کو اطلاع دیتے ہیں :-

"اس پیرانہ سری میں خدا نے مجھ کو پھر باپ بنایا۔ کتاب سے گھبراتا ہوں تو اس سے جی بہلاتا ہوں۔ شاہ صاحب کہاں ہیں، بیگم صاحب سے کوئی نیا ثمر ہاتھ آیا یا نہیں" ؎۱

مولانا نے ایم۔ مہدی حسن سے کسی شخص کے حسن و جمال کی تعریف کی اتفاقاً انہیں اس کی نقلی تصویر مل گئی جسے انہوں نے فوراً مولانا کی خدمت میں روانہ کر دیا، مولانا رسید لکھتے ہیں :-

"استغفراللہ، وہ تو کسی بیچا یا لولو کی تصویر ہے۔ آپ کے حسن ظن کی داد دیتا ہوں۔ اس مذاق کا آدمی شعر العجم لکھ چکا" ؎۲

ایک اور خط کے دو جملے ملاحظہ ہوں :-

"اب تو خدا کے لئے یہی چلئے۔ تحصیلداری میں ایک مہینہ کی رخصت کچھ بڑی زیبائی نہیں، وہاں کے سب مصارف میرے ذمہ۔ اس میں صرف ایک مستثنیٰ ہے ...... لیکن آپ یا بھاوج صاحبہ ہر دفعہ دامن بچا جاتے ہیں۔ ہم جیسے نفوس قدسیہ سے بھی پردہ اور وہ بھی ساٹھ برس کے بعد" ؎۳

آپ نے دیکھا ؟ ان دبی ہوئی شوخیوں میں کیسی لطافت اور کتنی دلکشی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان سے صرف خواص ہی لطف اٹھا سکتے ہیں، عام مذاق کی چیز نہیں۔

اشارے

مولانا کے خطوط جو اُن کے بے تکلف اور مخلص دوستوں کے نام ہیں ان میں ہمیں ایک نئی چیز ملتی ہے جو ان کے اور دوسرے خطوں میں نظر نہیں آتی یہ نئی چیز یا خصوصیت مولانا کے لطیف 'اشارے' (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۶۵)

؎۱ مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۲۰۰ ؎۲ مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۲۱۹
؎۳ مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۲۳۴ -

www.urduchannel.in

ہیں ۔ اسی خصوصیت کو مہدی الافادی مرحوم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

"بہرحال خطوں میں نسبتاً کم کھلتے ہیں لیکن مجھ پر خاص عنایت تھی ۔ اس لئے رازمیں رکھتے تھے تاہم تصریحات کی جگہ آپ دیکھیں گے چشم سخن صرف اشاروں سے کام لیتی ہے ۔ میں اس لطف کو کھونا نہیں چاہتا اور یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر تصریح طلب نکتوں کی بے نقابی میں نے جائز نہیں رکھی ۔ میرا خیال ہے آفتابِ علم کی یہ ضیائے یک طرفہ (خطوط) ان کی مستقل تصنیفات کے مقابلے میں نسبتاً کم دلچسپ نہیں" [۱]

'اشاروں' میں ایک لطافت، ایک دلکشی اور ایک قسم کی 'رازیت' ہوتی ہے جو خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتی ہے ۔ انسانی طبایع کا خاصہ ہے کہ وہ 'راز' اور 'عقدہ' کی گرہ کشائی میں لطف انبساط محسوس کرتا ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ راز کی تہ تک پہونچ جائے اور جب نہیں پہونچ پاتا تو بار بار ایک نئے جوش' ایک نئے ولولے اور ایک نئے عزم کے ساتھ اس کی گرہ کشائی کی فکر میں لگ جاتا ہے ۔ کامیاب نہ ہونا ہی دراصل جاذبیت کا سرچشمہ ہے اور دلکشی کا خزانہ ہے ۔ ادھر راز کے چہرہ سے نقاب اٹھی نہیں اُدھر اس کی ساری جاذبیت اور تمام دلکشی فنا ہوگئی ۔ چنانچہ اسی خیال سے مہدی مرحوم نے اشاروں کی تفصیلات میں پڑنے سے گریز کیا ہے ۔ ہم جستہ جستہ مولانا کے ایسے اشاروں کو پیش کرتے ہیں :۔

(۱) "قرآن میں ہے کہ یہودی ذلیل وخوار کر دیے گئے لیکن کیا ۵ دسمبر کے لیے بھی جس دن کہ ... ایک یہودی کو ہاتھ آئی ۔ مشہور کیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہوگیا اسلئے تو نہیں کہ ع "میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا"
ع سبحہ را زنار کرد است وکند" [۲]

(۲) "وہاں کے سب مصارف میرے ذمے' اس میں صرف ایک مستثنیٰ ہے" [۳]

(۳) "مگر میری نسبت آپ کا دعویٰ عموم خود مجھ کو بھی تسلیم لیکن بمبی کی سی فیاضیاں کہاں ۔ تحریر کی بے مزگی سے مجھ کو حسن ظن نہیں پیدا ہو سکتا" [۴]

(۴) "بمبئی کا نعم البدل نہ سہی' برابر سرابر تو ہو ۔ کیا امید ہو سکتی ہے" [۵]

(۵) "آپ کے 'احرام جدید' کی داد دوں یا رشک کروں' ہاں بمبئی جاتا ہو شرط یہ ہے کہ خود گاڑی تک اُکر لوا جائیں ۔ کچھ ایسی بڑی بات نہیں

---

[۱] دیکھو دیباچہ مکاتیب شبلی ص ۸ ۔ [۲] مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۲۳۲ ۔ [۳] مکاتیب جلد دوم ص ۲۳۴ ۔
[۴] مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۲۲۲ ۔ [۵] مکاتیب جلد دوم ص ۲۲۴ ۔

www.urduchannel.in

> کوئی کیوں رشک کرے ۔ قاضی صاحب ہمارے کام کے آدمی نکلے ہیں نیچا سنتے ہوتے تو خوش صحبت بھی ہوتے ۔ جوان ہوتا تو ان سے باتیں کر لیتا ۔ بڑھاپے اذان دینا ذرا مشکل ہے ۔" ۵۱

(۶) "عبدالحمید حسن نے بینتیس ۳۵ برس تک یورپ کی پالیٹکس کے اوراق کا تماشہ کھیلا ہے اس کی اورینگ ٹرکی کی نسبت میرے دوست کی رائے صحیح ہے تو شاید کم وقعت فرقۂ جدیدہ ہند کی نسبت بھی اس کی رائے قابل وقعت ہوگی ۔ میں تو بخدا ان فقروں پر ایمان رکھتا ہوں گو کافر کے منہ سے نکلے ہیں ۔ ..... میں ایک گرل اسکول مع بورڈنگ قائم ہوا ہے جس کا سکریٹری اور مینیجر وہی سابق الذکر شخص ہے ۔ اس معرکہ گاہ کی تعلیم یافتہ دنیا میں کیا کام کریں گی آپ ہی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں ۔" ۵۲

خط نہیں مرثیے

مولانا ایک اثر پذیر اور حساس طبیعت کے مالک تھے اس لئے کسی شخص خصوصاً اپنے عزیز یا دوست کی موت پر ان کے قلم سے جو خطوط نکلے ہیں وہ تیر و نشتر کا حکم رکھتے ہیں اور ان میں جو تاثیر و اثر، جو صدق و خلوص، جو درد و کرب، جو رنج و غم اور جن بے تابیوں کی تصویریں ملتی ہیں ان کے مقابلے میں 'مرثیے' محض 'خاکہ' معلوم ہوتے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سانحہ خود انہیں پر گزرا ہے اور وہ درد و غم سے تلملا اٹھے ہیں ۔ اور ضبط کے باوجود 'آہ' نکل ہی گئی جو قلم کے وسیلے میں صفحۂ قرطاس پر بکھر گئی ہے ۔ مولوی محمد سمیع کو لکھتے ہیں :-

(۱) "برادر عزیز ۔ برادر مکرم مولوی محمد عمر صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ تمہاری والدہ کا انتقال ہو گیا ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ بھائی یہ خط لکھ کر میں تمہارا غم تازہ کرنا نہیں چاہتا ۔ میں اس درد سے خوب واقف ہوں ۔ اگر تمہیں صبر آ گیا ہو تو وہ بھی ایک مجبوری ہے ورنہ آدمی کا جگر اور یہ صدمہ ع

این غم آں مایہ نباشد کہ کسے بردارد

مگر آخر کیا چارہ ع شاد باید زیستن نا شاد باید زیستن ۔

اب تم پورے یتیم ہو اور سچ تو یہ ہے کہ سخت رحم کے قابل ہو ۔ بھائی جو لوگ ماں باپ کا اسلئے ماتم کرتے ہیں کہ وہ دنیاوی فائدوں کا مرکز تھے

---

۵۱ مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۲۲۴ ۔

۵۲ مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۲۲۲ ۔

www.urduchannel.in

ان بے دردوں کا مذکور نہیں ۔ ان کے دل سے پوچھیے جو والدین کی جھڑکیوں میں بھی دوسروں کے مرحبا سے بھی زیادہ مزہ پاتے ہیں۔ جن کو والدین کا طمانچہ بھی اصل ہمدردی کی یادگار بن کر سامنے آتے ہیں جن کو یہ خیال بے چین کردیتا ہے ہاں وہ کیا ہوئے جو ہماری تکلیفوں میں ہم سے زیادہ تڑپ جاتے تھے ۔ بھائی یہ لوگ قسمت سے ساتھ رہتے ہیں اور گئے تو پھر اپنا قائم مقام بھی چھوڑ نہیں جاتے ۔ ہائے یہ خیال اور ستاتا ہے کہ ان کی روحیں اب بھی چین سے نہیں ۔ ہمارا خیال اب بھی ان کے لئے مایہ آزار ہے خیر میری طرح تمہیں بھی خدا صبر دے ۔" لے

(۲) مولانا اپنے منجھلے بھائی مہدی کی خبرِ انتقال سمیع کو دیتے ہیں :-

" لو بھائی ۔ ہم میں کا ایک عنصر کم ہوگیا ۔ عزیزی مہدی نے جان دی اور کس حالت کے ساتھ کہ کلیجے کے ٹکڑے اڑ گئے ۔
میں بدبخت پاس تھا اور اسلئے جتنے تیر پھینکے سب میرے ہی جگر پر لگے ۔ ہائے اس کی جوانا مرگی ۔ ہائے کیا معلوم تھا کہ وہ اس قدر جلد دنیا سے جائے گا ۔ ورنہ مجھ پر لعنت اگر اس سے ناراض رہتا ۔
ہائے ۔ برائیوں میں وہ سب سے اچھا تھا ۔ آج چوتھا دن ہے لیکن خدا کی قسم اس وقت تک دل نہیں ٹھہرتا ۔ سو بار رو چکا ہوں اور دل نہیں ٹھہرتا ۔ اس کی ایک یادگار ہے جس کو وہ بہن کہتا تھا یعنی 'شافیہ' اس سے بار بار لپٹ کر رویا ہوں لیکن کچھ بھی تسلی نہیں ہوئی ۔ اس کو تسلی دینا چاہتا ہوں لیکن خود بے قرار ہو جاتا ہوں ۔ ایک 'اور' اس کے نام سے وابستہ بد قسمت ہے جو پہلے چھوٹی بھاوج تھی لیکن اب بیاری بہن ہے ۔ تم لوگ مزے سے باہر ہو ۔ ہاں آفت زدوں کو سنبھالنا میرے سر چھوڑا ہے ۔
ہائے مہدی ، وائے مہدی ۔
بدبخت ازلی ۔ شبلی ۔" لے۲

ایک ہی دو جملوں میں بار بار ایک ہی فقرہ کو دہرانا انشاء پردازی کے شایان شان نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی چیز جو انشاء پردازی کے لحاظ سے نقص معلوم ہوتی ہے خط کی جان ہے ۔ یہ شہادت دیتی ہے کہ اس کا خالق ہوش حواس کھو بیٹھا ہے ۔
'تال' 'وسم' کی ضرورت نغموں کے لئے ہوتی ہے ، نوحوں کے لئے نہیں ۔ بے ربط ہونے میں ہی اس کے اثر اور تاثیر کا راز مضمر ہے ۔

لے مکاتیب شبلی ، جلد اول ، ص ۷۷ - ۷۸
لے۲ مکاتیب شبلی جلد اول ص ۹۷ - ۹۸ ۔

www.urduchannel.in

تنقیدیں | مولانا کے خطوط میں ایک اور چیز جو نہایت دلچسپ اور قابل قدر ہے وہ ان کی تنقیدیں اور آرا ہیں جو کہیں کہیں ان کے قلم سے نکل گئی ہیں یہ تنقیدیں یا رائیں نہ صرف دوسروں کی تصانیف پر بلکہ خود اپنے اور اپنی کتابوں پر ہیں اور صرف کتابوں ہی پر نہیں بلکہ نظموں، غزلوں اور اشعار پر بھی ہیں۔ چند اقتباسات پیش ہیں :-

(۱) "کانفرنس اب کی بالکل پھیکی ہوگی۔ مولوی حشمت اللہ و مرزا حیرت کی بڑ بہت سُن چکے، مولوی حالی صاحب کا کوئی پارٹ نہیں۔ مولوی نذیر احمد خاں غالباً چپ رہیں اور بولیں بھی تو ان کا طرز اجیرن ہو چکا" ؎۱

(۲) "ایک کتاب مولوی حالی نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفہ بھیجی ہے۔ یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے۔ میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لئے پسند کیا اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں۔ دیکھو کہیں واپس نہ جائے۔ قیمت عہ ہے واقعی بے مثل ہے" ؎۲

(۳) "'حیات جاوید' کو میں لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل" ؎۳

(۴) "حیات جاوید میں مولانا نے سید صاحب کی یک رخی تصویر دکھائی ہے۔ .... بہرحال میں 'حیات جاوید' کو مدلل مداحی سمجھتا ہوں" ؎۴

(۵) "آزاد کا 'سخندان پارس' نکلا سبحان اللہ لیکن الحمد للہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا" ؎۵

(۶) "میری دانست میں اردو کی تمام عمدہ کتابیں آپ کے پاس موجود ہیں۔ آب حیات، نیرنگ خیال، حیات سعدی وغیرہ تہذیب اخلاق۔ بس یہی اس زبان کا گنجینہ ہے" ؎۶

(۷) "آزاد کی کتاب آج ویلو آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں تاہم وہ ادھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وہی معلوم ہوتا لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ لکچر تک اس نے میری سرحد میں قدم نہیں رکھا۔ بارھویں میں یہ میدان میں اترا ہے لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا اس لئے یوں ہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا" ؎۷

؎۱ مکاتیب شبلی، جلد اول، ص ۲۸ ؎۲ مکاتیب جلد اول ص ۷۵ ؎۳ مکاتیب شبلی جلد اول ص ۱۲۵

؎۴ مکاتیب شبلی جلد اول ص ۱۴۴ ؎۵ مکاتیب جلد اول ص ۱۴۹ ؎۶ مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۱۹۶۔

؎۷ مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۱۱۲ ۔

www.urduchannel.in

ایم مہدی الافادی مرحوم نے شعر العجم کے سلسلے میں ایک مضمون کا جواب لکھا تھا اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں :-

(۸) "کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے بھی نصیب ہوتے۔ دائرہ ادبیہ کا لکھنے والا شبلی کا معتقد ہو۔ یقین کرنے کی بات نہیں" [۱]

(۹) "شعر العجم کا پہلا حصہ آپ کے کام کا نہیں یعنی دلچسپ نہیں اس لئے دوسرا بھیجتا ہوں اس میں خواجہ حافظ کا حال دیکھئے گا۔" [۲]

(۱۰) "دوسرا حصہ (شعر العجم) کا تم پڑھ تو فارسیت کا صحیح مذاق پیدا ہو جائیگا۔" [۳] (پڑھو تو) ؟

(۱۱) "سرسید، حالی اور تمہارے حقیر دوست کی تصنیفات ناقدری کے قابل نہیں" [۴]

(۱۲) "بوئے گل" بھی اگر تم سمجھ کر پڑھو تو فارسی لٹریچر کی ادائیں کسی قدر معلوم ہو جائینگی" [۵]

خطوط شبلی مولانا کے خطوط کی طرزِ انشاء اور ان کی خصوصیات کا اوپر ذکر ہو چکا۔ یہ مجموعہ یعنی خطوط شبلی بھی اسی تحت میں آجاتا ہے لیکن اس کو عورتوں سے خطاب کی بنا پر بہت اہمیت دی گئی ہے اس لئے اس پر علحدہ اظہار رائے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جن وجوہ کی بنا پر اس مجموعہ کو اچھالا گیا ہے ان میں نہ کوئی ندرت ہے اور نہ اصلیت لیکن مبالغہ کرنے والوں کا یہانتک خیال ہے اگر "خطوط شبلی" منظر عام پر نہ آتے تو اصلی مولانا ہماری نظر سے چھپ جاتے مگر یہ وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جنہوں نے مکاتیب شبلی کا غور سے مطالعہ نہیں کیا اور سرسری طور پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے گذر گئے ہیں۔ معترضین کو مولانا کی جو رنگینی و شوخی جو ادائیں خطوط شبلی میں نظر آئیں اگر وہ مکاتیب شبلی کو بھی اسی تجسس کی نظر سے دیکھتے تو ان کو ان رنگینیوں کے لئے خطوط شبلی کا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ اور ان کی تابانیاں ان کو مکاتیب میں بھی نظر آجاتیں مگر نگاہ بدبیں کا بُرا ہو کہ ان کو حسن بھی عیب ہی نظر آتا ہے۔

اگر مولانا کے ان رقعات کا خطاب عورتوں کے بجائے مردوں سے ہوتا تو ان کی بھی صرف اتنی ہی قدر ہوتی جتنی مکاتیب کی ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خطوط کے مجموعہ کو مولانا کے خطوط ہونے کی وجہ سے اتنی اہمیت

---

[۱] مکاتیب شبلی، جلد دوم ص ۲۲۰ [۲] خطوط شبلی ص ۹۵ [۳] خطوط شبلی ص ۲۴
[۴] خطوط شبلی ص ۵۹ [۵] خطوط شبلی ص ۵۱۔

www.urduchannel.in

نہیں دی گئی بلکہ اس لئے زیادہ سراہے گئے ہیں کہ اس کی مخاطب عورتیں ہیں اور بدبینوں کو اپنے گمان کے مطابق مولانا کو مطعون کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا ۔ خطوط شبلی کے مطالعہ سے جو نتائج معترضین نے مرتب کئے ہیں وہ ان سے زیادہ نہیں :-

(۱) مولانا شبلی نے عورتوں سے بھی خط و کتابت کی ۔

(۲) مولانا شبلی بے پردگی کو برا نہیں سمجھتے تھے ۔

(۳) مولانا شبلی عورتوں کی تعلیم کے حامی تھے ۔

(۴) مولانا شبلی کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی ۔

(۵) مولانا شبلی نے اپنے جن خیالات کا اظہار ان خطوط میں کیا ہے وہ اپنی کسی اور تحریر یا تقریر میں نہیں کیا ۔

(۶) مولانا شبلی کے یہ خیالات دراصل عطیہ اور زہرہ فیضی کی صحبت اور انکے اثرات کا نتیجہ ہیں ۔

اب ہم ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ اظہار خیال کرتے ہیں :-

(۱) مولانا نے عطیہ اور زہرہ فیضی سے خط و کتابت کی اور مولانا کی ان سے راہ و رسم تھی ۔ مکاتیب شبلی میں ایم. مہدی حسن کے نام مولانا کے جو خطوط ہیں ان سے صاف طور پر اس خط و کتابت اور اس ربط و ارتباط کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان میں رنگ نسبتاً اور زیادہ گہرا ہے :-

"آپ میرے جس دوست کے پولیٹکل خیالات کے قدردان ہیں .... اس کے ایک خط (جو ابھی میرے پاس آیا ہے) کے یہ الفاظ ہیں .... میں تو بجز ان فقروں پر ایمان رکھتا ہوں گو 'کافر' کے منہ سے نکلے ہیں۔ .... میں ایک گرل اسکول مع بورڈنگ قائم ہوا ہے جس کا سکریٹری اور منیجر وہ قبل الذکر شخص ہے ۔ اس معرکہ گاہ کی تعلیم یافتہ دنیا میں کیا کام کریں گی آپ ہی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں" [۱]

مولانا نے صرف نام کا پردہ رکھا ہے ۔ 'جس دوست' اور چند نقطوں سے ان کی مراد جن سے ہے وہ بھی سُن لیجئے ۔ مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں :-

بتانِ ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے [۲]

---

[۱] مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۲۲۲ - [۲] عطیہ کی شادی ایک نومسلم پارسی سے ہوئی تھی -

www.urduchannel.in

طوالت کے خیال سے صرف ایک ہی مثال پر اکتفا کی جاتی ہے ۔

(۲) 'مولانا شبلی بے پردگی کو بُرا نہ سمجھتے تھے'۔ یہ نتیجہ ذیل کے خط سے مرتب کیا گیا ہے ۔

"میری اسکیم یا تجویز جو آپ کے متعلق ہے وہ یورپ سے آنے کے بعد قابل اظہار ہوگی ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لکچرار بن جائیں جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں لیکن اردو میں تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے صرف مشق کی ضرورت ہے ہم پرانے لوگ آزادی سے بے پردہ مجامع عام میں عورتوں کا تقریر کرنا پسند نہیں کرتے لیکن آپ تو اس میدان میں آچکیں ۔ اس لئے اب جو کچھ ہو کمال کے درجہ پر ہو" ؎۱

لیکن اگر غور اور انصاف سے دیکھا جائے تو نتیجہ اخذ کرنے کی غلطی ظاہر ہو جاتی ہے ۔ مولانا عطیہ کو اسپیکر اور لکچرار بننے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ وہ پردہ نشین خاتون نہ تھیں اور پھر یہ مشورہ اسوقت کے لئے تھا جیسا کہ خط کی پہلی ہی سطر سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ جب عطیہ ولایت سے واپس آجائیں اور اس کے لئے تھا جو آزاد معاشرت کی عادی اور بے پردہ تھی ~~اور بے پردہ تھی~~ اس وجہ سے تھا کہ ایک مسلمان لڑکی جو بے پردہ ہو چکی ہے اور جس میں تمام جوہر موجود ہیں کیوں انگریز اور پارسی قوم کی ممتاز عورتوں سے پیچھے رہے ۔ مولانا کا آخری جملہ یہ ہے :۔ "آپ تو میدان میں آچکیں اب جو کچھ ہو کمال کے درجہ پر ہو" ۔

(۳) 'مولانا شبلی عورتوں کی تعلیم کے حامی تھے'۔ بے شک تھے مگر اس خیال کی تشہیر صرف ان خطوں ہی سے نہیں ہوتی بلکہ مکاتیب میں بھی جا بجا مولانا نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے ۔ مثلاً مولوی محمد سمیع کو لکھتے ہیں :۔

"تم جانتے ہو کہ حسن صورت کی نوبت ہو چکی ۔ میری قسمت میں دونوں کا اجتماع نہ تھا ۔ اب کوئی چیز باعث تسکین ہو سکتی ہے تو صرف حسن سیرت ہے اس کے لئے سب سے مقدم تعلیم ہے" ؎۲

مذکورہ بالا اقتباس سے نہ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ 'مولانا عورتوں کی تعلیم کے حامی تھے' بلکہ وہ تعلیم کو عورتوں کی حسن سیرت کا سب سے بڑا جزو سمجھتے تھے ۔

(۴) 'مولانا شبلی کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی'۔ مولانا کو موسیقی سے صرف دلچسپی ہی نہ تھی بلکہ

؎۱ خطوط شبلی ص ۴۱ - ۴۲

؎۲ مکاتیب شبلی، جلد اول طبع دوم ص ۱۰۴

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

+ انگریزی [illegible] بغیر ادا کیا

بھی مطلب صاف ہے۔

www.urduchannel.in

وہ اس کے تمام قاعدوں سے بھی واقف تھے۔ ہاں کسی سے سیکھا البتہ نہ تھا۔ جو کچھ اخذ کیا کتابوں کے ذریعہ سے اخذ کیا۔ عملاً (Practically) نہیں صرف فن (Theory) سے واقف تھے۔ ان کے پاس اس فن کی بہت سی کتابیں بھی تھیں جو بعد میں انہوں نے ندوۃ العلماء کی نذر کر دیں چنانچہ عطیہ فیضی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"ہندوستانی موسیقی پر فارسی میں بہت عمدہ کتابیں ہیں وہ چھپی نہیں ہیں۔ میرے پاس قلمی نسخے ہیں لیکن اب وہ ندوہ میں وقف کر دیے گئے" ۵۱

خطوط شبلی اگر منظر عام پر نہ بھی آتے تو مولانا کے پاس فن موسیقی کے جو قلمی نسخے تھے وہی اس کے ثبوت کیلئے کافی تھے کہ مولانا کو موسیقی سے دلچسپی تھی اور انہوں نے اس فن کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ لہٰذا 'خطوط شبلی' سے کوئی نیا انکشاف نہیں ہوتا۔

(۵) مذکورہ بالا سطور سے یہ ظاہر ہو گیا کہ مولانا کے جن خیالات کے متعلق لوگوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ وہ صرف 'خطوط شبلی' ہی میں ملتے ہیں تو وہ صرف انہیں اوراق میں نہیں بلکہ مولانا کی دوسری تحریروں میں بھی جا بجا نمایاں طور پر ملتے ہیں :-

(۶) "مولانا شبلی کے یہ خیالات دراصل عطیہ اور زہرہ فیضی کی صحبت اور ان کے اثرات کا نتیجہ ہیں"؟ اس کے بارے میں صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ سولہ سولہ' بیس بیس برس کی لڑکیاں اگر اکیاون باون برس کے بوڑھے پر (جسے سرسید جیسی عظیم الشان اور مرعوب کن شخصیت بھی اس کے خیالات اور عقائد سے منحرف نہ کر سکی) اپنے اثرات ڈال کر اس کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرنے کی قدرت رکھتی ہیں تو بیشک مولانا عطیہ اور زہرہ فیضی کے اثرات سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکے ہوں گے۔

اگرچہ مولانا کی فارسی شاعری کا دور آخر 'لطافت خیال' اور 'رنگینیٔ طبع' کی غمازی کرتا ہے پھر بھی ان کی شخصیت کا لطیف پہلو پورے طور پر نمایاں نہ تھا۔ 'مراسلات' کی اشاعت نے اس پہلو کو نور کر دیا۔ بڑا ظلم ہوتا اگر مولانا کے مکاتیب اور خطوط شائع نہ ہوتے۔ مولانا کی دوسری تصانیف کی روشنی میں کوئی شخص اس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا تھا کہ وہاں صرف دماغ' خیالات' اور افکار ہی کی کارفرمائیاں نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جذبات اور احساسات کی فراوانی بھی ہے۔

---

۵۱ خطوط شبلی، ص ۹۳۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

×۔ "ممتاز ادیب" شاید زیادہ مناسب ہو۔

† یہ لفظ حذف کردیے جائیں تو برا نہیں۔

⊗ یہ لفظ بھی زائد از ضرورت ہیں۔

www.urduchannel.in

"خطوط شبلی" کے مقدمہ نگار ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہوگئی" ۵

تعجب ہوتا ہے کہ ایک مستند شخص کے قلم سے کس طرح اس قدر غیر ذمہ دارانہ فقرہ نکلا جسے ایک مبتدی بھی تسلیم نہیں کر سکتا! یہ سچ ہے کہ زبان کا جو آج رنگ ہے وہ کل نہ ہوگا۔ زبان اور خیالات ایک جگہ پر قائم نہیں رہتے۔ ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہیگا۔ مگر شبلی کے متعلق اس قدر بے دردانہ، غیر منصفانہ، اور معاندانہ انداز سے پیشین گوئی کر دینا نہ صرف اخلاقی کمزوری بلکہ سخت ناانصافی ہے۔ شبلی کی تصانیف کو لونی لگے گی۔ وہ قرآن نہیں جو ابدالآباد تک ایک طرح اپنی جگہ پر قائم رہے اور جس کے اور محفوظ رکھنے کا خود خدا نے دعویٰ کیا ہے مگر سوال یہ ہے کہ وہ کون سا وقت اور کب ہوگا جب لونی لگنے لگے گی۔ اس کے متعلق صرف اس قدر عرض ہے کہ جب آزاد، حالی، نذیر احمد اور سرسید کے زندہ جاوید نثری کارنامے مٹ جائیں گے

حوالہ (۱)

www.urduchannel.in

٭ اس جملہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

+ ان معروف مطالب کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں۔

www.urduchannel.in

بابِ ششم

اورنگ زیب قاسمی

شبلی کی انشاء پردازی

انشاء اور اس کے لوازم انشاء کے معنی 'پھیلانا' ہے۔ یعنی اپنے تجربات، احساسات اور جذبات × بڑھانا
کو اس طرح کھول کر دوسروں کے سامنے بیان کرنا کہ وہ بھی اُسے اسی طرح سمجھ لیں جس طرح کہنے والا سمجھتا یا محسوس کرتا ہے۔ انشاء پردازی صرف اظہار مطلب کا نام نہیں کیوں کہ یہ کام تو اشاروں سے بھی لیا جاسکتا ہے اور باقاعدہ زبان کے عالم وجود میں آنے سے پہلے غالباً 'اشارہ' ہی تبادلۂ خیال کا وسیلہ ہوگا۔ تمدن کے ساتھ ساتھ زبان کی پیدائش ہوئی۔ اس لئے 'انسان' حیوان مطلق سے ممتاز ہو کر حیوان ناطق کہلایا۔ اسے زبان کی ایک ایسی قوت عطا ہوئی جو کسی دوسری مخلوق کو نصیب نہیں۔ تحریر کی ایجاد تمدن کے اچھے دور کی پیداوار ہے۔ جن ملکوں میں تحریر کا رواج پہلے ہوا وہاں کی تہذیب و معاشرت پہلے ہی بہت کچھ ترقی کر چکی ہوگی۔ رفتہ رفتہ تحریر اتنی مکمل ہوئی کہ جذبات و احساسات کو محفوظ کرنے کا ایک ذریعہ بن گئی۔ ہماری اس بحث میں ہر جگہ انشاء سے یہی مراد ہے۔

تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں اتنا جان لینا ضروری ہے کہ اچھی انشاء پردازی کیلئے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ سب سے اہم نکتہ 'تفہیم' ہے۔ یعنی بات کو پوری طرح سمجھنا۔ اگر کسی عبارت میں خواہ کسی وجہ سے یہ خامی ہو کہ سامعین یا ناظرین اُسے فوراً نہ سمجھ لیں تو اسے زبان اور بیان کی بڑی خامی سمجھنا چاہئے اس کے بعد 'اختصار' ہے یعنی کم از کم الفاظ میں بغیر مطلب فوت ہوئے پوری طرح اظہار خیال کر دینا۔ تیسری چیز قواعد صرفی و نحوی کی پابندی ہے۔ اگرچہ اعلیٰ درجہ کے ادیب و انشاء پرداز اجتہادی شان رکھتے ہیں ان کے لئے اس کی پابندی ضروری نہیں لیکن یہ اجتہاد، تشبیہات و استعارات، صنائع و بدائع اور ترکیب تک بالعموم محدود ہوتا ہے اور انشاء پرداز اپنے عہد کی صرفی و نحوی قاعدوں کی پابندی سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ چوتھی بات اچھی انشاء پردازی کے لئے اچھی زبان ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں عام گفتگو کی زبان تصنیفی زبان سے علحدہ ہوتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی انشاء پرداز زیادہ تر ایسے الفاظ یا فقرے استعمال کرے جو عوام گفتگو میں زیادہ مستعمل ہوں تو اس کا کلام ساقط المعیار

www.urduchannel.in

گرانمایگی

× دلّی سوسائٹی کے قائم ہونے بہت پہلے کلکتہ میں یہ کام ہوا اور مقدار اور خوبی دونوں میں بہت زیادہ۔ دلّی سوسائٹی نے تو غدر کے بعد جولائی ۱۸۶۵ء میں کام شروع کیا اور "رسالۂ دہلی سوسائٹی" ۱۸۶۶ء میں نکلنا شروع ہوا جس کے پہلے شمارے میں جولائی ۶۵ء کے جلسے کو "جلسۂ اوّل" لکھا ہے۔ سوسائٹی کے مقاصد میں علمی اور فنّی یا کسی قسم کی کتابوں کی تالیف و اشاعت کا ذکر نہیں نہ آج تک سنا گیا کہ سوسائٹی نے کوئی کتاب شائع کی تھی۔ ماخذ کا حوالہ دیا جائے۔

www.urduchannel.in

ٹھہرےگا ایک طور پر یہی عناصر انشاء پردازی کے بنیادی اجزاء ہیں - اور جزیں انہیں کی تشریحات و تفصیلات سے حاصل ہوتی ہیں - آگے چل کر اسی معیار پر شبلی کو پرکھنا مقصود ہے -

اردو انشاء پردازی کے اسالیب

شبلی سے پہلے اردو انشاء پردازی ترقی کے بہت مراحل طے کر چکی تھی - سب سے پہلے ایسی عبارتوں کے نمونے ملتے ہیں جن میں عربی فارسی اور ہندی کا جوڑ صاف معلوم ہوتا ہے کتابیں زیادہ تر مذہبی موضوعات پر ہیں اس لئے عربی کی آیات اور احادیث اور اقوال بکثرت ہیں - ہندی کے جو ترجمے ہیں وہ بھی لفظی یہ انداز آٹھویں صدی ہجری میں حضرت اشرف جہانگیر سمنانی سے شروع ہوکر کم و بیش دسویں صدی ہجری کے آخر تک قائم رہا - گیارہویں صدی ہجری میں بعض کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اردو انشاء پردازی فارسی کا اثر قبول کرتی جا رہی ہے - ظہوری دکن میں موجود تھا جسکی "سہ نثر" آج تک مشہور ہے اردو میں یہ انداز سب سے زیادہ 'سب رس' میں نمایاں ہے جو فارسی کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے - اس میں قافیہ اور وزن کا التزام اور تشبیہات اور استعارات کی کثرت ہے - بات کو نہایت پھیلا کر بیان کیا ہے - جہاں کہیں شراب کا ذکر چھڑ گیا ہے صفحوں کے صفحے سیاہ کر ڈالے گئے ہیں - قصہ کا اگر خلاصہ کیا جائے تو چند صفحوں میں بیان ہو سکتا ہے - طول کلامی اس زمانے کی انشاء پردازی کا خاص وصف ہے - یہ انداز کم و بیش بارہویں صدی ہجری تک قائم رہا - چنانچہ مرزا سودا کا دیباچہ اپنی کلیات پر، یا اُن سے پہلے فضلی کی 'دہ مجلس' انشاء پردازی کے اسی اسلوب کا نمونہ ہے - تیرہویں صدی ہجری میں بنگال میں انگریزوں کی طاقت کا عروج شروع ہوا اور فورٹ ولیم کالج کی داغ بیل پڑی - جس کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی ہے - یہاں صرف اتنا ذکر کرنا کافی ہے کہ پہلی مرتبہ اردو کو سادہ اور بلا تکلف اسلوب میں لکھنے کی کوشش فورٹ ولیم کی چہار دیواری میں ہوئی - میر امّن کی باغ و بہار اس کی سب سے عمدہ مثال ہے -

انشاء پردازی میں اب تک 'گرانگی' پیدا نہیں ہوئی تھی - یہ کام دلّی سوسائٹی والوں نے کیا - چونکہ ان کو علمی اور فنی کتابیں درکار تھیں اس لئے قدرتی طور پر ان کی عبارت نہایت صاف و سادہ، متین اور متوازن ہے - لیکن سوسائٹی کی مدت قیام اور اس کا دائرہ اثر بہت محدود رہا - اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا انشاء پردازی کے اسالیب میں اس نے دور رس اثرات چھوڑے -

www.urduchannel.in

×: "خامی" کا لفظ یہاں بھی بے جا ہے۔
× یہ اُن پڑھنے والوں کی خام خیالی ہو سکتی ہے۔

www.urduchannel.in

۱۸۵۰ء میں غالب نے اردو خطوط نویسی کا آغاز کیا اور پہلی مرتبہ ان کی ہمہ گیر شخصیت کے اثر سے سادہ، آسان اور بے تکلف عبارت کا رواج عام ہوا لیکن ان کے زمانے میں بھی پرانا انداز قائم اور باقی رہا۔ آثار الصنادید کے پہلے اڈیشن میں انشا، کا وہی پرانا اور فرسودہ انداز ہے۔ سرسید کی اس کی وضاحت کرتے ہوئے صاف اقرار کیا ہے کہ کتاب پر صہبائی کی اصلاح ہے بلکہ اکثر مقامات پر پوری کی پوری عبارت انہیں کے قلم کی لکھی ہوئی ہے لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ اس زمانے میں دو تحریکیں علحدہ علحدہ چل رہی تھیں۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے 'فسانہ عجائب' لکھا اور میر امّن کی زبان پر اعتراض کرتے ہوئے اُسے "محاوروں کا ہاتھ پیر توڑنا" بتایا۔

اُنیسویں صدی عیسوی میں بالخصوص نصف آخر میں اردو کے مختلف انشاء پردازوں میں مختلف اسالیب نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں جن لوگوں نے سب سے زیادہ شہرت پائی وہ آزاد، سرسید، حالی، نذیر احمد اور شبلی ہیں۔ اگر سرسید اپنے گوناگوں اثرات کی وجہ سے اس جماعت کے امام کہے جاتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ آزاد نے نئی انشاء پردازی کی داغ بیل ڈالی۔ یہ پوری جماعت انگریزی سے براہِ راست تقریباً ناآشنا تھی۔ لیکن یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ انگریزی ادب و انشاء کے اثرات اردو میں پہلی مرتبہ انہیں لوگوں کی تصانیف کے ذریعہ راہ پاسکے۔ آزاد ایک طور پر دورِ عبوری میں کہے جاسکتے ہیں انہوں نے انگریزی مضامین کا ترجمہ کیا ہے اور عبارت کو صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن رنگینیٔ بیان اور کہیں کہیں قافیہ اور وزن کا التزام ان کے یہاں ملتا ہے ان کی عبارت کے حسن میں کوئی شبہہ نہیں لیکن یہ رنگینی جملہ موضوعات و مضامین کے لئے مناسب نہیں۔ نذیر احمد محاورے پر جان دیتے تھے اس لئے ان کے یہاں وہ عیب تو نہیں ہے جو آزاد کے یہاں ہے لیکن اس کے بجائے دو اور خرابیاں پیدا ہوگئیں۔ ایک طولِ بیان' چنانچہ ان کے قصے، کہانیوں میں بھی مکالمات، واعظ کی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور اکثر کتابوں میں 'ایسے وعظ' اصل قصہ کے تناسب سے بہت زیادہ ہیں دوسرے انہوں نے انشاء پردازی کے اس اہم اصول کو پیشِ نظر نہیں رکھا ہے ہر محاورہ کتابی اور تحریری زبان میں دخل پانے کا مستحق نہیں یہ عیب اُن کے 'ترجمہ کلام پاک' اور 'امہات الامہ' جیسی سنجیدہ کتابوں تک میں نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ ان کا انداز بھی آزاد کے انداز کی طرح ہر موضوع کے لئے موزوں اور مناسب نہیں کسی علمی یا تحقیقی موضوع میں ایسی بامحاورہ زبان کو قائم رکھنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ حالی البتہ نہایت متین اور جچی تلی عبارت لکھتے ہیں لیکن یہ ان کی بڑی خامی ہے کہ جوش و خروش کے موقعوں پر بھی ان کی عبارت میں اتار چڑھاؤ پیدا نہیں ہوتا اور اسی لئے بعض لوگوں کو ان کی عبارت سپاٹ معلوم ہوتی ہے لیکن آزاد اور

www.urduchannel.in

* یہ لفظ حذف کیے جا سکتے ہیں۔

+ بہتر لفظ اختیار کیے جائیں یا کم سے کم یہ لفظ واوین میں رکھے جائیں:- "طوطا مینا اُڑانے"

www.urduchannel.in

نذیر احمد دونوں کے مقابلے میں حالی کا اسلوب نگارش زیادہ وقیع اور ادبی ہے اسی لئے وہ آج تک بعض لوگوں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ سرسید احمد خاں بالخصوص اپنے آخر دور میں ایک اچھے اور مکمل انشاء پرداز نظر آتے ہیں چنانچہ شبلی نے خود اس مضمون میں جو اُن کی وفات پر "سرسید احمد اور اردو لٹریچر" کے عنوان سے لکھا ہے اس کا صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے اور کسی حد تک خود ان کی تقلید بھی کی ہے۔ شبلی کی عبارت اگر اپنے معاصرین میں کسی کی تحریر سے متاثر ہے تو وہ سرسید ہیں لیکن سرسید کی سادگی و صفائی پر زور بیان اور خالص ادبی چاشنی کا بھی انہوں نے اضافہ کیا اور اپنا ایک مخصوص اسٹائل (اسلوب نگارش) پیدا کر لیا جو (۱) سادہ ہونے کے باوجود حالی کی بالعموم بے جان نثر سے زیادہ زوردار اور بامحاورہ ہونے کے ساتھ ساتھ نذیر احمد کی غیر ادبی زبان سے مختلف اور رنگین ہونے کے باوجود آزاد کے خیالی طوطا مینا اڑانے سے بالکل علحدہ ہے۔

شبلی کے عہد میں انشاء پردازی کا عام اسلوب

اس بیان سے یہ ظاہر ہوگیا کہ شبلی کے معاصرین اپنی انشاء پردازی میں کس اسلوب کے پابند تھے بے موقع نہ ہوگا اگر یہاں ان سب کو پیش نظر رکھ کر اس دور کے عام انشاء پردازی کا رنگ علحدہ کرکے بیان کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے وہ فارسی کے انحطاط کا اثر اور انگریزی کی کارفرمائی ہے۔ یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ اس دور کے انشاء پرداز انگریزی کے کن ادیبوں اور انشاء پردازوں سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ سرسید کے متعلق البتہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ 'اڈیسن' اور 'اسٹیل' سے خاص طور پر متاثر ہوئے تھے۔ تہذیب الاخلاق میں ان دونوں انشاء پردازوں کے اکثر مضامین کے ترجمے شایع ہوتے تھے اور سرسید اپنی تحریروں میں ان کی تقلید کرتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سادگی جو ان دونوں انگریزی انشاء پردازوں کی خصوصیت تھی اردو میں پہلی مرتبہ نظر آئی۔ اس کا اثر یہ بھی ہوا کہ انگریزی کے الفاظ عام طور پر اردو میں آنے لگے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں اور نہ قابل اعتراض ہے کیوں کہ اردو میں دوسری زبانوں کے بکثرت الفاظ پہلے سے شامل ہیں۔ سنسکرت و بھاشا کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، پنجابی، سندھی وغیرہ ہندوستانی زبانوں کو چھوڑ کر یورپین زبانوں میں اطالوی، فرانسیسی، پرتگالی اور انگریزی کے بہت سے الفاظ اس عہد سے پہلے اردو میں شامل ہو گئے تھے اور انشاء اللہ خاں انشاء کی تصریح کے مطابق اردو بن گئے تھے۔ انشاء کے نزدیک کسی زبان کا لفظ

www.urduchannel.in

"اور" حذف کیا جا سکتا ہے۔

x
یہاں "اصطلاحیں" بہتر ہوگا۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

اردو زبان کا جزو بن جانے کے بعد قابل اعتراض نہیں رہ جاتا اور اسے بدیسی یا غیر ملکی نہیں کہا جا سکتا لیکن اچھی انشاء پردازی کے معنی یہ ہیں کہ غیر زبانوں کے صرف ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جو عام طور پر مستعمل ہوں اور کثرت استعمال سے زبان کا جزو بن گئے ہوں اور ان کے مترادفات زبان میں پہلے سے موجود نہ ہوں ۔ زبان میں حک و اضافہ کے میکانیکی قانون نہیں بنائے جا سکتے اعتدال کا قانون یہاں بھی کارفرما ہے اگر نئے الفاظ کے استعمال میں اعتدال کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو طبع سلیم پر گراں گذرنے لگتا ہے ۔ سرسید، شبلی، حالی، نذیر احمد، آزاد، ان سب کے یہاں انگریزی الفاظ موجود ہیں ۔ کسی کے یہاں کم کسی کے یہاں زیادہ ۔ الفاظ سے قطع نظر انشاء کے عام اسلوب میں سادگی وصفائی پر توجہ بطور مشترک ان سب کے یہاں پائی جاتی ہے ۔ زبان اگرچہ ہر ایک کی ایسی نہیں ہے کہ ہر قسم کے سنجیدہ تحقیقی اور علمی مباحث کے لئے موزوں ہو لیکن عام طور پر سرسید، حالی اور شبلی کی تحریروں سے اس نئے رجحان کا پتہ چلتا ہے ۔ سرسید کے متعلق شبلی کا یہ اعتراف ملتا ہے کہ رینان نے جو اعتراض عربی پر کیا تھا کہ اس میں فلسفانہ مسائل کے ادا کرنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی، غلط ہے ۔ کیوں کہ سرسید نے اردو میں نہایت دقیق مسائل بیان کر دئے ہیں ۔

فلسفیانہ

انگریزی علوم وفنون کی کتابوں کے تراجم کی جو کثرت آج ہے وہ اُس عہد میں نہ تھی ۔ اس کی ضرورت اور تقاضائے وقت سے ہمیں بحث نہیں البتہ انشاء پردازی پر اس کے اثرات ضرور دیکھنا ہے ۔ آج کل کے انگریزی تعلیم یافتہ اردو انشاء پردازوں کی تحریروں کا مقابلہ اگر سرسید اور ان کے معاصرین کی تحریروں سے کیا جائے تو یہ فرق صاف نظر آئیگا کہ آج کل ادیب و انشاء پرداز سوچتے انگریزی میں ہیں اور خیالات کا ترجمہ اردو میں ادا کرتے ہیں ۔ اس لئے جملوں اور ترکیبوں کی ساخت انگریزی ہو جاتی ہے اور اسی لئے اکثر نہایت نامانوس، ان مل اور بے جوڑ الفاظ، اصلاحات، اور ترکیب ادا ہو جاتی ہیں ۔ یہ عیب اس عہد کی انشاء پردازی میں نہیں ملتا ۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ لوگ چونکہ سوچتے اردو میں تھے اس لئے کسی مسئلہ کو خود سمجھ لینے کے بعد دوسروں کو بھی آسانی سے سمجھا سکتے تھے ۔ یہ بات اِس زمانہ کے انشاء پردازوں میں نہیں پائی جاتی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح اپنے خیالات کو سادہ اور عام فہم زبان میں ادا کرنے سے قاصر ہیں ۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آج کم لوگ ایسے نکلیں گے جو سرسید یا شبلی کی طرح بیک وقت بالکل مختلف النوع موضوعات پر قلم اٹھا سکیں

شبلی کا خاص اسلوب نگارش

شبلی نے جو موضوعات منتخب کئے ان کے تین خاص دائرے

۴ بامحاورہ زبان کلامِ پاک کے ترجمے میں ناموزوں کیوں کر ہو سکتی ہے۔

اعتراض نذیر احمد کے ترجمے کی عبارت پر یہ ہے کہ کہیں کہیں مبتذل بول چال اُس میں آ گئی ہے۔ ابتذال اور محاورے میں بڑا فرق ہے۔

ج: حالی کی عبارت پر یہ اعتراض حق بجانب نہیں۔

www.urduchannel.in

ہیں :- مذہب - تاریخ اور ادب - ان تینوں کے اعتبار سے انہیں انشار کا اسلوب بھی ایسا اختیار کرنا تھا جو گرانمایہ، باوقار اور سنجیدہ ہو - مثلاً کسی تحقیقی یا تاریخی مضمون کی رنگینی ممکن ہے پڑھنے والوں کے لئے زیادہ جاذب نظر آئے لیکن اس میں یہ نقص ہے کہ جس چیز کو پیش کرنا یا اس پر زور دینا ہے وہ الفاظ رنگیں میں گم ہو جاتی ہے - اس لئے دنیا کی ہر علمی زبان میں ایسے مباحث کے لئے سنجیدہ اور متین ہی اسلوب نگارش اختیار کیا جاتا ہے - اس سلسلے میں مہدی الافادی مرحوم کا یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے:-

" غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی اردوئے خاصہ کی داد ملتی ...."

جن لوگوں نے انشار پردازی کے اس اہم نکتہ کا لحاظ نہیں رکھا ان کی تصانیف کو علمی وقار حاصل نہیں ہو سکا۔ مولانا محمد حسین آزاد کی " آبحیات " کئی حیثیتوں سے اردو ادب میں اہم کتاب ہے لیکن اس کی اصلی حیثیت یعنی تاریخ ادب اردو محض اس کی انشار پردازی کی وجہ سے بہت گھٹ گئی اور بہت سے محققین ان کی باتوں کو افسانہ سمجھنے لگے - ان کے نزدیک آزاد صرف الفاظ کے طوطا مینا اڑاتے ہیں - اسی طرح نذیر احمد کی بامحاورہ زبان نے کلام پاک کے ترجمے میں نہایت ناموزوں اور کلام پاک کے احترام و تقدس کے منافی معلوم ہوتی ہے - سرسید البتہ اس عیب سے پاک ہیں - حالی نے اپنا دامن بچانے کے لئے دوسری جانب سادگی میں اتنا غلو کیا کہ ان کی عبارت اکثر خشک اور بے مزہ ہو گئی - شبلی نے متانت، وقار اور سنجیدگی کے باوجود عبارت کے حسن اور انداز بیان کی دلاویزی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے مثلاً :-

(۱) " دنیا میں عموماً ہر قوم کو مذہب ہر چیز سے زیادہ عزیز رہا ہے لیکن مسلمانوں کو اور بھی زیادہ عزیز تھا اور ہونا چاہئے تھا - مسلمان کسی نسل، کسی خاندان، کسی ملک، کسی آبادی کے افراد کا نام نہیں - مسلمانوں کی قومیت کا عنصر یا پائہ خمیر جو کچھ کہو صرف مذہب ہے - اس لئے اگر مذہب کی حیثیت الگ کر لی جائے تو قومیت بھی فنا ہو جاتی ہے - اسی خیال کا اثر تھا کہ مسلمان نے مذہب کو ہر قسم کے خطروں سے بچانے کے لئے ہر زمانے میں حیرت انگیز کوششیں کیں دولت عباسیہ میں جب یونان و فارس کے علمی ذخیرے عربی زبان میں آئے اور تمام قوموں کو مذہبی مباحثات و مناظرات میں عام آزادی دی گئی تو اسلام کو ایک بڑے خطرے کا سامنا پیش آیا - پارسی - عیسائی - یہودی، زنادقہ ہر طرف اٹھ کھڑے ہوئے اور فتوحات اسلام کے آغاز میں ان کو جو صدمہ اسلام کی تلوار سے پہونچ چکا تھا اس کا انتقام قلم سے لینا چاہا - عقائد و مسائل اسلام پر اس آزادی اور بے باکی سے نکتہ چینیاں کیں کہ ضعیف العقیدہ مسلمانوں کے اعتقاد متزلزل ہو گئے اس وقت اگرچہ نہایت آسانی سے ممکن تھا کہ حکومت کے زور سے نکتہ چینیوں کی زبان بند کر دی جاتی لیکن مسلمانوں کی آزاد خیالی نے اس ننگ کو گوارا نہ کیا کہ قلم کا جواب

www.urduchannel.in

تلوار سے دیا جائے ۔ علمائے اسلام نے نہایت شوق و محنت سے فلسفہ سیکھا اور جو ہتھیار مخالفین نے اسلام کے مقابلے میں استعمال کئے تھے انہیں سے ان کے وار روکے انہیں معرکوں کے کارنامے ہیں جو آج علم کلام کے نام سے مشہور ہیں" [1]

---

(۲) "عالم کائنات کا سب سے مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے یعنی پہلے ہر قسم کے فضائل اخلاق، زہد و تقویٰ، عصمت و عفاف، احسان و کرم، حلم و عفو، عزم و ثبات، ایثار و لطف، غیرت و استغنا کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقہ سے قائم کئے جائیں اور پھر تمام عالم میں ان کی عملی تعلیم رائج کی جاوے اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و پند ہے اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ فن اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی جا کر تمام ملک میں پھیلائی جائیں اور لوگوں کو ان کی تعلیم دلائی جائے ۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر محاسن اخلاق کی تعمیل کرائی جائے اور رزائل سے روکے جائیں ۔

یہ طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں جاری ہیں اور آج اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں ۔ نہ جبر و زور سے کام لیا جائے بلکہ فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو، جس کی ہر جنبش لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے ۔ جس کا ایک ایک اشارہ اوامر سلطانی بن جائے .... " [2]

موضوع کے انتخاب نے شبلی کے اسلوب میں ایک اور خصوصیت پیدا کر دی ۔ ان کا خاص مضمون جس کا بار بار اعادہ کیا جا چکا ہے یوروپین معترضین کے حملوں کا جواب اور مسلمانوں کے علمی و تمدنی کارناموں کا احیاء اور تاریخ اسلام کے متعلق تحقیقات تھا ۔ اس لئے منطقیانہ استدلال کی ضرورت تھی عبارت آرائی سے یہاں وہ کام نہیں لیا جا سکتا جو خطیب اپنی خطابت سے لے سکتا ہے ممکن ہے ایک مقرر اپنے قد و قامت، آواز، طرز تقریر، زبان و بیان سے سامعین کو تھوڑی دیر کے لئے اپنا ہم نوا بنالے لیکن انشاء پرداز ایسے لوگوں کو مخاطب کرتا ہے جو ایک ایک فقرے پر اسے ٹوک سکتے ہیں اس لئے وہ پہلے ہی سے تمام شکوک و شبہات کے ازالہ اور اعتراضوں کے جوابات کا پورا لحاظ رکھتا ہے جس کے لئے فلسفیانہ دماغ اور منطقیانہ استدلال ضروری ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ انیسویں صدی کے انشاء پردازوں میں اس کا سب سے

---

[1] دیباچہ علم الکلام، طبع پنجم، مطبع معارف ص ۱-۲ [2] سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، مطبوعہ نامی پریس کانپور، ص ۱ ۔

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

زیادہ حصہ سرسید اور شبلی ہی کو ملا تھا۔ شبلی کا ہر مضمون منطقیانہ استدلال اور سلجھی ہوئی عبارت کا نمونہ ہے گو ان کی تمام تصنیفات میں یہ خصوصیت مشترک ہے لیکن ان کے تاریخی مضامین اس وصف خاص میں نہایت ممتاز ہیں "کتب خانہ اسکندریہ"، 'الجزیہ'، 'حقوق ذمیین' اور اس قسم کے دوسرے مضامین میں بکثرت موجود ہیں جو اس کی تائید میں پیش کئے جاسکتے ہیں مثلاً :-

(۱) "غیر مذہب والوں نے اس لفظ 'جزیہ' کو نہایت ناگواری سے سنا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام ہی نفظ کا موجد ہے۔ اسلام ہی نے یہ اصول پیدا کیا جس سے اس کا مقصد مسلمانوں اور غیر مذہب والوں میں نہایت متعصبانہ اور نامناسب تفرقہ قائم کرنا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ 'جزیہ' ایک ایسا جبر تھا جس سے بچنے کے لئے اسلام کا قبول کر لینا ہی گوارا کیا جاتا تھا اور اس وجہ سے وہ جبراً مسلمان کرنے کا ایک قوی ذریعہ تھا۔ لیکن یہ تمام غلط خیالات انہیں غلط فہمیوں سے پیدا ہوئے ہیں جو غیر قوموں کو اسلام کی نسبت ہیں ہم اس موقع پر تین حیثیتوں سے جزیہ پر بحث کرنی چاہتے ہیں :-

(۱) جزیہ اصل میں کس زبان کا لفظ ہے اور کن معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔

(۲) ایران و عرب میں جزیہ کی بنیاد کب سے قائم ہوئی

(۳) اسلام نے اس کو کس مقصد سے استعمال کیا......" [۵]

---

(۲) "چوں کہ اس بحث میں مقدمہ کے دو فریقوں میں سے ایک نالش اور دوسرا مدعا علیہ ہے اور چوں کہ اس قسم کے مقدمات میں بار ثبوت ہمیشہ اس فریق پر ہوتا ہے جو ثبوت کا مدعی ہے اس لئے اول ہم کو ان شہادتوں پر غور کرنا چاہئے جو واقعہ کے اثبات میں پیش کی جاتی ہیں۔ ہم کو جہاں تک معلوم ہے (اور ہم دعوی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی شخص اس بحث میں اس سے زیادہ ثابت نہیں کرسکتا) یورپ کے تمام مصنفین جو اس دعوی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں انکی دلیل روایت کی حیثیت سے صرف اس قدر ہے کہ 'اس واقعہ کو عبد اللطیف بغدادی' مقریزی' حاجی خلیفہ نے بیان کیا ہے" اب امور تنقیح طلب یہ ہیں کہ کیا ان مصنفوں نے اس واقعہ کے متعلق ایسا کوئی واقعہ بیان کیا ہے جو شہادت میں پیش ہو سکتا ہے ؟ اور کیا اس واقعہ کے متعلق ان کی شہادت کافی ہے؟ یورپ کے مورخین نے جو اس واقعہ کے مدعی ہیں فریب آموز طور پر بار بار عبد اللطیف، مقریزی' حاجی خلیفہ کا نام لیا ہے اور جن کو انکار ہے وہ ان مصنفوں کی شہادت کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے اور اس طریق بحث نے ان یورپین مورخوں کی فریب آمیزی پر پردہ ڈال رکھا ہے کیوں کہ بحث اس پر محدود ہوگئی کہ

---

[۵] مقالات شبلی' جلد اول مطبوعہ معارف پریس ۱۹۳۰ء ص ۲۲۶ -

www.urduchannel.in

* وہ کون سی قسم عبارت کی ہے جس میں ربط اور تسلسل کا
قائم رکھنا ضروری نہیں ؟

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

عبد اللطیف

اللطیف

عبدالصمد وغیرہ قابلِ سند ہیں یا نہیں۔ حالانکہ یہ تحقیق ضروری تھی کہ عبداللطیف وغیرہ نے کوئی شہادت بھی دی ہے یا نہیں،" ۵؎

تسلسل جس قسم کی عبارت مولانا شبلی لکھتے تھے اس میں قدرتی طور پر استدلال کے ساتھ ساتھ عبارت کے تسلسل اور ربط کا قائم رکھنا ضروری تھا۔ اور چوں کہ ان کی تصانیف کا زیادہ حصہ تاریخی، سوانحی اور علمی مقالات پر مشتمل ہے واقعات کا قدرتی ربط پہلے سے موجود ہوتا ہے اس لئے عبارت کا تسلسل ان کی عادتِ ثانیہ بن گئی چنانچہ ان مضامین اور موضوعات کے علاوہ بھی جب کبھی وہ کسی دوسرے عنوان پر قلم اٹھاتے ہیں تو بھی ان کی یہ خصوصیت قائم اور برقرار رہتی ہے اس کا سب سے اچھا نمونہ غالباً 'موازنہ انیس و دبیر' میں مل سکتا ہے۔ موازنہ کی فہرست مضامین ملاحظہ ہو: ـ

(۱) مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ (۲) عرب کی مرثیہ گوئی۔

(۳) فارسی مرثیہ گوئی (۴) اردو میں مرثیے کی ابتدا اور اس کی ترقی۔

(۵) میر انیس (۶) میر انیس کے محاسن شاعری

(۷) فصاحت (۸) کلام کی فصاحت۔

(۹) کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا۔ (۱۰) روزمرہ

(۱۱) مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال۔ (۱۲) بحر و ردیف و قافیہ کی موزونی۔

(۱۳) بلاغت (۱۴) بلاغت کی تعریف۔

(۱۵) ہر قسم کے مضمون کے بلاغت کے جداگانہ طریقے۔ (۱۶) اشخاص کے لحاظ سے بلاغت کا انداز۔

(۱۷) تسلسل بیان (۱۸) دشمن کی تعریف میں بلاغت کا انداز۔

(۱۹) بلاغت کی جزئیات اور اس کی مثالیں (۲۰) استعارات اور تشبیہات۔

(۲۱) صنایع و بدایع (۲۲) جذبات انسانی اور اس کی مثالیں۔

(۲۳) مناظر قدرت (۲۴) صبح کا سماں۔

۵؎ مقالاتِ شبلی جلد ششم ص ۱۲۵ مطبوعہ معارف پریس ۱۹۳۷ء

www.urduchannel.in

(۲۵) گرمی کا سماں
(۲۶) منظر یعنی کسی حالت کا سماں اور اس کی مثالیں۔
(۲۷) واقعہ نگاری
(۲۸) میرانیس کی واقعہ نگاری کی خصوصیات۔
(۲۹) واقعہ نگاری کی مثالیں
(۳۰) رزمیہ
(۳۱) ہنگامۂ جنگ
(۳۲) فوج کی تیاری۔
(۳۳) حملہ کا زور و شور
(۳۴) حریفوں کی باہمی معرکہ آرائی اور فنون جنگ۔
(۳۵) گھوڑے کی تعریف
(۳۶) تلوار
(۳۷) سلام
(۳۸) رباعیات۔
(۳۹) میرانیس کے کلام پر اعتراضات
(۴۰) سرقات۔
(۴۱) انیس اور دبیر کا موازنہ
(۴۲) مرزا دبیر کے کلام کے عیوب۔
(۴۳) فصاحت نہ ہونا
(۴۴) بندش کی سستی اور ناہمواری۔
(۴۵) تعقید
(۴۶) تشبیہ اور استعارے۔
(۴۷) مضمون بندی اور خیال آفرینی
(۴۸) بلاغت۔
(۴۹) انیس اور دبیر کے متحد المضمون مرثئے اور متحد المضمون اشعار۔

ان تمام مباحث پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ع " ہر سخن موقع و ہر موقع مقامے دارد" کا لحاظ انہوں ہر جگہ رکھا ہے۔ انشاء کی یہ خوبی ایک انشاء پرداز کے لئے بالخصوص جن کے موضوع تاریخ اور فلسفہ ہوں ضروری ہے۔

ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مقامے دارد

استحکام رائے فلسفیانہ دماغ اور منطقیانہ استدلال کا لازمی نتیجہ استحکام رائے ہے جو انشاء پرداز اپنی تحریروں سے کسی قوم کو متاثر کرنا چاہتا ہے اگر وہ خود اپنی رائے پر پورے وثوق کے ساتھ اعتماد نہیں رکھتا تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ علامہ شبلی اس گر سے پوری طرح واقف تھے ان کے تاریخی مضامین سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ جس بات کو کہنا چاہتے ہیں اس پر ان کو پورا وثوق اور اعتماد ہوتا ہے اسی لئے اس زور و قوت سے اور ایسے دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے دل پر بھی اثر کر جاتی ہے مثلاً کتب خانہ اسکندریہ کے سلسلے میں آخر میں لکھتے ہیں :—

www.urduchannel.in

" اگرچہ ہم نے اس بحث کو مجتہدانہ اصول کے ساتھ طے کردیا ہے اور اس وجہ سے ہم کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ یورپ کے مورخین ہمارے ہمزبان ہیں یا نہیں تاہم تقلید پسندوں اور بالخصوص ان لوگوں کی تسلی کے لئے جن کو یورپ کے ساتھ نہایت حسن عقیدت ہے یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ واقعہ مفروضہ گو ایک زمانے میں تمام یورپ میں تسلیم کیا جاتا تھا لیکن جس قدر تاریخی تحقیقات کی ترقی ہوتی گئی اسی نسبت سے اس کی تصدیق کا زور گھٹتا گیا یہاں تک کہ حال کے مصنفین میں زیادہ تر انہیں لوگوں کی تعداد ہے جو اس کو غلط اور مشکوک واقعہ قرار دیتے ہیں۔ آج تک اس قدر ہوا ہے اور امید ہے کہ وہ دن بھی آئے جب زیادہ غور اور تحقیق کے بعد تمام یورپ متفق ہوکر علانیہ کہدے کہ ؎

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا " [1]

اسی طرح " مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی' میں پہلے کتابوں اور مصنفوں کا نام دے کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اہل ہند کی تصانیف اور ان کی زبان کے ساتھ کس قدر اعتنا کیا۔ اعداد اور شمار دے کر نتائج کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :-

" ملاّ مسیح کے جو اشعار ہمارے ہندو دوست نے نقل کئے ہیں بے شبہ وہ تعصب سے لبریز ہیں لیکن مسلمانوں کے تعصب کا اندازہ حضرت امیر خسرو' ابومعشر فلکی' ابوریحان بیرونی' عبدالجلیل بلگرامی' فیضی' ملک محمد جائسی' آزاد بلگرامی' سلطان فیروز شاہ' ابراہیم عادل شاہ' اکبر' جہانگیر' دانیال' عبدالرحیم خانخاناں سے کرنا چاہئے ؟ یا بیچارے مسیح پانی پتی اور صولت ترکستانی سے جن کو کوئی جانتا ہی نہیں" [2]

زور بیان انشاء ہو یا خطابت' شاعری ہو یا نثر نگاری' ہر ایک کا مقصد اثر آفرینی ہے اگر یہ مقصد پورا نہ ہو تو فن مکمل نہیں ہو سکتا اس لئے متین سے متین اور سنجیدہ سے سنجیدہ انسان بھی بعض موقوں پر جوش و خروش کے اظہار کے لئے مجبور ہے شبلی نے جو موضوعات اختیار کئے تھے ان میں جوش و خروش پیدا ہوجانا یقینی تھا۔ لیکن تاریخی یا تنقیدی مباحث میں اگر جوش و خروش اعتدال سے بڑھ جائے تو

---

[1] مقالات شبلی' جلد ششم' ص ۱۵۰-۱۵۱ مطبوعہ معارف پریس ۱۹۳۷ء

[2] مقالات شبلی' جلد ششم (مطبوعہ معارف پریس ۱۹۳۷ء) ص ۲۳۴

www.urduchannel.in

مضمون کی افادی حیثیت بہت کم ہو جاتی ہے اس لئے اچھے مورخ اور اچھے تنقید نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ جو کچھ لکھے حقائق کی روشنی میں لکھے اور حتی الامکان اپنی شخصیت اور ذاتی جذبات و تاثرات کو حاوی نہ ہونے دے لیکن عام طور سے ایسا ممکن نہیں اگر کسی تصنیف میں شروع سے آخر تک کسی جگہ بھی مصنف کی روح خود شامل نہیں ہو گئی ہے تو گویا کتاب ایک پیکرِ بے جان ہے اس لئے ایسے تو اقع پیدا کرنا ناگزیر ہی نہیں بلکہ اچھی انشاء پردازی کی شرطِ اولین ہے۔ شبلی کی متین و متوازن طبیعت کا ہم ذکر کر چکے، ان کے فلسفیانہ دماغ اور منطقیانہ استدلال کا بھی تذکرہ آ چکا بایں ہمہ ان کی عبارتیں منطق کے رسائل کی طرح خشک اور بے جان نہیں۔ مثلاً :-

—— ظہورِ قدسی ——

"چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آ چکی ہیں۔ چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سر و سامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرِ کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخِ کہن مدت ہائے دراز اسی صبحِ جانواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں عناصر کی جدت طرازیاں ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تر دستیاں، عالمِ قدس کے انفاسِ پاک توحیدِ ابراہیم، جمالِ یوسف، معجز طرازیٔ موسیٰ، جان نوازیٔ مسیح سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز شاہنشاہِ کونین کے دربار میں کام آئیں گے آج کی صبح وہی صبحِ جاں نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں "آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے۔ آتشکدۂ فارس بجھ گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیمِ شر، آتشکدۂ کفر آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی۔ بتکدے خاک میں مل گئے۔ شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا۔ نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔
توحید کا غلغلہ اٹھا۔ چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی۔ آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں۔ اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اٹھا۔ یعنی یتیمِ عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرماں روائے عالم، شہنشاہِ کونین۔

شمسۂ نہ مسندِ ہفت اختراں ⁂ ختمِ رسل خاتمِ پیغمبراں ⁂
احمدِ مرسل کہ خرد خاکِ اوست ⁂ ہر دو جہاں بستۂ فتراکِ اوست

"نادرہ کار" میں اضافت کی ترکیب نہیں ہی!

www.urduchannel.in

امی و گویا بہ زبان فصیح ؛ از الفِ آدم و میم مسیح
رسم ترنج است کہ در روزگار ؛ پیش دہد میوہ پس آرد بہار

عالم قدس سے عالم امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا
اللھم صل علیہ و علٰی آلہ و اصحابہ و سلم" [1]

---

(۲) "فتحِ مکہ"

"جانشین ابراہیم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کا سب سے مقدم فرض توحید خالص کا احیاء اور حرم کعبہ کا آلائش سے پاک کرنا تھا لیکن قریش کے پے در پے حملوں اور عرب کی مخالفت عام نے پورے اکیس برس تک اس فرض کو روک رکھا. صلح حدیبیہ کی بدولت اتنا ہوا کہ چند روز کے لئے امن و اماں قائم ہوگیا اور دلدادگان حرم ایک دفعہ یادگار ابراہیمی کو غلط انداز نظر سے دیکھ آئے لیکن معاہدہ حدیبیہ بھی قریش سے نہ نبھ سکا۔ حلم، عفو، تحمل کی حد ہو چکی۔ اب وقت آگیا کہ آفتاب حق حجاب ہائے حائل کو چاک کرکے باہر نکل آئے" [2]

---

(۳) "میرانیس اور مرزا دبیر میں اصلی مایۂ امتیاز جو چیز ہے وہ خیال بندی اور دقت پسندی ہے اور یہی چیز مرزا صاحب کے تاج کمال کا طرہ ہے۔ اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ مرزا صاحب کی قوت متخیلہ نہایت زبردست ہے وہ اسقدر دور کے استعارات اور تشبیہات ڈھونڈ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک ان کے حریفوں کا طائر وہم پرواز نہیں کرسکتا۔ راست نما اور دلفریب (لیکن غلط) استدلال جو شاعری کا ایک جزو اعظم ہے ان کے یہاں نہایت کثرت سے پایا جاتا ہے وہ قوت متخیلہ کے زور سے نئے نئے اور عجیب دعوی کرتے ہیں اور خیالی استدلال سے ثابت کرتے ہیں۔ مبالغہ کے مضامین جو پہلے شعراء باندھ چکے تھے اور یہ ظاہر نظر آتا ہے کہ اب اس کی حد ہو چکی ان کو وہ اس قدر ترقی دیتے ہیں کہ پیشتر مبالغے ان کے مقابلے میں ہیچ ہو جاتے ہیں۔
مختصر یہ کہ خیال آفرینی۔ دقت پسندی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال۔ شدت مبالغہ میں ان کا جواب نہیں لیکن اس زور کو وہ سنبھال نہیں سکے اس وجہ سے کہیں خامی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہیں تعقید اور اغلاق ہو جاتا ہے۔ تشبیہات کہیں

---

[1] سیرۃ النبی ص ۱۲۳ - ۱۲۴ - [2] سیرۃ النبی ص ۳۷۳ مطبوعہ نامی پریس کان پور سنہ ۱۹۱۸ء

www.urduchannel.in

پھبتیاں بنجاتی اور کہیں محض فرضی خیال رہ جاتی ہیں ....“ [۱]

---

(۴) ”تمام دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا حکمراں دکھا سکتے ہو جس کی معاشرت یہ ہو کہ قمیص میں دس دس پیوند لگے ہوں۔ کاندھے پر مشک رکھ کر غریب عورتوں کے یہاں پانی بھر آتا ہو۔ فرش خاک پڑ رہتا ہو۔ بازاروں میں پڑا پھرتا ہو۔ جہاں جاتا ہو جریدہ و تنہا چلا جاتا ہو۔ اونٹ کے بدن پر اپنے ہاتھ سے تیل ملتا ہو۔ درود دربار۔ نقیب و چاؤش، حشم و خدم کے نام سے آشنا نہ ہو اور پھر یہ رعب و داب ہو کہ عرب و عجم اس کے نام سے لرزتے ہوں اور جس طرف رخ کرتا ہو زمین دہل جاتی ہو۔ سکندر و تیمور تیس تیس ہزار فوج رکاب میں لے کر نکلتے تھے جب ان کا رعب قائم ہوتا تھا۔ عمر فاروق رضؓ کے سفر شام میں سواری کے ایک اونٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن چاروں طرف غل پڑا ہوا تھا کہ مرکز عالم جنبش میں آگیا ہے“ [۲]

لیکن زور بیان کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ واقعات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس لئے ان پر خیانت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کے ہمعصر حالی کے متعلق ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ان کی محرومی یہ ہے کہ وہ جوش خروش کے موقع پر بھی منہ بنائے نظر آتے ہیں۔ آزاد نے اس کے برعکس دوسری غلطی کی ہے یعنی انہوں نے جوش و خروش اور لطف بیان پر اکثر حقیقت کو قربان کر دیا ہے اسی وجہ سے ان کی تاریخی و تنقیدی تصانیف معیار سے ساقط سمجھی جاتی ہیں۔

ایجاز و اختصار کلام کی خوبی کا خواہ وہ نظم ہو یا نثر ایک بڑا معیار یہ ہے کہ اسی قدر الفاظ استعمال کئے جائیں جس قدر اظہار مطلب کے لئے ضروری ہوں۔ جس قدر الفاظ کم ہوں گے اسی قدر بات صاف بیان ہو سکے گی۔ عبارت آرائی یا طول کلام میں ہمیشہ بہکنے کا امکان رہتا ہے جو لوگ طبعاً اسے پسند کرتے ہیں ان کی تحریروں میں لازمی طور پر بے ربط و یابس ملا نظر آتا ہے۔ اس سے ایک اور نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ بات میں بات نکلتی چلی آتی ہے اور لکھنے والا اصل مطلب سے اکثر دور جا پڑتا ہے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال نذیر احمد کی تصانیف

---

[۱] موازنہ انیس و دبیر ص ۲۵۱-۲۵۲ (251-252) مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۲۴ء [۲] الفاروق حصہ دوم ص ۳۰۹-۳۱۰ معارف پریس اعظم گڈھ

www.urduchannel.in

میں ملتی ہے۔ بات میں بات پیدا کرنے کا انہیں خاص شوق ہے۔ اس لئے ان کی تصانیف میں بہت سے حصے ایسے ہیں جنہیں الگ قطعاً نکال دیا جائے تو کتاب کی حیثیت میں کوئی کمی نہ ہو۔ آزاد کے یہاں بھی اسکی مثالیں مل جائینگی۔ سرسید اور حالی البتہ اس سے بری ہیں اور شبلی نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے ان کی تاریخی تصانیف میں غیر ضروری باتیں بالکل نہیں ہیں اور نہ خالص لفاظی یا عبارت آرائی کے لئے کہیں عبارت آرائی کی گئی ہے۔ مثلاً مولانا روم کی پیدائش کے سلسلے میں لکھتے ہیں :۔

"محمد نام، جلال الدین لقب عرف مولانائے روم۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی اولاد میں تھے۔ جواہر مضیہ میں سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا ہے۔ محمد بن محمد بن حسین بن احمد بن قاسم بن مسیب بن عبداللہ بن عبدالرحمن بن ابی بکر الصدیق، اس روایت کے رو سے حسین بلخی مولانا کے پردادا ہوتے ہیں لیکن سپہ سالار نے ان کو دادا لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔ حسین بہت بڑے صوفی اور صاحب دل تھے سلاطین وقت اس قدر ان کی عزت کرتے تھے کہ محمد خوارزم شاہ نے اپنی بیٹی کی ان سے شادی کردی تھی بہاء الدین اسی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے سلطان محمد خوارزم شاہ بہاء الدین کا ماموں اور مولانا کا نانا تھا" لے

حقیقت نگاری حقیقت نگاری کے یہ معنی ہیں کہ شاعر، خطیب، یا انشاء پرداز جس چیز یا واقعہ کو بیان کرے دوسروں کے بعینہٖ اس کی تصویر آجائے جو لوگ اس وصف میں درجۂ کمال تک پہونچ جاتے ہیں ان کا کلام معراج فن قرار پاتا ہے۔ شبلی کو اس کا بڑا موقع تھا۔ انہوں سوانحمریاں لکھی ہیں جن میں صاحب سوانح چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ذاتی حالات و واقعات، ان کا ماحول، انہوں نے کن چیزوں کا اثر قبول کیا اور خود کیا اثر چھوڑا، سب اس طرح بیان کرتے ہیں کہ صدیوں پہلے کی شخصیتیں اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہیں اور ہم ان کی خامیاں اور خوبیاں بیک نظر دیکھ لیتے ہیں۔ سوانح عمریوں سے قطع نظر تاریخی مقالات میں بھی شبلی کی یہ خصوصیت نظر آتی ہے مثلاً اسلامی مدارس اور کتب خانوں کا حال اس طرح لکھا ہے کہ پڑھنے والے خود کو مسلمانوں کی قرون اولیٰ میں محسوس کرتے ہیں۔ موازنہ انیس و دبیر، اور شعر العجم میں تنقید اس انداز میں کی ہے کہ ہم پر وہی جذبہ طاری ہو جاتا ہے جو غالباً شاعر پر لکھتے وقت اور شبلی پر

لے سوانح مولانائے روم ص ۲- (مطبوعہ معارف پریس ۱۹۳۶ء) -

www.urduchannel.in

نقد کرتے وقت طاری تھا۔ مثلاً "اسلامی حکومتیں اور شفا خانے" کے عنوان سے ان کا جو مضمون ہے اس میں لکھتے ہیں :۔

"امیر معاویہ ؓ نے عرب کو چھوڑ کر دمشق کو اپنا پایہ تخت بنایا اور سلطنت اور دربار کے ٹھاٹھ جمائے چنانچہ ایک عیسائی طبیب جس کا نام ابن آثال تھا خاص دربار کا طبیب مقرر ہوا۔ اس کے سوا اور بہت سے طبیب دربار سے تعلق رکھتے تھے۔

تمدن کی وسعت کے ساتھ ساتھ اس صیغہ کو بھی برابر ترقی ہوتی گئی اور ملک میں بہت سے جراح و طبیب پیدا ہو گئے جو بطور خود اپنے گھروں پر علاج کرتے تھے کیوں کہ اس وقت شفا خانوں کا طریقہ نہیں قائم ہوا تھا۔ سب سے پہلے جس نے اس کی بنیاد ڈالی وہ حکومت بنی اُمیہ کا تیسرا تاجدار ولید بن عبدالملک تھا ولید کو رفاہ عام کے کاموں سے طبعی لگاؤ تھا اور اس صیغہ میں بہت سے کام ہیں جو اول اسی کے ہاتھ سے عمل میں آئے۔ اوّل اسی نے مہمان خانۂ عام قائم کیا ملک میں جس قدر اندھے اور مفلوج تھے سب کی فہرست مرتب کرا کے ان کے وظیفے مقرر کر دیے اور ہر ایک کے ساتھ ایک ایک خادم متعین کیا۔ جذامیوں کے روزینے مقرر کر دیے اور حکم دیا کہ گھر سے نہ نکلنے پائیں اسی سلسلہ میں شفاخانے کی بنیاد ڈالی جو ۸۸ھ میں بن کر تیار ہوا اور بہت سے طبیب و جراح علاج کے لئے متعین ہوئے"۔ [۱]

حقیقت نگاری کی مثالیں سرسید اور شبلی کے سوا اور کسی میں نہیں ملتیں۔ اس قسم کا سب سے اچھا نمونہ خود سرسید کا مضمون 'بحث و تکرار' ہے۔

---

[۱] مقالاتِ شبلی جلد ششم، ص ۱۷۷ - ۱۷۸ (مطبوعہ معارف پریس ۱۹۳۷ء)

www.urduchannel.in

× شبلی سے صدیوں پہلے بھی فصاحت کی تعریف یہی تھی ۔

× یہ عبارت بے ضرورت ہے۔ اس لیے کہ فصاحت کے لیے نہ نظم کی تخصیص ہے نہ نثر کی ۔

ص

یہ اعتراض وقیع نہیں ۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ فلاں شخص نے شیکسپیر کو "مسٹر شیکسپیر" نہیں لکھا مگر اپنے زمانے کے معمولی لوگوں کو نام کے ساتھ مسٹر لکھا ہے۔ البتہ مشرق میں تعظیمی لفظ یا القاب زیادہ استعمال ہوتے ہیں مگر صیغۂ واحد سے ہرگز توہین نہیں نکلتی ۔

www.urduchannel.in

فصاحت و بلاغت

فصاحت و بلاغت پر علمائے ادب نے بہت کچھ مباحثہ کیا ہے اردو میں خود شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں اسی عنوان کو قائم کرکے جو کچھ لکھا ہے اس سے فصاحت و بلاغت کے لوازم کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ فصاحت کی تعریف شبلی نے یہ کی ہے کہ الفاظ میں تنافر نہ ہو، ثقالت نہ ہو، غرابت نہ ہو۔ اگرچہ شبلی نے یہ بیان نظم کے سلسلے میں لکھا ہے ~~لیکن اس کا اطلاق نثر پر بھی اسی طرح ہوتا ہے~~ ثقیل الفاظ جو کریہہ الصوت ہوں نظم میں آئیں یا نثر میں بہر حال ناگوار ہوں گے ۔ غریب الفاظ جن سے کان نا آشنا ہوں دونوں موقعوں پر یکساں طور سے نامانوس معلوم ہوں گے اس سے معلوم ہوا کہ یہ شرطیں نظم و نثر دونوں کے لئے ضروری ہیں پھر خود ہی تشریح کرتے ہوئے شبلی نے بتایا ہے کہ الفاظ کی فصاحت کے مدارج ہیں یعنی بعض الفاظ فصیح ہیں اور بعض فصیح تر اور بعض ان سے بھی زیادہ فصیح ۔ اچھا شاعر، اچھا ادیب اور اچھا انشا پرداز ہمیشہ فصیح ترین الفاظ انتخاب کرتا ہے ۔ فصاحت مفرد الفاظ تک محدود نہیں بلکہ ترکیبوں میں آکر بعض فصیح الفاظ بھی غیر فصیح ہو سکتے ہیں اور اس کا پہچاننا صرف مذاق سلیم پر منحصر ہے ۔ شبلی نے ان تمام نکتوں کو اس تفصیل اور خوبی سے لکھا ہے اور ان کی ایسی موزوں اور مناسب مثالیں دی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ فصاحت کے سارے اسرار و رموز ان پر منکشف تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ثقیل یا غریب الفاظ بالکل نہیں پائے جاتے اور نہ ترکیبوں میں کہیں شتر گربگی نظر آتی ہے ۔

بلاغت کے یہ معنی ہیں کہ واقعات کو اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ قرین قیاس معلوم ہوں اور پڑھنے والے لکھنے والے کے ہمنوا بن جائیں اس میں اس کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ واقعات کس قسم کے ہیں ۔ کس عمر اور کس درجہ کے لوگوں کا ذکر کیا جارہا ہے ۔ یہ بات شبلی نے انیس کی شاعری کے سلسلے میں لکھی ہے لیکن نثر میں بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے ۔ مثلاً حالی کی دو تصانیف 'حیات جاوید' اور 'حیات سعدی' دونوں میں انداز تخاطب بالکل مختلف ہے ۔ حالانکہ سعدیؒ کی عظمت اپنی جگہ مسلم ہے، حالی پر یہ عام اعتراض ہے کہ انہوں نے سعدی کے لئے 'وہ' اور 'اس کا' کے الفاظ استعمال کئے ہیں حالانکہ سر سید یا دوسری شخصیتوں کے لئے لمبے چوڑے القاب و آداب اور تہذیبی خطابات استعمال کئے ہیں ۔ اس بارے میں بھی شبلی اپنے معاصرین میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں ۔ مثلاً :-

(۱) "ایرانی فوج کا نظارہ نہایت مہیب تھا ۔ بہت سے کوہ پیکر ہاتھی تھے جن پر گھنٹے لٹکتے تھے اور بڑے زور و شور سے بجتے تھے ۔ گھوڑوں پر آہنیں پاکھریں تھیں

www.urduchannel.in

سوار سمور کی لمبی ٹوپیاں اوڑھے ہوئے صحرائی جانور معلوم ہوتے تھے -
عرب کے گھوڑوں نے یہ مہیب نظارہ کبھی نہیں دیکھا تھا بدک کر پیچھے ہٹے -
ابو عبیدہ نے دیکھا کہ ہاتھیوں کے سامنے کچھ زور نہیں چلتا - گھوڑے سے کود پڑے
اور ساتھیوں کو للکارا 'جانبازو! ہاتھیوں کو بیچ میں لے لو اور ہودوں کو
سواروں سمیت الٹ دو' اس آواز کے ساتھ سب گھوڑوں سے کود پڑے
اور ہودوں کی رسیاں کاٹ کاٹ کر فیل نشینوں کو خاک پر گرا دیا - لیکن ہاتھی
جس طرف جھکتے تھے صف کی صف پس جاتی تھی - ابو عبیدہ یہ دیکھ کر سفید
پر حملہ آور ہوئے اور سونڈ پر تلوار ماری کہ مستک سے الگ ہوگئی - ہاتھی نے بڑھ کر
ان کو زمین پر گرا دیا اور سینہ پر پاؤں رکھ دیے کہ پڑیاں تک چور چور ہوگئیں" [۱]

جوشِ بیان کا مرد وار فضا

(۲) "اگرچہ بارگاہ الٰہی سے فتح و نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا - عناصر عالم آمادۂ مدد تھے ملائکہ
کی فوجیں ہمرکاب تھیں تاہم عالم اسباب کے لحاظ سے آپ نے اصول جنگ کے مطابق
فوجیں مرتب کیں مہاجرین' اور اوس اور خزرج کے تین دستے قائم کئے -
مہاجرین کا علم مصعب بن عمیر کو عنایت فرمایا - خزرج کے علمبردار حباب بن منذر
اور اوس کے سعد بن معاذ مقرر ہوئے - صبح ہوتے ہوتے آپ نے صف آرائی شروع
کی - دست مبارک میں ایک تیر تھا اس کے اشارہ سے صفیں قائم کرتے تھے کہ کوئی
شخص تل بھر آگے یا پیچھے نہ رہنے پائے لڑائی میں شور و غل عام بات ہے لیکن منع
کر دیا گیا کہ کسی کے منہ سے آواز تک نہ نکلنے پائے -
- - - - - - - - - - - اب دو صفیں آمنے سامنے مقابل تھیں - حق و
باطل' نور و ظلمت' کفر و اسلام - - - - - - - - - - -
یہ عجیب منظر تھا - اتنی بڑی وسیع دنیا میں توحید کی قسمت صرف چند جانوں
پر منحصر تھی - صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت خضوع کی حالت
طاری تھی - دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتے تھے " خدایا! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے
آج پورا کر" محویت اور بے خودی کے عالم میں چادر کندھے پر سے گر گر پڑتی تھی اور
آپ کو خبر تک نہ ہوتی تھی کبھی سجدے میں گرتے تھے اور فرماتے تھے کہ " خدایا!
اگر یہ چند نفوس آج مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائے گا"
اس بے قراری پر بندگان خاص کو رقت آگئی - حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی :-
"حضور خدا اپنا وعدہ پورا کرے گا" آخر روحانی تسکین کے ساتھ
سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ
پڑھتے ہوئے لب مبارک مژدۂ فتح کی پیشین گوئی سے آشنا ہوئے " [۲]

---

[۱] الفاروق ص ۸۴ - ۸۵ [۲] سیرۃ النبی' حصہ اول' ص ۳۲۴ - ۳۲۵ (مطبوعہ نامی پریس کانپور)

www.urduchannel.in

رنگینی رنگینی اور متانت' بظاہر دو متضاد چیزیں ہیں۔ ناظرین کو شاید تعجب ہوگا کہ ابھی پچھلے صفحات میں شبلی کے اسلوبِ نگارش کی پہلی خصوصیت ہم نے متانت و سنجیدگی بتائی ہے اور اب رنگینی کا ذکر کر رہے ہیں لیکن جن لوگوں نے شبلی کی سیرۃ کا مطالعہ کیا ہے وہ واقف ہیں کہ ان کی طبیعت کس درجہ رنگین واقع ہوئی تھی اس کا ذکر ہم ان کے خطوط اور مکاتیب کے سلسلے میں کر چکے ہیں یہ رنگینی زیادہ تر ایسے موقعوں پر ملتی ہے جہاں یا تو زورِ بیان مقصود ہوتا ہے جس کی مثالیں اوپر مذکور ہوئیں یا شعر و شاعری کے لطیف رموز و نکات ہیں جو شعر العجم کی سطر سطر سے واضح ہیں۔

لیکن یہ وصف سب سے زیادہ ان کی بے تکلف تصانیف یعنی خطوط اور مکاتیب کے مجموعوں میں ملتا ہے یہ غالباً اس لئے ہے کہ باقی تصانیف جن اہم مباحث پر ہیں ان میں رنگینی کے دخل کا موقع کم تھا۔ پھر بھی سیرۃ النبی صلعم جیسی کتاب میں بھی جا بجا اس کی جھلک ہے مثلاً سیرۃ النبی ولادت کا باب اس کی سب سے اچھی مثال ہے۔

اس وصف میں شبلی کے معاصرین میں صرف آزاد ان کے ہمرنگ ہیں لیکن آزاد کے یہاں یہ رنگ نہایت شوخ اور گہرا ہے اور اس نے جو نقائص پیدا کر دئے ہیں ان کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

صفائی و شستگی بیان عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ دقیق مسائل کو اس طرح بیان کرنا کہ عوام کے ذہن نشین ہو جائیں نہایت دشوار ہے خصوصاً اردو جیسی زبان کے لئے جس کے الفاظ کا سرمایہ نہایت محدود ہو اور جس کے اسالیب میں پختگی نہ آئی ہو یہ دقت اور بڑھ جاتی ہے۔ نثر کے مضامین تو ایک طرف شعر و شاعری میں جب غالب نے کچھ مشکل خیالات ادا کرنے چاہے تو الفاظ کا جامہ خیالات پر تنگ نظر آیا۔ یہ دقت آج بھی محسوس کی جا رہی ہے کہ اگر غیر زبانوں کے علمی ذخیرے اپنی زبان میں منتقل کئے جائیں تو الفاظ ساتھ نہیں دیتے' اور نئے الفاظ اور اصطلاحات وضع کئے جائیں تو عبارت میں مغائرت اور اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ شبلی نے بعض نہایت دقیق مسائل پر قلم اٹھایا ہے مثلاً "علم کلام کے نازک مباحث" لیکن ان کی عبارت اور اندازِ بیان اتنا صاف اور سلجھا ہوا ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مباحث پڑھنے والے کے لئے بالکل آئینہ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً :-

www.urduchannel.in

"حقیقت یہ ہے کہ جن اسباب سے ہم کو خدا کے وجود کا یقین ہوتا ہے بعینہٖ وہی اسباب اس بات کے بھی شاہد ہیں کہ خدا ایک ہی ہے

• نظامِ عالم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو بظاہر وہ کثیر الاجزاء یا کثیر الافراد ہے لیکن سب مل کر ایک ہے یعنی اس کُل کا ایک ایک جزو دوسرے سے اس قدر وابستہ ہے کہ وہی ایک شخص اس کو چلا سکتا ہے جو تمام جزوں کا موجد اور ان کے باہمی تناسب کا محافظ ہو، اسی دلیل کو قرآن مجید میں اس طرح ادا کیا ہے :-

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا | اگر آسمان و زمین میں کئی خدا ہوتے تو نظامِ عالم بگڑ جاتا۔

منطقی پیرائے میں اگر یہ استدلال بیان کیا جائے تو پہلے مقدماتِ ذیل کو ذہن نشین کرنا چاہیے :-

۱۔ عالم میں گو بظاہر ہزاروں لاکھوں اشیاء نظر آتی ہیں لیکن 'عالم' ایک شئے واحد ہے اور یہ تمام اشیاء اس کی ذاتیات اور اجزاء ہیں جس طرح انسان میں باوجود اس کے کہ ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھ، ناک، بہت سے اعضاء پائے جاتے ہیں تاہم انسان ایک شے واحد ہے۔

۲۔ ایک چیز کی دو علتِ تامہ نہیں ہو سکتیں، کیوں کہ علت تامہ کے یہ معنی ہیں کہ اس کے وجود کے ساتھ بلا انتظار کسی اور چیز کے معلول وجود میں آ جائے۔ اس لئے اگر ایک معلول کے لئے دو علت تامہ ہوں تو ایک بالکل بے کار ہوگی۔

۳۔ خدا، عالم کی علت تامہ ہے۔

اب استدلال کے مقدمات یہ ہیں :- عالم ایک شئے واحد ہے اور شئے واحد کی دو علت تامہ نہیں ہو سکتیں۔ خدا عالم کی علت تامہ ہے اور علت تامہ متعدد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے خدا متعدد نہیں ہو سکتا۔ یہ بات خاص طور پر خیال کے قابل ہے کہ مطلق توحید بھی درحقیقت تمام مذہبوں میں پائی جاتی ہے جن قوموں کو مشرک کہا جاتا ہے وہ بھی قادرِ مطلق ایک ہی ذات کو مانتے ہیں البتہ اس کے مظاہر اور صفات کو متعدد کہتے ہیں جس سے شرک کا گمان ہوتا ہے۔ عیسائی تین خدا مانتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ تینوں ایک ہیں۔ یہ تعبیر کتنی ہی غلط ہو لیکن اس سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حقیقی تعدد ان کو بھی گوارا نہیں اس لحاظ سے مطلق توحید بھی کوئی نئی بات نہیں۔ اسلام کو اس بات میں خصوصیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس نے توحید کو کامل، یعنی شرک کے ہر قسم کے شائبوں سے پاک کر دیا اور یہ منجملہ اُن تکمیلوں کے ہے جن کی وجہ سے اسلام کے بعد اور کسی مذہب کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ کمال کے بعد پھر کوئی درجہ نہیں۔ توحید کامل کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح خدا کی ذات میں کوئی شریک نہیں اسی طرح

www.urduchannel.in

اس کی صفات میں بھی کوئی شریک نہیں، پیدا کرنا، زندہ رکھنا، مارنا، عالم الغیب ہونا، دور و نزدیک سے یکساں تعلق رکھنا یہ تمام صفات خدا کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسلام کے سوا اور مذہب والے، اوتاروں اور پیغمبروں میں بھی یہ اوصاف مانتے ہیں اور مانتے ہیں اور یہی توحید کا نقص ہے۔ اگرچہ افسوس ہے کہ بہت سے مسلمان بھی اب اصطلاح کا پردہ رکھ کر ان اوصاف کو اوروں میں بھی ماننے لگے ہیں۔ اسلام نے توحید کے کمال کے لئے 'توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی العبادت' کو بھی ضروری قرار دیا۔ یہاں تک کہ سجدۂ تعظیمی جو تمام دوسرے مذاہب میں خدا کے سوا اوروں کے لئے بھی جائز تھا اسلام نے اس کو بھی حرام کر دیا" ؎۱

لیکن صفائی و شستگی سے یہ مطلب نہیں کہ ادبی چاشنی ہلکی پڑ جائے۔ شبلی کا کوئی مضمون ایسا نہیں ملے گا جس میں عبارت کی خوبی نظر نہ آتی ہو۔ یہ صفائی و شستگی دو وجہوں سے اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے ایک تو یہ کہ عربی کے فاضل ہونے اور فارسی شعر و ادب میں ڈوبے ہونے کے باوجود وہ ثقیل اور نامانوس عربی فارسی الفاظ بہت کم استعمال کرتے ہیں اور اجنبی ترکیبیں تو ان کے یہاں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آزاد اور نذیر احمد دونوں اس مرض میں مبتلا ہیں اور نذیر احمد کے متعلق تو فرحت اللہ بیگ کا یہ فقرہ بہت مشہور ہے کہ "وہ عربی، فارسی کے روڑے ہی نہیں اٹکاتے پہاڑ کھڑے کر دیتے ہیں" آزاد بھی مشکل الفاظ استعمال کرتے ہیں اور فارسی ترکیبیں دل کھول کر لکھتے ہیں۔ حالی کے یہاں اس کے برعکس یہ عیب ہے کہ ان کو موقع بے موقع انگریزی کے الفاظ کے استعمال کا شوق ہے۔ یہ عیب ان کی ہر تحریر میں نظر آتا ہے۔ یہ شوق اتنا بڑھا ہوا ہے کہ انگریزی کے اردو مترادف موجود ہوتے ہوئے بھی وہ انگریزی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

شبلی نے ضرورتاً انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں لیکن وہ حتی الوسع ان الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر لکھتے ہیں تو قوسین میں مترادفات ضرور دے دیتے ہیں۔ ان کی مثالیں ان کی تمام تصانیف میں ملتی ہیں۔

خامیاں جس مصنف نے تصنیف و تالیف ہی کو مقصد حیات بنا لیا ہو، اور سینکڑوں نہیں ہزاروں صفحات مختلف موضوعات پر لکھ ڈالے ہوں اس کے یہاں اگر بعض خامیاں نظر آئیں تو تعجب کی کوئی بات نہیں

؎۱ الکلام نقش چہارم ص ۶۱ - ۶۲۔

www.urduchannel.in

* جو مثالیں دعوے کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں سراسر ناکافی ہیں اور اگر یہ مان بھی لیجیے کہ یہ تکرار صریح ہے تو بھی اُسے "خامی" نہیں کہہ سکتے۔ "خامی" کا لفظ بہت سخت، اور اس لیے بے محل ہے۔ پھر "خامیوں" اور سرخی (پچھلے صفحہ پر) "خامیاں" اس لیے بھی درست نہیں کہ صرف ایک ہی "خامی" (تکرار) کا ذکر کیا گیا ہے۔

www.urduchannel.in

شبلی کی تحریریں ادبی محاسن کے باوجود بعض خامیوں سے خالی نہیں ان میں سے ایک نمایاں مضامین کی تکرار ہے ۔ یہ تکرار اسی کو نظر آسکتی ہے جو شبلی کے تمام تصانیف پر حاوی ہو کیونکہ بالعموم تکرار کی مثالیں ایک ہی مضمون میں نہیں ملتیں بلکہ مختلف مضامین اور تصانیف میں موقع بہ موقع اس قسم کی مثالیں مل جاتی ہیں ۔ مثلاً :-

(۱)

مقالات شبلی جلد سوم	المامون
.... قیصر روم کے حکم سے یہ خزانہ کھولا گیا ۔ تاہم خیال ہوا کہ مسلمانوں کے ساتھ اس قسم کی فیاضی مذہباً ممنوع تو نہ ہو ۔ لیکن ارکان دولت نے قیصر کی تسکین کر دی کہ اچھا ہے، فلسفہ مسلمانوں میں پہنچا تو ان کے مذہبی جوش کو بھی ٹھنڈا کر کے رہے گا ۔ غرض پانچ اونٹ لاد کر فلسفہ کی کتابیں مامون کی خدمت میں روانہ کی گئیں ۔ مامون نے خود بھی حجاج بن المطر و ابن البطریق کو جو ایرانی و سریانی زبان کے بڑے ماہر تھے اس غرض سے روم بھیجا کہ اپنی پسند سے کتابیں انتخاب کر کے لائیں بیت الحکمت کا مینیجر اور افسر جس کا نام سلمان تھا وہ بھی ان دونوں کے ساتھ گیا ۔ مامون نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جیسا کہ گبن صاحب لکھتے ہیں اس کے کارندوں نے ارمینیا، شام، مصر میں فنون یونانی کی کتابیں جمع کیں جس کا ترجمہ اس کے حکم سے نہایت حاذق مترجموں نے زبان عربی میں کیا ۔ اسی زمانے میں قسطا بن لوقا بعلبکی ایک عیسائی فلاسفر اپنے شوق سے روم گیا اور فلسفہ کی بہت سی کتابیں اپنے ساتھ لایا ۔ مامون نے اس کی شہرت سے مطلع ہو کر بلا بھیجا اور بیت الحکمت میں ترجمے کے کام پر مقرر کیا ۔ سہل بن ہارون کو جو ایک فارسی النسل حکیم تھا فارسی کتابوں کے ترجمے کا اہتمام سپرد ہوا [1]	راہب کی ہدایت پر یہ پر خطر خزانہ کھولا گیا تو بہت سی کتابیں محفوظ ملیں لیکن قیصر کو اب یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کے ساتھ ایسی فیاضی مذہباً ممنوع تو نہ ہو ارکان دولت نے متفق اللفظ عرض کیا کہ " کچھ مضائقہ نہیں فلسفہ اگر مسلمانوں میں پھیلا تو ان کے مذہبی جوش کو بھی ٹھنڈا کر کے رہے گا ۔ قیصر نے بھی یہی مناسب سمجھا اور پانچ اونٹ لاد کر خاص فلسفہ کی کتابیں مامون کے پاس روانہ کیں ۔ مامون نے تصنیفات ارسطو کے ترجمے پر یعقوب بن اسحاق کندی کو مامور کیا جو مختلف زبانوں کے جاننے اور تحقیقات علمی میں عموماً بے نظیر مانا جاتا تھا ۔ مامون نے خود بھی حجاج بن المطر یوحنا بن البطریق ۔ سلما کو جو بیت الحکمت مہتمم اور افسر تھے اس غرض سے روم بھیجا کہ اپنی پسند سے کتابیں انتخاب کر کے لائیں ۔ ارمینیا، مصر، شام، سپرس اور دوسرے مقامات میں بھی قاصد بھیجے اور لاکھوں روپے عنایت کئے کہ جس قدر صرف سے اور جس طرح ممکن ہو فلسفی تصنیفات بہم پہنچائیں ۔ اسی زمانے میں قسطا بن لوقا ایک عیسائی فلاسفر اپنے شوق سے روم گیا اور فنون حکمت کی بہت سی کتابیں بہم پہنچائیں ۔ [2]

یہ ایک واقعہ تو ایک مصنف دو کتابوں میں بیان کرے؟ اسکو قابل حذف

(۲)

شعر العجم صفحہ ۱۴ حصہ چہارم	شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۳۵
لیکن شاعر کو ان چیزوں سے غرض نہیں، پھول دیکھ کر بے اختیار اس کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے :- "اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری"	عالم شوق میں وہ پھول ہاتھ میں اٹھا لیتا ہے تو اس کو صاف معشوق کی خوشبو آتی ہے اور پھول سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :- "اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری"

[1] مقالات شبلی جلد سوم ص ۱۲

[2] المامون حصہ دوم ص ۱۷۷ - ۱۷۸ (مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ سنہ ۱۳۳۶ھ)

www.urduchannel.in

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہوگیا ہوگا کہ تکرار صرف خیالات کی ہی نہیں، الفاظ اور عبارت کی بھی ہے لیکن ایسی مثالیں پوری تصانیف کے مقابلے میں سمندر میں قطرہ کی حیثیت سے زیادہ نہیں۔ اسلئے ان سے شبلی کی انشاء پردازی پر حرف نہیں آتا۔ دوسری خامی یہ ہے کہ بعض اوقات ان کو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا اور وہ جوش میں ایسی باتیں بھی کہہ گذرتے ہیں جو ان کی سنجیدگی اور متانت تحریر پر زیب نہیں دیتیں۔ اس کا اعتراف انہوں نے خود بھی جابجا کیا ہے جس کی مثال "شبلی کا نظریۂ تاریخ" کے سلسلے میں دی گئی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ چیز ان میں عادتاً نہیں پائی جاتی بلکہ اتفاقاً کہیں کہیں آجاتی ہے اور وہ بھی اعتدال کی حد سے آگے نہیں بڑھتی البتہ موازنہ میں انہوں نے دبیر کے متعلق جو لہجہ اختیار کیا ہے اس کی البتہ کوئی توجیہ نہیں دی جاسکتی لیکن ان کے تحریری محاسن و کمالات کے مقابلے میں یہ ایسے خفیف نقائص ہیں کہ ان کی حیثیت چاند کے دھبوں سے زیادہ نہیں۔

موازنہ و مقابلہ کسی شاعر، ادیب یا انشاء پرداز کا درجہ متعین کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس کے معاصرین سے اس کا موازنہ و مقابلہ کیا جائے اور دکھا دیا جائے کہ زبان کی خدمت میں تنوع و وسعت، کام کی اہمیت اور انشاء پردازی کے لحاظ سے کس کا درجہ سب سے زیادہ بلند ہے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو بغیر کسی اختلاف کے صرف شبلی کا نام لیا جائے گا۔ عرصہ ہوا مشہور رسالہ 'الناظر' نے ایک انعامی مقابلہ کا اعلان کیا تھا جس کا عنوان تھا "اردو ادب میں سب سے بڑا درجہ کس کا ہے"۔ اس کے متعین کرنے کے لئے یہ دو شقیں اختیار کی گئی تھیں کہ اردو کی سب سے زیادہ خدمت کس نے کی اور سب سے بڑا انشاء پرداز کون ہے۔ اس پر متعدد اصحاب قلم نے مضامین لکھے تھے اور کثرت رائے سے فیصلہ شبلی کے حق میں ہوا تھا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ موضوع کی اہمیت، تصانیف کی کثرت، تنوع اور انشاء پردازی میں شبلی کا پلہ ان کے تمام معاصرین میں بھاری ہے، جس کا اندازہ اس نقشہ سے ہوگا :-

آزاد کی تصانیف (الف) ادبی مضامین :-

نیرنگ خیال
جانورستان
نصیحت کا کرن پھول

www.urduchannel.in

(ب) تاریخ :-

دربار اکبری

(ج) تاریخ ادب وتنقید :-

نگارستان فارس

سخندان فارس

آبحیات

دیوان ذوق

(د) سفرنامہ :-

سفرنامہ ایران

(ہ) مکاتیب :-

مکتوبات آزاد

حالی کی تصانیف

(ا) سوانح :-

حیات سعدی

یادگار غالب

حیات جاوید

(ب) ادب وتنقید :-

مقدمہ شعر وشاعری

مقدمہ مسدس حالی

(د) ــــ > مقالات (دو جلدیں)

(ج) مکتوبات ۔

(ہ) تراجم :-

طبقات الارض

(و) رسالہ میلاد شریف :-

تریاق مسموم

نذیر احمد کی تصانیف

(ا) عقلیات :-

الحقوق والفرائض

الاجتہاد

مبادی الحکمت

(ب) سوانح :-

امہات الامۃ

www.urduchannel.in

(ج) تعلیمات :-

مجموعہ لکچرس

(د) ادبیات :-

مرآۃ العروس

بنات النعش

توبۃ النصوح — بۃ

ایامی

ابن الوقت

منتخب الحکایات

چند پند

فسانہ مبتلا

مصائب غدر ← رویائے صادقہ

صرف ونحو۔

(ہ) مکاتیب :-

مواعظ حسنہ — موعظہ

(و) تراجم :-

ترجمہ قرآن مجید

ترجمہ تعزیرات ہند

شبلی کی تصانیف

(ا) عقلیات :-

علم الکلام

الکلام

فلسفیانہ مضامین

(ب) تاریخ :-

تاریخی مضامین (دو جلدیں)

(ج) سوانح :-

المامون

الفاروق

الغزالی

سیرۃ النعمان

www.urduchannel.in

سوانح مولانا روم
سیرۃ النبی

(د) تعلیم :-
تعلیمی مضامین

(ہ) سیاسیات :-
سیاسی مضامین

(و) ادب و تنقید :-
موازنہ انیس و دبیر
شعر العجم (پانچ جلدیں)
تنقیدی مضامین

(ز) سفرنامہ :-
سفرنامۂ روم، مصر و شام

(ح) مکاتیب :-
مکاتیب شبلی حصہ اول و دوم
خطوط شبلی

(ط) تراجم :-
تاریخ اسلام

اس فہرست پر نگاہ ڈالنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ کس نے زیادہ سے زیادہ موضوعات اختیار کرکے تنوع پیدا کیا اور کس نے سب سے زیادہ زبان کی خدمت کی۔ خالص انشاء پردازی میں ان کا جو درجہ تھا اس کی تفصیل اوپر بیان کی جاچکی ہے۔

---

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

انیسویں صدی کے نصفِ آخر کی دو زبردست شخصیتیں

مہدی افادی

سرسید اور شبلی

انیسویں اور بیسویں کا دور عبوری ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کے لئے یوں بھی یادگار رہے گا کہ اس زمانہ میں مفکرین، مجاہدین اور مصلحین کی ایک پوری جماعت ملک و ملت کی فلاح و بہبود میں کوشاں نظر آتی ہے۔ صرف مسلمانوں میں سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، آزاد، محسن الملک، وقار الملک، سمیع اللہ خاں، چراغ علی، ذکاء اللہ ایک طرف اور مولانا سید احمد بریلوی مولانا اسمعیل شہید اور ان کے رفقاء دوسری طرف اپنے کارناموں کی بدولت حیات ابدی حاصل کر چکے ہیں سرسید کو اس دور کا مصلح اعظم کہا جاتا ہے لیکن لوگوں کو ان پر دو اعتراضات ہیں ایک تو یہ کہ وہ یورپ سے بہت مرعوب تھے اور ہر چیز کو اسی کی لگائی ہوئی عینک سے دیکھتے تھے چنانچہ مذہب کی تطبیق بھی انہوں نے مغرب کے عقلی معیار سے کرنی چاہی اور اس سلسلے میں جابجا ان کا قدم جادۂ اعتدال سے ہٹ گیا ہے۔ اُن کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ ان کے یہی مذہبی رجحانات تھے چنانچہ اس میں شبلی بلکہ حالی تک نے جو حاضر غائب انہیں اپنا پیر و مرشد سمجھتے تھے ان سے اختلاف کیا ہے۔ دوسرے انگریزوں سے غیر مشروط موالات جو سرسید مسلمانوں کی قومی ترقی کے لئے اس وقت ناگزیر سمجھتے تھے بعض لوگوں کو پسند نہ تھا۔ اختلاف کی یہ دوسری وجہ سیاسی تھی مولانا حالی نے تیسری وجہ 'حیات جاوید' میں سرسید کی سٹیر کو بتایا ہے کہ وہ "Despotic" تھے یعنی مطلق العنان، اس کا ایک ثبوت "ٹرسٹیز بل" کے ہنگامے سے ملتا ہے۔ سرسید کی یہ کوشش کہ ان کے بعد سید محمود ایم۔اے۔او کالج کے حین حیاتی سکریٹری ہوں بڑے اختلاف کا باعث ہوا۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان تینوں حالتوں کا اثر سرسید کی شخصیت پر کیا پڑتا ہے لیکن سب سے اہم مذہبی اختلافات ہیں۔ سرسید اسلام کو اس معنی میں دین فطرت کہتے تھے کہ اس میں کوئی بات محدود انسانی عقل اور فطرت کے مقررہ قوانین کے خلاف نہ ہونی چاہئے اس لئے وہ ہر اس چیز کی جو اُن کو خلافِ فطرت یا خلاف عقل نظر آتی تھی تاویل کرتے تھے۔ یہ کوشش سرسید نے نئی کی۔ شبلی نے المعتزلہ والاعتزال والے مضمون میں خود اعتراف کیا ہے کہ مذہبی اختلافات صحابۂ کرام کے عہد مبارک ہی سے شروع ہو گئے تھے اور اس زمانے بھی بعض لوگ مذہب کو عقل کے معیار پر جانچنے لگے تھے۔ شبلی نے اسی کو معتزلہ کے عقائد کی ابتداء بتایا ہے۔ کلام پاک کی جتنی تفسیریں معتزلہ نے لکھی ہیں ان میں خاص طور پر یہ رجحان

www.urduchannel.in

نظر آتا ہے ۔ معتزلہ نے اسلام کے عقائد و تعلیمات پر فلسفۂ یونان کے اعتراضات کے جواب کے لئے علم ایجاد کیا جو ہر دور میں برابر قائم رہا اسلئے سرسید کی یہ کوشش نئی نہیں تھی لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ سرسید اس میں حد اعتدال سے بہت آگے بڑھ گئے تھے اور وہ اسلام کی عقلی تطبیق میں اس کی نہایت مضحکہ خیز تاویلیں کرتے تھے اور بعض اوقات تو سرے سے اصل مسئلے ہی کا انکار کر دیتے تھے لیکن ہم سرسید کو مذہبی لیڈر کی حیثیت سے پیش نہیں کرتے گو ان کے عالم ہونے میں شبہہ نہیں لیکن ہمارے نزدیک انہیں ایک مذہبی امیر سمجھنا صحیح نہیں ہے ۔ البتہ ان کے خلوص سے ہمیں سبق لینا چاہیئے ۔ اس سے ان کے مخالفین کو بھی انکار نہیں کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے سچے ہمدرد و بہی خواہ تھے ۔ علی گڈھ میں جب مذہبی تعلیم کے شمول کا مسئلہ پیش ہوا اور علماء کی جماعت نے اس سے اختلاف کیا تو وہ اس پر آمادہ ہو گئے کہ وہ الگ ہو جائیں حالانکہ کالج تمام تر انہیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا مسلمانوں کی انہوں نے جو خدمات انجام دیں وہ الیسی اظہر من الشمس ہیں کہ ان پر کسی بحث کی ضرورت نہیں اگر وہ مذہب کے دائرے میں قدم نہ رکھتے تو ان کی شخصیت ہر طبقہ میں مسلم ہوتی ۔ مسلمانوں کی گذشتہ پچاس سالہ تاریخ میں زندگی کے ہر نئے رجحان کی ابتدا انہیں کے سرچشمہ فیض علی گڈھ سے ہوئیں ۔ اس علی گڈھ نے کٹر مذہبی بھی پیدا کئے اور انگریزوں سے سر بکف لڑنے والے مجاہدین بھی ۔ اگر پچاس سال کے مسلمان مشاہیر کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو اس میں علی گڈھ کے فرزندوں کا سب سے بڑا حصہ ہوگا ۔ ان سب کو براہ راست یا بواسطہ سرسید سے فیض پہنچا ہے ۔

سرسید احمد خاں نے زبان اور ادب پر جو احسان کیا اس کا اعتراف خود شبلی نے اس مضمون میں کیا ہے جو سرسید کی وفات پر لکھا تھا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید شبلی کی نظر میں اردو کے سب سے بڑے محسن تھے یوں تو آزاد، حالی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، شبلی سب اردو زبان و ادب کے عناصر ہیں لیکن ان عناصر میں روح سرسید ہی نے پیدا کی ۔ حالی سرسید سے ملنے سے پہلے کیا تھے ۔ شبلی علی گڈھ سے پہلے کس حیثیت میں تھے ۔ ان سب کے کارنامے علی گڈھ تحریک سے پہلے اور علی گڈھ تحریک کے بعد موجود ہیں ۔ دونوں کا مقابلہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ انقلاب کس سرچشمۂ فیض کا اثر تھا ۔

سرسید کے تعلیمی نظریہ سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا ۔ جدید تعلیم کی ضرورت کو خود شبلی نے محسوس کیا ہے اور اپنے تعلیمی مقالات میں جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ جدید تعلیم کی ضرورت بلا شبہہ مسلم ہے ۔ البتہ مذہبی تعلیم کا شمول نہ صرف شبلی بلکہ اور بھی بہت سے لوگوں کے نزدیک ضروری

www.urduchannel.in

تھا لیکن عربی کے پرانے نصاب کو شامل کرنے سے کسی فائدے پر پہنچنے کا امکان نہ تھا۔ شبلی خود بار بار اس کا رونا روئے ہیں کہ قدیم نصاب فوری تبدیلی چاہتا ہے۔ ندوۃ العلماء کی تحریک کا سب سے بڑا مقصد یہی اصلاح نصاب تھا۔ ندوہ اگرچہ مستقل حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بانی اور ترقی دینے والے زیادہ تر علماء ہی تھے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سید کی اصلاحات سے بھی ندوہ متأثر ہوا۔ سر سید احمد خاں نے پہلی مرتبہ مغربی علوم و فنون سے استفادہ کی تحریک کو عملی جامہ پہنایا۔ اس سے ہندوستانیوں کو جو فائدہ پہنچا وہ شبلی کے پہلے مضمون "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" سے ظاہر ہے۔ یورپ کی تحقیقات علمیہ سے اہل ہند کو روشناس کرانے میں سر سید کا سب سے بڑا ہاتھ ہے اور اگرچہ علی گڈھ میں انگریزوں کے اثر و نفوذ پر بہت کچھ اعتراضات کئے گئے ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اہل علم انگریزوں سے کالج کے تعلق رکھنے والوں کو فوائد بھی پہنچے خود شبلی اور آرنلڈ ایک دوسرے سے مستفید ہوئے اور شبلی انہیں کے ساتھ ہندوستان سے باہر تعلیمی اور تحقیقی مقاصد لے کر گئے۔ اقبال نے جو آرنلڈ کے علی گڈھ سے چلے جانے کے بعد اور لاہور کے دوران قیام میں ان کے شاگرد ہوئے تھے انہیں اپنے ذوق علم کا محرک بتایا ہے اور نہایت جذبات میں آرنلڈ کی رخصت پر "نالۂ فراق" کے عنوان سے ایک رقت آمیز نظم لکھی ہے۔ اسی طرح اور لوگ بھی ہیں جو علی گڈھ کے انگریز اساتذہ کی تربیت سے پروان چڑھے اور جنہوں نے ملک و ملت کی خدمت میں اپنی عمر صرف کی مثلاً مسٹر ماریسن جنہوں نے سید محمود کی خراب حالت دیکھ کر راس مسعود کو اپنی نگرانی میں لے لیا تھا اور بڑی محنت سے ان کی تربیت کی۔ علی گڈھ میں جو انگریز آئے ان میں اکثر نہایت شریف النفس اور مسلمانوں کے ہمدرد تھے۔ مسٹر ماریسن ہر وقت قلمے، سخنے، دامے، درمے کالج کی خدمت کو اپنا نہایت خوشگوار فرض سمجھتے تھے۔ یہ بات انہیں کی بدولت علی گڈھ کے طلباء میں آئی کہ سلف رسپکٹ اور قومی افتخار ان کی گردن بلند رکھتا تھا۔

مسلمانوں میں سیاسی شعور سید اور ان کے موالیوں ہی کی بدولت پیدا ہوا اگرچہ وہ اس میدان کے تیز روشہسوار نہ تھے تاہم مسلمانوں کی پولیٹکل زندگی کا آغاز انہیں کی کوششوں سے ہوا "قوم، قومیت" اور اس قسم کے الفاظ اردو میں ان سے پہلے نہیں تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پہلے مسلمانوں میں قومیت کا اثر ہی نہیں تھا۔ سید کی بدولت تحریر و تقریر میں یہ مباحث آنے لگے۔ سید کے ساتھیوں میں مولانا حالی سب سے پرانے ہیں ان کی ملاقات سر سید سے

www.urduchannel.in

۱۸۶۷ئہ یا ۱۸۶۸ئہ میں نواب مصطفٰی خاں شیفتہ کے یہاں ہوئی اس کے بعد ۱۸۷۳ئہ میں سرسید مدرستہ العلوم کے لئے چندہ کرنے پنجاب گئے۔ یہ واقعہ ۱۸۷۳ئہ کا ہے۔ سرسید نے اس موقع پر جو تقریر کی تھی اس سے حالی بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے ۱۸۷۵ئہ میں جب مدرستہ العلوم کا افتتاح ہوا تو ایک نظم سرسید کی خدمت میں بھیجی۔ ۱۸۸۰ئہ میں پہلی مرتبہ علی گڈھ آئے اور اپنے تاثرات کو نثر کے علاوہ اس مشہور ترکیب بند میں نظم کیا جس کا پہلا شعر ہے :-

جھٹپٹے کے وقت ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سرِ راہ لاکے روشن کردیا

مولانا پہلے ایم۔ اے۔ او کالج فنڈ کمیٹی اور کمیٹی متعلقہ علوم دینی کے ممبر اور پھر ٹرسٹی ہوئے اور برابر کالج کے لئے دورے کرتے رہے۔ پانی پت میں جو مولانا کا وطن تھا ایک اسکول کھولا جو "حالی موریل اسکول" ہے۔ تعلیم نسواں کی حمایت کا عملی ثبوت انہوں نے ایک زنانہ اسکول قائم کرکے دیا۔

اردو زبان وادب کی تاریخ میں حالی کا بڑا درجہ ہے انہوں نے قومی شاعری سرسید سے متاثر ہوکر شروع کی۔ جدید شاعری کے نقیب بنے۔ تنقیدی شاعری میں پہلی اصولی بحث 'مقدمے' ہی میں ملےگی۔ اس کے بعد سوانح نگاری کی طرف آئے اور 'حیات جاوید' 'یادگار غالب' اور 'حیات سعدی' لکھ کر اردو میں سوانح نگاری کا آغاز کیا۔ ان سے پہلے نثر کا ایک پرتکلف اور مرصع انداز رائج تھا انہوں نے نہایت سلیس و سادہ انشار اختیار کی لیکن ان علمی و ادبی کاموں کے ماسوا سیاست مذہب یا معاشرت میں انہوں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا۔ انہیں ہم سرسید کا پیرو اور مرید کہہ سکتے ہیں اور وہ خود بھی اس پر ناز کرتے ہیں۔ سرسید کی خامیوں کو بھی آسانی سے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے 'حیات جاوید' کو 'مدلل مداحی' 'کتاب المناقب' اور ایک رخی تصویر کہا گیا ہے۔ انہیں سرسید کے برابر جگہ نہیں مل سکتی۔

سرسید کے دوسرے ممتاز ساتھی سمیع اللہ خاں تھے جنہوں نے سب سے پہلے مدرسہ علی گڈھ میں کھولا جو آج مسلم یونیورسٹی کی صورت میں ہے۔ سرسید کی رائے تھی کہ پہلے سرمایہ جمع کیا جائے پھر کام شروع کیا جائے۔ سمیع اللہ کہتے تھے کہ کام شروع کردیا جائے روپیہ آتا رہیگا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۷۵ء میں اسکول کھول دیا۔ سرسید اسوقت بنارس میں تھے۔ داخل ہونے والوں میں سب سے پہلے ان کے

www.urduchannel.in

بیٹے حمید اللہ تھے جو بعد میں نواب سربلند جنگ حاجی محمد حمید اللہ خاں - ایم - اے کینٹب بیرسٹر ایٹ لاہوے - لیکن بعد میں سرسید سے اختلاف پیدا ہوگیا اور وہ کالج سے علحدہ ہوگئے - اس کے علاوہ سمیع اللہ خاں کا اور کوئی کارنامہ نظر نہیں آتا -

محسن الملک سرسید سے مذہبی مباحثہ کرنے آئے تھے لیکن ان سے ایسے متاثر ہوے کہ مرتے دم تک کالج کی خدمت کرتے رہے انہوں نے بعض کتابیں بھی لکھیں لیکن وہ بھی سرسید کے مقلد تھے - مجتہد کا درجہ انہیں بھی نہیں دیا جاسکتا -

وقار الملک بھی اسی حلقہ میں تھے لیکن تالیف و تصنیف اور کالج کی خدمت کے علاوہ ان کی داستانِ حیات میں بھی کوئی ولولہ خیز نہیں ملتی - وہ بھی حالی اور محسن الملک کی صف میں آتے ہیں -

شبلی عمر میں ان سب سے چھوٹے تھے - نوجوانوں پر بڑی چیز کا بڑا اثر ہوتا ہے اگر شبلی خود قوتِ فیصلہ نہ رکھتے ہوتے تو وہ بھی حالی، محسن الملک، اور وقار الملک کی طرح سرسید کی شخصیت میں ضم ہوجاتے اس احترام کے باوجود جو ان کو سرسید سے تھا اور جو ان کی تحریروں اور تقریروں سے ظاہر ہے وہ سرسید کے اندھے مقلد نہ تھے بلکہ ان کی جس رائے کو غلط سمجھتے تھے اس سے برملا اختلاف ظاہر کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کو سرسید اور علی گڑھ سے بہت کچھ فیض پہنچا اور ان کے خیالات میں بڑا انقلاب پیدا ہوا جس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا -

ایک تعلیم کے مسئلہ میں سرسید جدید تعلیم کے حامی تھے - انگریزی کی تحصیل ضروری سمجھتے تھے مذہبی تعلیم کی اہمیت ان کی نگاہوں میں مسلم تھی مگر ان کی مجوزہ اسکیم میں اس کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ سرسید ترقی کے میدان میں مغربی طور طریقوں کی تقلید ضروری سمجھتے تھے شبلی اصولاً اور عملاً اس کے خلاف تھے اور یہ اختلاف ندوہ کی تاسیس کی صورت میں ظاہر ہوا - اس میں سرسید کے تعلیمی خاکے کے برخلاف اصل مقصود مذہبی تعلیم ہے اور انگریزی کی حیثیت ثانوی ہے - انگریزی تعلیم اور جدید علوم و فنون سے واقفیت اسلئے ضروری ہے کہ مذہبی علماء زمانے کی تند و تیز آندھیوں کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرسکیں - سرسید کے ساتھیوں میں یہ شرف شبلی کو حاصل ہوا کہ تعلیم کا ایسا نظریہ جو اصولاً ان سے مختلف اور عملاً اپنے نتائج میں نہایت دوررس تھا آج بھی ندوہ اور دارالمصنفین کی صورت میں موجود ہے - سرسید کے کسی اور رفیق کو یہ عزت نصیب نہیں ہوئی کہ ان کی زندگی کے مقصد کی تکمیل میں ان کے بعد ان کے تربیت کردہ سپاہی

www.urduchannel.in

اسی طرح سرگرم عمل رہیں۔

سیاسیات میں بھی شبلی کو سرسید سے اختلاف تھا چنانچہ وہ طبعاً کانگریس میں شریک تھے اور سرسید کی طرح انگریزی حکومت کو مسلمانوں کے لئے برکت نہیں سمجھتے تھے۔ اس موقع پر شبلی کے بعض وہ مضامین سامنے آجاتے ہیں جو ایک طرح سرسید کی تائید میں ہیں۔ مثلاً وہ مضمون جس میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ غیر قوموں کا محکوم ہو کر کس طرح رہنا چاہئے یا غیر قوموں کی مشابہت سے مسلمان کافر نہیں ہو جاتا۔ اس کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ یہ مضامین ان سے لکھوائے گئے ہیں لیکن اس بیان کے علاوہ کوئی اور شہادت اس کی تائید میں نہیں ملتی لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ شبلی نے یہ مضمون کسی کی تحریک سے نہیں بلکہ خود لکھے اور ان سے سرسید کی سیاست کے بعض معتقدات کی تائید ہوتی ہے تو بھی ان سے شبلی کی سیاسیات کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی کیوں کہ یہ کسی اہم سیاسی مسئلہ سے تعلق نہیں رکھتے سرسید نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو لکھتے ہوئے جہاد کے مسئلہ کی تاویل کی ہے شبلی نے غالباً مصلحتہً اس مسئلہ پر قلم نہیں اٹھایا ورنہ ان کی پالیسی بالکل واضح ہو جاتی۔

شبلی انیسویں صدی میں پیدا ہونے کے باوجود پرانے رنگ کے عالم تھے اور سرسید سے مذہبی معاملات میں سخت اختلاف رکھتے تھے۔ بعض اور لوگوں نے بھی مذہبی مسائل میں ان سے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ ان کے مدح خواں حالی بھی ان کی تفسیر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں انہوں نے جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں گو شبلی نے مذہبی مضامین میں اس کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے لیکن ان کے مکاتیب سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔

ادب و انشا میں بھی انہیں کسی کا مقلد نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ علی گڈھ آکر ان میں وسعت نظر پیدا ہوئی یا انہوں نے بعض نایاب کتابیں دیکھیں کیوں کہ جن موضوعات پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے ان سب میں ان کی مجتہدانہ شخصیت نمایاں ہے سرسید کا کام ایک طور پر ان کے بعد ختم ہو گیا اور گذشتہ چالیس سال کے عرصہ سے کوئی دوسرا سرسید پیدا نہیں ہوا۔ علی گڈہ میں جن نظریوں کو انہوں نے جہاں چھوڑا تھا وہ اب تک وہیں ہیں۔ ان میں اب تک کسی کو ترمیم و اضافہ کا احساس پیدا نہیں ہوا بہ ایں ہمہ سرسید کا تعلیمی فیض اب تک جاری ہے محسن الملک اور وقار الملک آئے اور خدمت کر کے چلے گئے حالی کے جانشین عبدالحق کہے جاتے ہیں لیکن انہوں نے اپنے آپ کو صرف زبان کے لئے مخصوص کر لیا ہے مذہب اور سیاست سے وہ پرہیز کرتے ہیں پھر یہ کہ عبدالحق کی تحریکیں حالی کی نہیں ان کی اپنی ہیں اس لئے

www.urduchannel.in

صرف شبلی ہی ایک ایسے شخص ہیں جن کے کارنامے اگر سید کے کارناموں کو بے رنگ نہیں کر دیتے تو خود بھی بے نور نہیں ہو جاتے۔ ان کے نظریوں کی تبلیغ و اشاعت اب تک ان کے جانشیں کر رہے ہیں اور جو کام وہ نامکمل چھوڑ گئے تھے اُسے انہوں نے مکمل کیا ہے۔ جو باقی رہ گیا ہے اس کی تکمیل ہوتی رہے گی اور جس عزم و استقلال اور خلوص و دیانت داری سے کام جاری ہے وہ خود تکمیل کی ضمانت کے لئے کافی ہے۔

اورنگ زیب قاسمی

www.urduchannel.in

حرفِ آخر

پچھلے اوراق میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کے بعد شبلی کا مرتبہ بہ آسانی متعین کیا جا سکتا ہے اور نتائج کو اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کر سکتے ہیں :-

۱ - اردو زبان اور ادب کی تاریخ میں ایسی جامع شخصیت جو بیک وقت شاعر، ادیب، ناقد، مورخ، محقق، فلسفی، متکلم اور خطیب ہو شبلی کے سوا اور کسی کی نہیں ملتی۔

۲- اردو میں تاریخ بہ حیثیت سائنس انہیں کی تحریروں کی بدولت راہ پا سکی۔

۳- تحقیق و تفتیش کے جدید اور قدیم اصولوں کے امتزاج سے انہوں نے جو اسلوب پیدا کیا اس میں ایک انفرادی اور اجتہادی شان پائی جاتی ہے۔

۴- ان کی تصنیفی زندگی میں بڑا تنوع نظر آتا ہے لیکن مقصد سب کا ایک ہی ہے:-
"اسلام اور مسلمانوں کے کارناموں کو اجاگر کرنا' ان کے متعلق یورپین مصنفین کی غلط بیانی' دروغ گوئی' تہمت اور الزامات کے تاریک پردوں کو چاک کر کے صداقت اور اصلیت کو بے نقاب کرنا' لیکن بے جا طرف داری' قومی تعصب' ہٹ دھرمی' کی جگہ وسعتِ نظر' رواداری' اور برداشت کے اعلیٰ جوہر اُن کی خصوصیات معلوم ہوتے ہیں۔

۵- تحریروں اور تقریروں سے گذر کر قومی زندگی میں عملی انسان کی حیثیت سے بھی ان کی زندگی ایک درخشندہ مثال ہے۔

آخر میں ہمیں صرف اس قدر بیان کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ شبلی کا اثر کہاں تک پہنچا جیسا کہ عام طور پر معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت وہ یادگاریں ایسی ہیں جہاں شبلی کے خیالات اور تصورات کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ' دار المصنفین اعظم گڈھ' ندوہ' مولانا کے تعلیمی نظریے کی تعبیر اور دار المصنفین' ان کی تصانیف کے مقصد کی اشاعت ہے۔ دار المصنفین کی نگرانی مولانا شبلی کے فاضل جانشین علامہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کے سپرد ہے۔ مکاتیب شبلی میں سید صاحب موصوف کے نام جو خطوط ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی نے ان کی تربیت میں کیسی سعی و کوشش کی تھی اور ان پر اُن کو کس قدر اعتماد تھا۔ سید صاحب ہر رُخ سے شبلی کی تصویر معلوم ہوتے ہیں سیرۃ النبیؐ کی تکمیل سے شبلی کی وصیت پوری کی۔ خیام کی تالیف سے شعر العجم کے ایک دھندلے نقش کو جدید تر

www.urduchannel.in

تحقیقات وانکشافات کی روشنی سے اجاگر کیا۔ عرب و ہند کے تعلقات، سید صاحب کی نہایت مہتم بالشان تصنیف ہے جس میں تحقیق وتلاش کا وہی انداز ہے جو اُن کے استاد شبلی کا تھا۔ دارالمصنفین نے سیرۃ النبی کے بعد سیرۃ الصحابہؓ اور تابعین کے حالاتِ مبارک لکھ کر اس عمارت کو مکمل کر دیا جس کی داغ بیل سیرۃ النبی نے ڈالی تھی۔ نامورانِ اسلام، کا سلسلہ بھی دوسرے رنگ میں جاری ہے۔ تاریخ اسلام میں عہد رسالت، خلافتِ راشدہ، بنی امیہ، بنی عباس، اور آلِ عثمانؓ کی تاریخیں چھپ کر شایع ہو چکی ہیں۔ دارالمصنفین کا علمی مجلہ "معارف" اسی طرز کی علمی خدمات انجام دے رہا ہے جو مولانا شبلی مرحوم کا تھا۔ دارالمصنفین والوں کی عبارت میں وہی سادگی۔ سلاست، منطقیانہ سلجھاؤ اور متانت وگرانمایگی پائی جاتی ہے جو شبلی کی تحریروں میں ملتی ہے۔

شبلی کا دوسرا خیال کہ جدید ضروریات کے مطابق مسلمان علماء کی ایک جماعت تیار کی جائے، ندوہ کے قیام سے عملی جامہ پہن رہا ہے۔ اس وقت ندوہ کے فاضل : زمانے کے حالات اور واقعات اور علوم جدیدہ کی تعلیم اس جامعہ کی خصوصیت ہے۔ ملک میں اس قسم کے بعض اور ادارے بھی ہیں لیکن ندوہ کی فضیلت بہر نوع مسلّم ہے۔

سرسید نے جو کام شروع کیا تھا اس کا صرف ایک جزو اب تک عملاً جاری ہے یعنی مسلمانوں کی جدید تعلیم لیکن حالی، نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی سب کے کارنامے ان کے ساتھ رخصت، اور ان کے خیالات وتصورات انہیں پر ختم ہوگئے۔ اب ان میں سے کس کے خیالات، کس کے تصورات اور کس کی امیدیں آگے بڑھ رہی اور پروان چڑھ رہی ہیں۔ کس کی زندگی کا مشن اب بھی پورا ہو رہا ہے اور نظام میں سے جس کا ذکر "آغاز داستان" میں ہوا ہے کس کی ذات مرکز کشش بنی ہوئی ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب میں صرف ایک آواز آتی ہے، ایک صدا بلند ہوتی ہے:-

"شبلی شبلی اعظم ہے"

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

فہرستِ ماخذات

تصنیفاتِ شبلی :-

(۱) مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ۔
(۲) المامون ۔
(۳) سیرۃ النعمان ۔
(۴) الفاروق ۔
(۵) سفرنامۂ روم و مصر و شام ۔
(۶) الغزالی ۔
(۷) علم الکلام ۔
(۸) الکلام ۔
(۹) سوانح مولانا روم ۔
(۱۰) موازنۂ انیس و دبیر ۔
(۱۱) شعر العجم حصہ اوّل
(۱۲) " " دوم
(۱۳) " " سوم
(۱۴) " " چہارم
(۱۵) " " پنجم
(۱۶) سیرۃ النبی جلد اوّل
(۱۷) " " دوم

مقالات :-

(۱۸) مقالاتِ شبلی جلد اوّل
(۱۹) " " دوم
(۲۰) " " سوم
(۲۱) " " چہارم
(۲۲) " " پنجم
(۲۳) " " ششم
(۲۴) " " ہفتم
(۲۵) " " ہشتم

خطبات :-

(۲۶) خطباتِ شبلی ۔

دواوین :-

(۲۷) کلیاتِ شبلی فارسی :- (دستۂ گل، بوئے گل، برگِ گل) ۔
(۲۸) " " اردو (دیوانِ شبلی، مجموعۂ کلامِ شبلی) ۔

مکاتیب :-

(۲۹) مکاتیبِ شبلی جلد اوّل
(۳۰) " " دوم
(۳۱) خطوطِ شبلی ۔

www.urduchannel.in

سوانح :-

(۳۲) حیات شبلی از سید سلیمان ندوی
(۳۳) تذکرۂ شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم از محمد مہدی (
(۳۴) ناموران اسلام مکتبہ جامعہ
(۳۵) حیات سعدی از مولانا حالی۔
(۳۶) یادگار غالب " " "
(۳۷) حیات جاوید " "
(۳۸) حیات النذیر " "

تذکرہ :-

(۳۹) تاریخ ادب اردو از سکینہ بنت رحمہ عسکری
(۴۰) تاریخ نثر اردو " احسن مارہروی مرحوم
(۴۱) سیر المصنفین جلد اول از محمد یحیٰی تنہا
(۴۲) " " دوم
(۴۳) تاریخ ادب اردو ادارۂ ادبیات اردو
(۴۴) دکن میں اردو از نصیرالدین ہ—
(۴۵) داستان تاریخ اردو از حامد حسین قادری۔
(۴۶) ارباب نثر اردو از سید محمد۔
(۴۷) ذکر میر از میر تقی میر
(۴۸) اردوے قدیم از شمس اللہ قادری۔
(۴۹) سودا از شیخ چاند مرحوم
(۵۰) خاقانی ہند از رفیق۔

تنقید :-

(۵۱) اردو کے عناصر اربع مطبوعہ الناظر۔
(۵۲) سخندان فارس از آزاد۔
(۵۳) آبحیات از آزاد۔
(۵۴) ہماری شاعری " مسعود حسن رضوی۔
(۵۵) تنقید شعر العجم " محمود شیرانی
(۵۶) المیزان " چودھری نظر الحسن
(۵۷) Literary History of Persia by Brown.
(۵۸) Letter on chevalry A. Hurd
(۵۹) Author's apology for heroic poetry
(۶۰) اردو کے اسالیب بیان محی الدین قادری زور

تاریخ :-

(۶۱) دربار اکبری

www.urduchannel.in

اورنگ زیب قاسمی

(۶۲) Dr. S.M. Abdullah's Urdu – under the influence of Sir Syed"

(۶۳) Abdulla Eusuf Ali's "Cultural History of British India –

(۶۴) تاریخ ابن خلدون — مترجمہ حکیم احمد حسین۔

(۶۵) مسلمانوں کا روشن مستقبل۔

(۶۶) مرحوم دہلی کالج (سیاسی و ادبی) عبدالحق۔

ادب :-

(۶۷) افادات مہدی — ایم مہدی الافادی

(۶۸) نقوش سلیمانی — سید سلیمان ندوی

(۶۹) نیرنگ خیال — آزاد

(۷۰) نصیحت کا کرن پھول — "

(۷۱) مرآۃ العروس — نذیر احمد

(۷۲) توبۃ النصوح — " (توبۃ)

(۷۳) باغ و بہار — میر امن۔

مقدمات :-

(۷۴) مقدمہ شعر و شاعری — حالی۔

(۷۵) مقدمات حیات النذیر — عبدالحق۔

(۷۶) مقدمات عبدالحق۔

نظم :-

(۷۷) کلیات مرثیہ — دلگیر

(۷۸) مراثی میر انیس۔

(۷۹) مراثی ضمیر۔

تراجم :-

(۸۰) ترجمہ کلام پاک

رسائل :-

معارف — علی گڑھ میگزین

اردو — ادبی دنیا

الناظر — عالمگیر

زمانہ

الندوہ

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ

نگار

UNIVERSITY LIBRARY
MUSLIM UNIVERSITY

کتبہ طفیل احمد صدیقی بنارسی۔
۱۸ مئی ۱۹۴۶ء